

TIGHT BINDING

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_I 188213

UNIVERSAL
LIBRARY

۹۲۷

سلسلہ مطبوعات نمبر ۱۴۲

آثارِ جمالُ الدین افغانی

از

قاضی محمد عبد الغفار

شایع کردہ

انجمن ترقی اُردو ہند دہلی

۱۹۴۰ء

خانصاحب عبداللطیف نے "لطیفی پریس لمیٹڈ" دہلی میں چھاپا
اور
منیجر انجمن ترقی اردو (ہند) نے دہلی سے شائع کیا

فہرست مضامین

آثارِ جمال الدین افغانی

عنوانات صفحات

۳	انتساب
۵	افغانی می گوید
	پیش لفظ
	(قوم ارادے سے بنتی ہو نہ کہ توہمات سے)
۸ — ۷	(آتا ترک)
۱ — ۱	مقدمہ
۲۲ — ۱	خاندان اور تاریخ و مقام ولادت

دوڑِ اول

۳۵ — ۲۵	عہدِ انتظار
۳۸ — ۳۵	ہندوستان و حجاز
۳۶ — ۳۹	افغانی سیاسیات
۳۹ — ۳۶	ہندوستان
۵۴ — ۴۹	آخری دفعہ وطن میں

دورِ ثانی

۵۸ — ۵۷	ہندوستان تیسری دفعہ
۶۱ — ۵۹	مصر کا پہلا سفر
۷۸ — ۶۱	ترکی کا پہلا سفر
۱۲۰ — ۷۸	مصر کا دوسرا سفر
۱۵۵ — ۱۲۰	ہندوستان کا پانچواں سفر

دوڑنالت و آخر

۲۱۴ — ۱۵۹	لندن و پیرس
۲۲۴ — ۲۱۴	رؤس
۲۲۷ — ۲۲۴	رؤس کا دوسرا سفر
۲۳۰ — ۲۲۷	جرمنی، فرانس اور پھر رؤس
۲۳۰	رؤس کا تیسرا سفر
۲۶۶ — ۲۳۰	ایران کا دوسرا سفر
۲۶۸ — ۲۶۶	خانقین، بغداد، بصرہ و لندن
۲۸۹ — ۲۶۸	قسطنطنیہ
۲۹۸ — ۲۸۹	مرض الموت، وفات و تدفین
۳۰۱ — ۲۹۹	اقوال
۳۱۳ — ۳۰۲	[اخلاق و اوصاف و عادات و علم و فضل و عقاید مذہبی و سیاسی]

۳۱۶—۳۱۳

تصنیف و تالیف

۳۶۶—۳۱۶

ضمیمہ جات

عروۃ الوثقیٰ کے چار مقالے

۳۶۴—۳۶۹

پہلا مقالہ

۳۸۴—۳۶۵

دوسرا مقالہ

۳۹۳—۳۸۵

تیسرا مقالہ

۴۰۰—۳۹۵

چوتھا مقالہ

۴۰۹—۴۰۱

{ نسب و وطنیت کے متعلق
ایک جداگانہ بیان
کتب

۴۱۲—۴۱۱

{ (جن سے ترتیب کتاب کے
دوران میں مدد لی گئی)

۴۱۴—۴۱۳

جراید و رسائل

۴۴۲—۴۴۵

اشاریہ



ان اوراق کی ترتیب میں میرا ذوقِ عمل دو محترم اور محبوب دوستوں کی یاد سے منسوب ہے

مسیح المملکت حکیم اجل خاں

اور

ڈاکٹر مختار احمد انصاری

وہ دونوں اپنے پروردگار کی رحمتوں کے آغوش میں

محو خوابِ ابد ہیں!۔

افغانی می گوید

عالمے در سینہ ماگم ہنوز عالمے در انتظارِ قلم ہنوز
عالمے بے اتیارِ خون و رنگ شامِ او روشن تر از شامِ فرنگ
لا يزال و وارداش نوبو برگ و بارِ محکاتش نوبو
باطنِ او از تغیرِ بے غمے ظاہرِ او انقلابِ ہر دمے

اندرونِ تستِ آن عالمِ نگر

می دہم از محکاتِ او خبر!

(اقبال - جاوید نامہ)

”قوم ارادے سے بنتی ہو نہ کہ توہمات سے“ (اتاترک)

بیس سال سے زیادہ گزے جب پہلی دفعہ میں نے جمال الدین افغانی کا نام حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب مرحوم و مغفور کی زبان سے سنا تھا۔ ستمہائے روزگار نے عرصہ تک اجازت نہ دی کہ اس مجاہد کی عجیب و غریب زندگی کے حالات کی جستجو کرتا۔ تاہم وہ ایک نقش دل میں محفوظ تھا اور عرصہ تک حالت یہ رہی کہ جہاں کہیں افغانی کے متعلق ایک حرف سنا اُس کو لکھ لیا اور جہاں کہیں کچھ پڑھا اُس کو محفوظ کر لیا۔ غرضیکہ عمر کے اس گزرنے ہوئے زمانے میں افغانی کے نام کے ساتھ ایک عجیب روحانی واسطہ پیدا ہو گیا۔

۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۷ء تک میرا زیادہ وقت ممالک غیر میں گزرا۔ مسافرت میں بھی آثار جمال الدین کی تلاش کا سلسلہ اتنا ہی طویل رہا جتنا کہ سیر و سیاحت کا۔ دیارِ فرنگ سے اسلامی ممالک کی طرف آیا اور قاہرہ میں تو کچھ عرصہ صرف اسی کام میں گزرا کہ جہاں لوگ مٹی اور پتھروں کے آثارِ قدیمہ دیکھنے جایا کرتے ہیں وہاں میں نے ایک زندہ جاوید کے آثار تلاش کیے۔ لیکن خود اپنے وطن میں سوائے چند کے تمام اسلامی آبادی کو ”افغانی“ کے نام سے نا آشنا پایا۔ مغرب و

مشرق سے جو کچھ میں لایا تھا وہ بھی بہت عرصہ تک نپسل سے لکھے ہوئے مسودوں کے پرزوں میں منتشر پڑا رہا اور نہ جانے کب تک یہی حال رہتا اگر ایک اور زندہ جاوید کی محبت میرا حوصلہ نہ بڑھاتی ”اجل خاں اعظم“ اب اس دنیا میں نہیں ہیں کی یاد بھی ایک غافل اور ناحق شناس قوم کے دل سے محو ہو چکی ہو لیکن دلی میں قدیم تہذیب و ثقافت کے اس آخری یادگار نے اپنے نیاز مندوں اور دوستوں کے قلوب میں ایک ایسا نقش چھوڑ دیا ہے جس کو دنیا کی غفلت اور بے پروائی مٹا نہیں سکتی۔ مسیح الملک مغفور کے بیہم تقاضوں نے مجھے آمادہ کیا کہ اس تمام مواد کو جس کا ایک حصہ خود مرحوم اسلامی مالک سے میرے لیے جمع کر کے لائے تھے ایک مسودہ کی صورت میں مرتب کر لوں۔ وہ مسودہ بھی کم و بیش تیار ہو گیا لیکن اُسی زمانہ میں اجل خاں کا بلاوا آگیا اور وہ اس دنیا میں اپنا کام ختم کر کے اپنے خالق کی طرف سدھار گئے۔ اُن ہی کے ساتھ میری زندگی کا ذوقِ عمل بھی ختم ہو گیا شکستِ آرزو کی یہ داستان ہو جو بیان نہیں ہو سکتی۔

اجل خاں کی رخصت کے بعد ردی اخباروں کے تختوں میں لپٹا ہوا یہ مسودہ میرے ساتھ ساتھ خدا جانے کہاں کہاں پھرتا رہا تا آنکہ حیدر آباد میں ایک نیک بندے کے فیضِ روحانی نے اس بھتی ہوئی چنگاری کو پھر چمکا دیا اور ان کی طرف سے کچھ ایسی تحریک ہوئی کہ جس نے ان پریشان اوراق کی شیرازہ بندی کر دی ان بزرگ کے حصہ کا اجر یقیناً خدا کے پاس ہو۔ یہ تاسیدِ غیبی نہ ہوتی تو کیا معلوم کہ یہ مسودہ کس پنساری کی دُکان پر پڑیاں باندھنے کے کام آتا۔ بہر حال مقصد یہ تھا کہ شیخ کی زندگی کی یہ داستان اُسی جگہ مرتب ہو اور تکمیل پائے جہاں شیخ نے اپنی زندگی کے کم و بیش دو سال گزارے تھے۔ شاید اُن ہی کا یہ فیض جار یہ تھا جس نے مجھے باوجود اپنی آشفتنہ خاطر ہی کے اس کام کو انجام دینے کے لیے ایک قلبِ مطمئنہ عطا فرمایا۔

مقدمہ

سید جمال الدین افغانی کی زندگی کا تعلق یورپ اور ایشیا کی تاریخ کی دو گزشتہ صدیوں سے اتنا گہرا ہے کہ شیخ کے اذکار کے بغیر اُن دونوں کی تاریخ یقیناً نامکمل رہے گی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں اس کمی کو پورا نہیں کر سکا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے میرے مطالعہ سے بہت زیادہ گہرے اور وسیع مطالعہ کی ضرورت ہے اور کیا عجب ہے کہ کوئی صاحبِ نظر اس موضوع پر اپنے لیے ایک وسیع تر میدان پیدا کرے۔ سید جمال الدین افغانی کی روئداد زندگی اُس زمانہ کی سیاست کے ایک اہم گوشہ پر حاوی ہے جب ایشیا پر یورپین استعمار پھیلتا جا رہا تھا اور اُس کی گرفت کے اندر ایشیا کی سوتی ہوئی قومیں کہیں کہیں کڑھیں بدلنے لگی تھیں۔ شیخ کی زندگی کا گہرا تعلق اسلامی قوم کی بیداری سے ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ایشیا کی عام بیداری سے اُن کی جدوجہد بے تعلق رہی ہو۔

اسلام کے سیاسی اقتدار کا انحطاط ۱۰۰۰ عیسوی کے بعد ہی سے شروع ہو گیا تھا لیکن تیرہویں صدی میں چنگیز کے پوتے ہلاکو نے بغداد پر

ایک ایسی ضرب لگائی جس سے پھر کئی صدی تک ایشیا میں اسلامی اقتدار پنپ نہ سکا۔ یہی زمانہ تھا کہ اسپین میں بھی اسلامی قوت کے زوال نے یورپ کی سرزمین پر اسلامی اقتدار کو بہت کمزور کر دیا تاہم ترکوں کی قدیم روایات قسطنطنیہ کے مرکز پر باقی تھیں اور عثمانیوں کی تلوار سے یورپ کی قومیں بہت عرصہ تک ڈرتی رہیں، مگر اس اقتدار کو پہلا صدمہ ۱۷ ویں صدی کے شروع میں پہنچا جب ۱۶۸۶ء میں وینیا کی شہر بپناہ کے سامنے ترکوں کو پسپا ہونا پڑا۔ اسی نقطہ سے یورپ میں ترکیہ کے سیاسی اقتدار کا اضمحلال شروع ہوتا ہے۔

اسلامی اقتدار کے ان دو مرکوزوں کی کمزوری اور خصوصاً ترکوں کی گھٹی ہوئی قوت کا ردِ عمل یورپ میں شروع ہوا۔ اس ردِ عمل میں استعماری رجحانات کا آغاز ۱۵ ویں صدی کے آخری چند سالوں کے دو تاریخی واقعات سے ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ اس امید کی طرف سے ہندستان جانے کا راستہ واسکو ڈی گاما نے معلوم کر لیا اور دوسرے یہ کہ کولمبس "نئی دنیا" تک پہنچ گیا۔

اس کے بعد یورپ کی نظروں میں دُور دُور کے فاصلے سمانے لگے اور آباد کاری اور استعماریت اور تجارت کا یہ ایک یورپین قافلہ تھا جس میں ہالینڈ کے لوگ آگے آگے اٹھانے کے پیچھے پیچھے اسپینی اور انگریز اور فرانسیسی ہر طرف بڑھے چلے جا رہے تھے۔ ۱۶۸۶ء میں انگلستان نے ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی جس کی پیش قدمی سے ہندستان خوب واقف ہو گیا۔ ۱۶۸۶ء میں فرانس نے بھی مشرقی ممالک سے تجارت کرنے کے لیے ایک کمپنی قائم کر لی۔ ۱۶۸۶ء میں ڈچ لوگوں نے

سمندروں میں نئی زمینوں اور نئے مقبوضات تلاش کرتے کرتے جزیرہ جاوا پر قبضہ کر لیا۔ ۱۶۰۶ء میں انگریزی مہم بھی وہاں پہنچ گئی۔ ۱۶۳۶ء میں انگریزی تجارت چین تک پہنچ گئی۔ اور ایٹ انڈیز میں ایک طرف انگریزوں نے۔ ایک طرف ڈچ نے اور ایک طرف فرانسیسیوں نے قبضہ کر لیا۔ سمندروں کے یہ راستے جس قدر زیادہ کھلتے گئے اور تجارتی منافع جس قدر زیادہ ہوتے گئے اُسی قدر زیادہ یورپین اقوام کو ان راستوں کی حفاظت اور اپنے بازاروں کی ترقی کا خیال پیدا ہوتا گیا اور اُسی قدر زیادہ تجارت سیاست اور سیاحی ملک گیری کی صورت اختیار کرتی گئی۔

اٹھارھویں صدی کا آغاز جبرالٹر پر برطانیہ کے قبضہ سے ہوتا ہے اور اس کے بعد تو ایک آندھی تھی جو یورپ کی طرف سے ایشیا کی طرف چلنی شروع ہوئی۔ اس آندھی کے دامن سے لپٹی ہوئی کلیسا کی جماعتیں بھی تھیں جو ہندوستان، افریقہ، نیوزی لینڈ اور بحر بیفک کے جزائر اور بعض ایشیائی ممالک میں بھی اپنے خیمے نصب کرنے لگیں۔ تجارت کے ساتھ مسیحیت کی تبلیغ کا یہ سلسلہ دُور دُور تک پہنچا۔

۱۷۰۴ء میں جبرالٹر پر برطانیہ کا قبضہ قائم ہو جانے کے بعد فرانس نے ۱۷۱۳ء میں الجزائر اور مراکش پر قبضہ کر لیا۔ ۱۷۱۳ء میں انگریزوں نے آسٹریلیا میں اپنی نو آبادی قائم کی اور مَرکی کے مقبوضات میں رُوس نے عیسائی رعایا کے حقوق کی حفاظت کا ادّعا شروع کر دیا۔ ۱۷۶۶ء میں شمالی امریکہ میں انگریز، فرانسیسی اور ڈچ آبادکار پہنچ گئے۔ ۱۷۹۵ء میں برطانیہ نے سیلون کی قدیم حکومت کو ہٹا کر

اپنا جھنڈا گاڑ دیا۔

یورپ میں یہ ایک انقلابی زمانہ تھا اور نیپولین بونا پارٹ کے گھوڑوں کی ٹاپوں میں نہ صرف یورپین برعظم روندا جا رہا تھا بلکہ اس آندھی کے جھونکے مصر اور شام تک بھی پہنچ رہے تھے۔ یورپ کی استعمار پسند اقوام اپنی ترقیوں میں اس طوفانی دؤر کی مداخلت سے خوفزدہ ہو رہی تھیں اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا کم و بیش دو صدی کی یہ تمام جدوجہد نیپولین کے ہاتھوں برباد جائے گی۔ مگر قسمت کا پانسا استعاریت کے حق میں بڑا اور نیپولین کے خاتمہ کے بعد تجارت اور سیاست کی یہ ملک گیری پھر شروع ہو گئی۔

۱۸۰۱ء میں برطانیہ نے جنوبی افریقہ میں کیپ ٹاؤن پر قبضہ کر کے ایشیا کے بازاروں اور ہندوستان کے طول و عرض میں اپنے سیاسی اور تجارتی مفادات کی حفاظت کا پورا سامان کر لیا۔ اسی ۱۸۰۱ء میں الٹا پر اپنے قبضہ کا استقرار کر کے بحر روم اور مصر کی سیاست میں بھی برطانیہ نے اپنی قوت کو زیادہ منظم کر لیا۔ پھر ۱۸۰۹ء میں عدن پر برطانوی قبضہ نے بحر ہند اور بحر احمر کا یہ ایک مضبوط مورچہ قائم کر دیا۔ اب برطانوی تجارت نے سیاست کے بادل کو پوری طرح اپنے جسم پر لپیٹ لیا۔ چنانچہ ۱۸۰۳ء میں فرانس کے اثرات کو مصر سے دفع کر کے وہاں بھی برطانوی ”دخل“ کا اعلان کر دیا گیا۔

ہر سمت میں سیاسی اور تجارتی استحکامات کو قائم کر لینے کے بعد ۱۸۰۳ء میں برطانیہ نے چین سے ایک لڑائی لڑی اور ہانگ کانگ پر قبضہ کر لیا۔ اس واقعہ کے ایک ہی سال بعد افریقہ میں نیشال پر برطانوی

جھنڈا سر بلند ہو گیا۔

اس عرصہ میں روس بھی یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ اس دؤر میں پیچھے رہا جاتا ہے اس لیے وہ مشرقِ بعید میں دریائے امور کے شمالی اور دریائے اسوری کے مشرقی علاقوں پر مسلط ہو گیا۔

یہ زمانہ وہ تھا کہ روس اور برطانیہ کی رقابت مختلف سمتوں میں بہت شدید ہوتی جا رہی تھی۔ شاید اسی لیے مشرقِ بعید میں روسی اقدامات کا جواب دینے کی غرض سے برطانیہ نے جزیرہ نمائے ملایا کی ریاستوں پر قبضہ کر لینا ضروری سمجھا۔

۱۹ ویں صدی کے وسطی دؤر میں سب سے بڑی اسلامی سلطنت ترکی تھی اور وہ آخری سانس لے رہی تھی۔ اُس کے دونوں پہلو دبے ہوئے تھے یعنی ایک طرف روس اور دوسری طرف برطانیہ۔ مگر ایک تیسرا حصہ دار بھی پیدا ہوتا جا رہا تھا اور وہ جرمنی تھا۔ برطانیہ، فرانس اور روس کا ایمپائرلزم اب بالکل بے نقاب ہو چکا تھا اور جرمنی بھی اس میدان میں اپنے رقیبوں سے پیچھے رہ جانا پسند نہ کرتا تھا۔ اُس زمانے کا سب سے بڑا برطانوی ممبر گلڈسٹن صاف صاف کہہ رہا تھا کہ ”مجھے یقین ہے کہ ہم سب اُس عظیم الشان ملک کی محبت میں

متحد ہیں جو ہمارا وطن ہے اور اُس سلطنت سے بھی وابستہ

ہیں جس نے ہمارے ملک کو خدا کی ایک ایسی امانت سپرد کی جو کبھی پہلے انسانوں کے کسی خاندان کو نصیب نہیں ہوئی۔

جس وقت میں اُس امانت اور اُس فرض کا ذکر کرتا ہوں تو

الفاظ میری مدد نہیں کر سکتے۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ اس

وراثت کی عظمت کو میں کیا سمجھتا ہوں۔ میں اُس وراثت کو بخت طلب سیاسی مسائل کا ہدف نہیں بنا سکتا وہ میرے وجود، میرے گوشت و پوست اور میرے دل اور میری روح کا ایک جزو ہے۔“

یہ اُس "امانت" کا تذکرہ تھا جس کو برطانیہ کی استعماریت نے دُنیا کے مختلف حصّوں میں اپنے لیے محفوظ کر لیا تھا۔ اُس وقت برطانیہ کی سیاست کا عظیم تر اور اہم ترین جزو یہی استعماریت تھی۔ اُسی کی ایک علامت ۱۸۷۵ء میں ملکہ وکٹوریہ کا وہ اعلان تھا جس میں اُنھوں نے "ایمپرس آف انڈیا" کا خطاب اپنے شاہی خطابات میں شامل کیا۔ ۱۸۷۵ء میں ہندوستان پر برطانوی قبضہ کی تکمیل ہر طرح ہو چکی تھی حتیٰ کہ اُس کی انتہائی سرحد تک بلوچستان پر بھی قبضہ کیا جا چکا تھا۔ گلبدشن کی آواز یورپ کے دوسرے استعماریت پسند ممالک میں بھی گونج رہی تھی۔ چنانچہ ماہرین جغرافیہ کی ایک کانفرنس میں بمقام برسلز شاہ یوہانڈ کہہ رہا تھا کہ :-

"کرۂ ارضی کے اُس حصّہ میں جہاں تہذیب نہیں پہنچی ہے، تہذیب کے لیے داخل ہونے کا دروازہ اور اُس تاریخی میں روشنی کا دریچہ پیدا کرنا جو آبادیوں کو پیٹے ہوئے ہے، ایک جہاد ہے اور ایک ایسا جہاد ہے جو ہمارے ملک کی شایانِ شان ہے۔"

اس "جہاد" کے کارناموں سے اُس زمانہ کی تاریخ پٹی پڑی ہے۔ "گوئے آدمی کا یہ بوجھ (White man's burden) اب یورپین

اقوام کے سیاسی عقیدہ کا ایک اساسی مسئلہ بن گیا تھا۔
 ۱۷۹۷ء میں روس نے پھر ایک دفعہ ترکی پر حملہ کر کے اپنی
 ملک گیری کے لیے ایک میدان پیدا کرنا چاہا لیکن برطانیہ نے اُس
 کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کے لیے ترکیوں کی امداد کی اور گویا اُس
 امداد کے معاوضہ میں جزیرہ قبرس حاصل کر لیا۔

کم و بیش ڈیڑھ سو سال کی اس مسلسل جدوجہد میں برطانیہ نے
 جو کچھ حاصل کیا اب ۱۸ویں صدی کے آخر میں اُس کی تنظیم کا وقت آ گیا تھا۔
 چنانچہ لندن میں نوآبادیوں کی پہلی کانفرنس ۱۷۹۷ء میں منعقد ہوئی۔ اس
 ڈیڑھ صدی کے عرصہ میں جنوبی افریقہ سے بحر روم تک برطانیہ نے جو
 ذرائع رسل و رسایل اور بحری اور فوجی طاقت کے مورچے قائم کر لیے اب
 اُن کا منظم اور مستحکم کرنا بھی ضروری تھا۔ اپنی نوآبادیوں اور مقبوضات
 کے متعلق برطانیہ کے مسلک کا سب سے نمایاں نشان براہ ہی کانفرنس تھی۔
 لیکن برطانیہ کی استعماری قوت کو اس قدر منظم ہوتے دیکھ کر
 روس کے علاوہ فرانس اٹلی اور جرمنی بھی پریشان ہو رہے تھے۔ یہ سب
 بھی مختلف سمتوں میں پھیلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چنانچہ ۱۷۹۹ء
 میں اٹلی نے افریقہ میں پہلا قدم اٹھایا اور سومالی لینڈ پر قبضہ کر لیا۔ فرانس
 نے جزیرہ ”مدیگا سکر“ پر اپنی فوجیں اتار دیں اور شمالی افریقہ میں تونس کی
 آزادی سلب کر لی گئی۔ اس کے علاوہ انام کی ریاست اور چین میں علاقہ
 تونکن پر بھی فرانسیسی ”دغل“ مضبوط ہو گیا۔

ملک گیری کی اس دور میں جرمنی نے بھی بے چین ہو کر جنوبی افریقہ
 اور ٹوگولینڈ، نیوگائیا اور جزائر بحر جنوبی کو اپنی ”حفاظت“ میں لے لیا اور

۱۸۸۸ء میں قطنینہ جا کر قیصر ولیم نے اپنے ملک کے لیے بعض مراعات حاصل کیں اور بغداد ریلوے کا تخیل پیش کر کے اپنے اثرات کو آل عثمان کی سلطنت میں بڑھانے کی کوشش کی۔

۱۹ ویں صدی کے آخر میں یورپین اقوام کے استعماریت کا سب سے بڑا ہدف افریقہ بنا رہا اور اس براعظم کے میدانوں میں تمام بڑی اقوام کے گھوڑے دوڑتے رہے۔ ۱۸۸۸ء میں جریرہ بوزیمو کا ایک حصہ انگریزوں کی حفاظت اور سیادت میں داخل ہوا اور اس کے بعد دو سال کے اندر ہی نیا سالینڈ زنجبار اور یوگنڈا کے علاقے بھی برطانوی سلطنت میں شامل ہو گئے حتیٰ کہ ۱۹ ویں صدی کے ختم ہونے تک یورپ کی ان استعماریت پسند اقوام کے قبضہ میں ایشیا، افریقہ اور امریکہ کے جو علاقے محفوظ ہو گئے اُن سب کا مجموعی رقبہ یورپ کے رقبہ سے ۷ گنا زیادہ تھا اور تمام دنیا کے انسانوں کی مجموعی آبادی کا ایک تہائی یورپ کے اس جدید استعماریت کے حلقہ اثر میں داخل ہو چکا تھا۔

یہ ایک پس منظر ہے اُن حالات کا جن کے اثرات اٹیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں اسلامی اور ایشیائی ممالک پر مرتب ہونے شروع ہوئے۔ ان ہی اثرات کے آغوش میں بہت سے قوم پرست پیدا ہوئے اور ایشیا اور اسلام کے ان قوم پرستوں کی صف اول میں پہلا آدمی افغانی تھا۔ اس وقت دنیا کے تقریباً ایک ارب (۸۰) کروڑ انسانوں میں (۳۰) کروڑ کے قریب مسلمان تھے جو

دنیا کے ہر گوشے میں آباد تھے۔ یہ آبادیاں کمزور تھیں اور اُن کے شیرازے کو زمانے کے انقلابات نے بکھیر دیا تھا۔ تاہم ان سونے والوں میں بھی کچھ لوگ تھے جو جاگ رہے تھے۔ یورپ اُن سے جس قدر زیادہ قریب آتا جاتا تھا اسی قدر زیادہ اُن کے قویٰ میں حرکت پیدا ہوتی جاتی تھی۔ واقعات کی روشنی میں تصویر کا یہ دوسرا رخ بھی بہت بصیرت افروز ہے۔

۱۸ویں صدی کے شروع میں دریائے دجلہ اور فرات کے کناروں پر ترکی حکومت کی کمزوریوں اور بد نظمیوں نے ایک انقلابی اثر پیدا کر دیا تھا۔ اس اثر کا ایک مظاہرہ ۱۷۹۸ء میں احمد پاشا کی بغاوت تھی جس نے بغداد میں چند روز کے لیے ایک آزاد حکومت قائم کر لی۔ لیکن نشاۃ ثانیہ درحقیقت شروع ہوئی وہابی تحریک سے جو عرب کے ایک گوشہ میں پیدا ہوئی اور ۱۹ویں صدی کے شروع میں تمام حجاز پر حاوی ہو گئی۔ اس تحریک کا اثر ہندوستان تک پہنچا اور اگر ترکوں نے محمد علی خدیو مصر کے ذریعہ سے اُس کو دبا نہ دیا ہوتا تو معلوم نہیں کہ وہ قوت اور حرارت جو محمد بن عبدالوہاب کی اس تحریک کے اندر محفوظ تھی، دنیائے اسلام میں کتنا بڑا انقلاب پیدا کرتی۔ بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ وہابی تحریک نے ایک نئے طریقہ سے عربی اقوام کے ضمیر کو بیدار کیا۔ جس وقت یہ تحریک نجد میں شروع ہو رہی تھی تو یورپ و ایشیا میں آل عثمان کی دراشت تباہ ہونے کے قریب تھی۔ چنانچہ محمد علی پاشا نے مصر کو قسطنطنیہ کے اقتدار سے آزاد کر لیا تھا۔ اسی زمانہ سے ترکوں کی سیادت کے خلاف عربوں کی تحریک

بھی شروع ہوئی جس کا منشا اس وقت بھی برطانیہ کے دفتر خارجہ میں بقول پامرٹن یہی سمجھا گیا تھا کہ "اس کا (محمد علی کا) مقصد تمام عربی بولنے والی قوموں کی ایک متحدہ حکومت ہے" ۱۸۴۳ء میں پامرٹن نے یہ خیال ظاہر کیا تھا۔ اس وقت عثمانی سلطنت کے بہت سے اجزا یورپین اقوام میں تقسیم ہو چکے تھے۔ اور حالات ایسے تھے کہ دنیائے اسلام میں بابوسی کے سوا اور کوئی احساس باقی نہ تھا۔ تاہم یورپ کی ترقیوں اور کامرانیوں ہی کے اندر سے ایشیائی اقوام کو کچھ سبق مل رہے تھے۔ چنانچہ ۱۸۴۸ء میں امریکی نوآبادیوں کی جنگِ آزادی نے بہت سی آنکھوں کے پردے اٹھا دیے اور ایشیا کے کمزور ممالک میں بھی کچھ جنگاریاں سلگنے لگیں۔ اس جنگِ آزادی کے (۱۲) سال بعد ہی انقلابِ فرانس کے شعلوں کی حرارت ایشیائی قوم کی زندگی کے مختلف گوشوں میں محسوس کی گئی۔ اس ہنگامہ زار سے ترکوں کا گھر زیادہ قریب تھا۔ شاید اسی لیے سب سے پہلے ترکی ہی میں احرار کی ایک ایسی جماعت پیدا ہوئی جس نے قدیم استبداد پر حکومت کو ختم کر کے دستوری اصلاحات کا مطالبہ کرنا شروع کیا۔ چنانچہ باوجود مخالفتوں اور سختیوں کے یہ جماعت اپنا کام کبھی وطن میں رہ کر، کبھی جلاوطن ہو کر، کبھی خفیہ اور کبھی علانیہ کرتی رہی۔ اس جماعت کے جدو جہد کی نتائج بھی کچھ نہ کچھ ظاہر ہوتے رہے۔ چنانچہ ۱۸۶۸ء میں سلطان محمود دوم نے "تنظیبات" جاری کیں۔ پھر ۱۸۷۸ء میں سلطان عبدالحمید خاں نے "خط شریف" جاری کیا اور پھر ۱۸۷۸ء میں "خط ہمایوں" جاری ہوا۔ حقوق طلبی کا یہ سلسلہ

مختلف گوشوں میں اور مختلف طریقوں سے جاری رہا اور حریت کی قربان گاہ پر بہت سی قربانیاں بھی ہوتی رہیں۔

۱۸۴۳ء میں طرابلس کے ریگستانوں میں سنوسیوں کی تحریک پیدا ہوئی۔ امام سید محمد نے وہابی تحریک کے قائدین سے بہت کچھ حاصل کیا اور پھر شمالی افریقہ میں اپنے زاویے قائم کر کے عربوں میں ایک نئی حرکت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ باوجودیکہ وہابیوں اور سنوسیوں کی تحریکات زیادہ تر مذہبی تھیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ملت اسلامی کی نشاۃ ثانیہ کا ایک اہم جزو تھیں اور جو بیداری ان کی دہ سے پیدا ہوئی اُس کی قدر و قیمت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح وہابیوں کی تحریک کا مقصد ملت اسلامی کا احیاء تھا اسی طرح سنوسی اخوان بھی تمام اسلامی ممالک میں دہی بیداری پیدا کر دینا چاہتے تھے جس کے بغیر کمزور ممالک کا یورپین اقوام کی دستبرد سے بچنا ناممکن تھا۔

۱۹ ویں صدی عیسوی کے اسی دور میں پہماندہ ایران بھی ایک نئی تحریک سے آشنا ہوا اور یہ مرزا محمد علی باب کی تحریک تھی۔ اس تحریک کے عقائد اور اصولوں سے اتفاق یا اختلاف کرنے کے بجائے میں اُس کا ذکر صرف اس لیے کرتا ہوں کہ اس تحریک نے بھی دنیاۓ اسلام کے ایک گوشہ میں بہت قوی حرکت پیدا کی تھی۔ گویا تحریکوں کا یہ ایک مثلث تھا جس کا ایک زاویہ ایران میں تھا، ایک نجد میں اور ایک طرابلس میں۔ اس مثلث کے اندر اور بھی بہت سی تحریکیں ۱۹ ویں صدی میں اپنا اپنا کام کر رہی تھیں۔ مگر یہ تین مرکز ایسے نئے

جن سے سید جمال الدین افغانی کی زندگی بھی متاثر ہوئی۔ شیخ کے میدان میں آنے سے پہلے شام میں قوم پرستوں کی ایک تحریک شروع ہو چکی تھی۔ یہ اصحاب ۱۸۸۱ء میں ایک خفیہ انجمن قائم کر چکے تھے جس کا مقصد ترکوں کی مضحکہ سلطنت سے عربوں کو آزاد کرانا تھا۔ اس انجمن کی خصوصیت یہ تھی کہ اُس کے اراکین عرب اور عیسائی دونوں تھے۔ اس کا مرکز بیروت میں تھا اور اس کی شاخیں دمشق اور طرابلس وغیرہ میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اسی زمانہ میں تونس میں بھی جزل خیر الدین پاشا کی تحریک جاری تھی۔ ترکی میں احرار کی تحریک شروع ہو چکی تھی اور اس تحریک کا ایک گوشہ تاتاریوں کے وطن تک پھیلا ہوا تھا۔ ۱۹ ویں صدی کے وسط میں جب روس نے مادر لے تفقاز پر اور فرائض نے الجیریا پر قبضہ کر لیا تو الجیریا میں عبدالقادر کی تحریک شروع ہوئی اور وسط ایشیا میں روس کے خلاف نقشبندیہ تحریک نے زور پکڑا۔ اور پھر چینی ترکستان میں بغاوتیں شروع ہو گئیں جن کے ایک مشہور لیڈر یعقوب بیگ تھے۔ علاوہ بریں بخارا میں مجلس اتحاد اسلام قائم ہوئی جس کی جدوجہد کا رشتہ نوجوان ترکوں کی تحریک سے ملتا ہے۔ چنانچہ ۱۸۹۵ء میں جب شیخ قسطنطنیہ میں موجود تھے تو اسی تاتاری تحریک کے لیڈر یوسف بے نے اُس جگہ وہ تحریک اتحاد تورانی شروع کی جس کو بعد میں اتاترک کے شرکاء کار نے بھی اختیار کر لیا تھا۔ اس تحریک کا پروگنڈا عرصہ تک "اخبار ترک یورو" کے ذریعہ سے کیا جاتا رہا جس کے ایڈیٹر احمد بے عقالف تھے۔

ایران ان تحریکوں کے زمانہ میں سب سے پیچھے تھا۔ تاہم

جیسا کہ آپ کو ان اوراق سے معلوم ہوگا وہاں بھی کچھ جنگاں سلگ رہی تھیں۔ یورپین سرمایہ داروں کی گرفت نے ایران کے کمزور اور ناقابلِ اندیش بادشاہوں کو اتنا مجبور کر دیا تھا کہ اُن کی زخمی رعایا بچپن ہونے لگی تھی۔

مختصراً یہ وہ ماحول ہے جس میں جمال الدین افغانی نے اپنا کام شروع کیا۔ سلطان عبدالحمید خاں نے اپنے آخری زمانہ میں جو تحریک اتحادِ اسلامی شروع کی تھی وہ یورپین ممالک میں بہت مشہور ہوئی لیکن وہ تحریک سید جمال الدین افغانی کی تحریک نہ تھی بلکہ اُس کو سلطان عبدالحمید خاں محض اپنی استبدادیت کے اقتدار کا سہارا بنانا چاہتے تھے۔ دراصل شیخ جن نظریات پر عمل کر رہے تھے وہ اُس زمانہ کی نوزائیدہ "نیشنلزم" (قوم پرستی) کے نظریات تھے۔ اُن کے ان نظریات کو اس زمانہ کی اسلامی تبلیغی تحریکات سے بہت مدد ملی۔ پہلے میں ان تحریکات کا تھوڑا سا ذکر کروں گا اور اِس کے بعد شیخ کی "قوم پرستی" کی کچھ وضاحت۔ اس اسلامی نشاۃ ثانیہ کے پہلے سانس نے جس جنگاری کو چمکایا وہ اسلام کی تبلیغی تحریک تھی جو مسلمانوں کے مذہب کا ایک اساسی جزو ہے۔ اس زمانہ کی تحریکوں میں سے سب سے زیادہ سنوسیوں نے تبلیغ کا کام انجام دیا۔ اُن کے زاویے اور خانقاہیں تبلیغی مشن کے مراکز تھے۔ افریقہ میں شمال سے جنوب تک اسلام کی اس روشنی کو لیجانے والے سنوسی اور اخوان ہی تھے جنہوں نے سید جمال الدین افغانی جیسے لوگوں کی تحریکوں کے لیے میدان تیار کیا اور افریقہ سے چین تک مسلمانوں میں اُن کے اس مشن کا

ایک قومی احساس پیدا کر دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ یورپین تجارت اور سیاست کے شانہ بشانہ مسیحی مبلغین بھی ان نئے میدانوں کی طرف بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ لیکن ان میدانوں میں ہر جگہ اسلامی مبلغین سے اُن کی ٹکڑ ہوئی اور ہر جگہ اُنھوں نے شکست کھائی۔ حتیٰ کہ خود عیسائی مشن کے بڑے بڑے لیڈروں نے اپنی تالیفات میں اس واقعہ کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ اسٹڈرڈ مسیحی مبلغین کی تحریروں کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ اسلامی مبلغین کی کامیابیاں

"صرف لاندھمبوں ہی کے مقابلہ میں نہیں ہیں بلکہ یہ کامیابیاں اس طرح حاصل کی جا رہی ہیں کہ عیسائی مبلغین کو سخت خزا ہو رہا ہے۔ جنوبی افریقہ میں یورپین مشنوں کے ذریعہ سے جو لوگ عیسائی بنائے جاتے ہیں ان میں سے بہت سے اسلام قبول کر لیتے ہیں.....
..... وہ قبیلے جن کے اندر کبھی کوئی ایک بھی مسلمان نہ تھا آج تقریباً سب کے سب اسلام کے احکام کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہیں"

افریقہ اور چین کے متعلق ایسی شہادتیں ہزار ہا پیش نظر ہیں۔ جاوا سماٹرا، ولایت انڈیز، شمال سے جنوب تک سارا افریقہ اور چین و جاپان اسلام کے تبلیغی مشن سے کم و بیش متاثر ہوئے اور عالم اسلامی کی اس بیداری کا جو ۱۸ ویں صدی کے آخر اور ۱۹ ویں صدی کے شروع میں پیدا ہوا یہ ایک بہت قوی اور موثر عنصر تھا۔.....

یہ میدان تھا اور یہ ماحول تھا جس میں سید جمال الدین افغانی نے اپنا کام انجام دیا۔ جیسا کہ نادائق لوگ سمجھتے ہیں اُنہوں نے اپنی تحریک میں وطنیت اور قوم پرستی کے عناصر کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا۔ اس بحث کے ہر پہلو کو پیش کرنے کے لیے ایک مکمل کتاب لکھنی پڑے گی لیکن جو لوگ ”آثار جمال الدین“ کے مختصر اوراق کا بغور مطالعہ کریں گے اُن کو معلوم ہو سکے گا کہ شیخ اپنی تحریک اتحاد اسلامی میں مسلمان اقوام کی وطنی اور قومی وحدتوں کو محو کر دینا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ ہر وحدت کو بجائے خود وطنیت کے جذبہ پر مستحکم کر کے اُن کا ایک ایسا دفاق بنانا چاہتے تھے جو یورپین ایمپریلزم کی دراز دستی کا مقابلہ کر سکے۔

۱۹ ویں صدی کے نصف اول میں نیشنلزم کی تخریجات اول مصر سے اور اُس کے چند ہی روز بعد ملک شام سے شروع ہوئی ہیں۔ اس صدی کے نصف آخر میں نیشنلزم کے خدو خال زیادہ نمایاں ہوئے۔ عربوں کی یہ ابتدائی تحریک ترکی اقتدار کے خلاف تھی اور اُس میں نسلی اختلافات اور وطنی احساسات کا بہت کچھ دخل تھا۔ ۱۸۶۷ء میں ترکی پر روس کے حملوں کے بعد اس تحریک نے زور پکڑا اور ہم دیکھتے ہیں کہ عربوں کے تمام علاقے اور صوبے اپنی خود مختاری اور آزادی کے لیے کوشاں ہو گئے۔ کہیں اس تحریک کا اساس ”وطنیت“ تھا اور کہیں نسل، مگر زیادہ تر وطنیت تھا۔ سلطان عبدالحمید خاں نے اس تحریک اتحاد اسلامی کے ذریعہ سے ان قوم پرستوں کو مطمئن کرنا چاہا لیکن وہ مطمئن نہ ہو سکے۔ بہت سے عرب قوم پرست جو شام میں ترکی حکام

کی سخت گیری سے بچ کر بھاگے تھے مصر میں جمع ہو گئے اور اس امر کی شہادتیں موجود ہیں کہ وہ شیخ سے روابط رکھتے تھے۔ خود شیخ مصر میں قومیت اور وطنیت ہی کی بنیاد پر کام کر رہے تھے اور اُن کی تحریک نے جن لوگوں کو میدان میں بھیجا وہ سب وطن پرست اور قوم پرست تھے اور اُن کی جدوجہد میں اقلیت یا اکثریت اور مسلمان اور عیسائی کا کوئی امتیاز کبھی پیدا نہ ہو سکا۔ عربی پاشا کی تحریک کا توفیرہ ہی یہ تھا کہ ”مصر مصریوں کے لیے“ اُن کے بعد مصطفیٰ کابل اور زاغلول پاشا کی جدوجہد کا اساس بھی وطن کی آزادی کا سوال تھا۔ اسی طرح ایران میں بھی شیخ کی جماعت سب وطن پرست، مخالف استبداد اور آزادی طلب تھی۔ ترکی میں بھی اُن کے شرکار کار سب وہ احرار تھے جو وطنی مفادات کی حفاظت کرنا چاہتے تھے اور جہاں تک میرا مطالعہ میری مدد کرتا ہو شیخ بھی سلطان عبدالحمید خاں کے تصورات کے حامی نہ تھے بلکہ صرف یہ چاہتے تھے کہ کوئی مرکز ایسا پیدا کریں جس پر اسلامی وحدتوں کا ایک دفاق قائم ہو جائے۔ انا ترک کی وطنی تحریک کے سرسبز ہونے کے بعد معاہدہ سعد آباد شیخ کے اُسی خواب کی تعبیر ہو جو وہ آزاد اسلامی ممالک کے درمیان ایک سیاسی رابطہ پیدا کرنے کا دیکھا کرتے تھے۔ اُن تمام ملکوں میں جہاں شیخ نے کام کیا وطنیت کے جذبہ کی وہ پوری تائید کرتے رہے۔ مصر میں تو خصوصیت کے ساتھ اُنھوں نے اوسٹریا کے جانشینوں نے قطبی اور مصری عناصر کو وطنیت ہی کی بنیاد پر متحد کیا تھا۔ چین میں بھی جہاں کروڑوں وطن پرست چینی مسلمان آباد ہیں ایک متحدہ چینی قومیت کا جو شاندار مظاہرہ آج ہم دیکھ رہے ہیں

اس کی اصل چینی ترکستان کے وطن پرستوں کی جدوجہد ہے۔ اُن لوگوں کے لیے جو وطنیت کی بنیاد پر کسی قوم پرستی کے قابل نہیں سب سے زیادہ موثر جواب چینی مسلمانوں کا وجود ہے جو آج اپنے وطن کی عزت اور آزادی کے لیے میدان جنگ میں دشمنوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

آج بھی اگر شیخ زندہ ہوتے تو مجھے کوئی شبہ نہیں کہ وہ اسلامی اخوت سے وطنیت کے جدید تخیل کو ہرگز خارج نہ سمجھتے بلکہ عربی ممالک کی آزادی کے لیے عربوں کی تائید کرتے اور وسط ایشیا کی ریاستوں میں تاناریوں کے وطنی حقوق کا مطالبہ کرتے اور ترکی وطن میں ترکوں کے استحکام کی کوشش کرتے جس طرح ایران میں وہ ملت ایرانی کی آزادی کے لیے کوشاں رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مصری، ترکی اور ایرانی احرار کی جدوجہد کا تمام اساس ایک شدید وطنیت تھی۔

شیخ کی تحریروں اور تقریروں میں ہم ایک جگہ بھی نہیں دیکھتے کہ انھوں نے محض مذہبی جذبات سے اپیل کی ہو بلکہ ہر موقعہ پر وہ ”ملت“ کے اجتماعی احساسات کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس طرح نیشنلزم کی روایات نے گزشتہ نصف صدی میں باوجود سخت ترین دشواریوں کے نشوونما پائی اور سلاطین کی جنگ عظیم نے اُن کو اور بھی زیادہ قوی کر دیا۔ چنانچہ میثاق سعد آباد پر جس وقت ترکی افغانستان ایران اور عراق کے نمائندوں نے دستخط کیے تو انھوں نے اپنی تقریروں میں اس میثاق کے فائدے ”چاروں ملتوں“ اور ”ملکوں“ کے لیے ظاہر کیے۔

ان تقریروں کے لہجہ اور الفاظ میں قوم پرستی اور وطنیت کے خلاف اُس جذبہ کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوا جو ہم ہندوستان کے لیڈروں

کی تقریروں میں دیکھا کرتے ہیں۔ اس نکتہ پر ہندی مسلمانوں نے بہت کم غور کیا ہے کہ ساری دنیا میں وہی تنہا ایسے ہیں جو وطنیت کے اساس پر اپنی ملت کی تنظیم و تشکیل کرنے سے نہ صرف ابھی تک قاصر رہے ہیں بلکہ ایسے تمام نظریات کے خلاف اُن کی رہنمائی کی جا رہی ہے۔ بہر حال مقصود یہ عرض کرنا ہے کہ سید جمال الدین افغانی کی تحریک میری رائے میں مذہبی نہ تھی بلکہ زیادہ تر سیاسی تھی۔ اور اُس کے دامن سے سولے ہندوستان کے تمام دنیا کے اسلامی ممالک کا دامن بندھا ہوا تھا۔ ہندوستان میں شیخ کی تحریک سے ناواقفیت کا یہ عالم ہے کہ حال ہی میں تین نے اخبار ”مدینہ“ کے صفحات پر کسی پروفیسر صاحب کا ایک مضمون پڑھا تھا جس میں انھوں نے شیخ کی تحریک کے متعلق بہت سی بے معنی اور بے سرو پا خیالات ظاہر کیے ہیں۔ فاضل پروفیسر صاحب نے عجیب و غریب شان سے اپنے مضمون کی تمہید اٹھائی ہے۔ لکھتے ہیں کہ ”ہندوستان کے مسلمان آج تک اس بات کو نہیں سمجھے کہ پان اسلامزم کی تحریک خود مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لیے شروع کی گئی تھی“

اس اجمال کی تفصیل پروفیسر صاحب نے یہ بیان فرمائی ہے کہ:-
 ”اس تحریک سے یورپ کے سیاست دانوں کا منشا یہ تھا کہ مسلمان رفتہ رفتہ مغربی معاشرت اور تمدن سے مانوس ہوتے جائیں گے اور وہ منافرت و حقارت جو مسلمانوں میں مفتوح قوم کو فاحشین سے ہوتی ہو جاتی رہیگی“
 پروفیسر صاحب جن الفاظ میں شیخ کا ذکر کرتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:-
 چند عالموں نے دنیائے اسلام کا دورہ کیا اور ہر ملک

میں مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق کی تلقین کرتے پھرے اُن میں سے دو بزرگ سید جمال الدین اور مفتی عبدہ بہت سرگرم لیڈر ہوئے ہیں اور ایک عرصہ دراز تک مسلمانوں نے اُن کی خوب قدر و منزلت کی۔ اس نکتہ کے ساتھ ساتھ یہ لیڈر مسلمانوں کو یہ بھی سمجھاتے رہے کہ بغیر یورپ کے علوم و فنون حاصل کیے کبھی یورپین طاقتوں کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔

اسی سلسلہ میں پروفیسر صاحب سید جمال الدین افغانی کے ساتھ سر سید احمد خاں مرحوم کا نام بھی اس طرح لیتے ہیں کہ گویا ان دونوں کا مقصد ایک ہی تھا!

”مختصر یہ کہ سید جمال الدین اور سید احمد خاں اور مفتی عبدہ تینوں حضرات نے خود ہی اس تحریک کو چلایا اور سلطان عبد الحمید خاں کے زمانہ میں یہ تحریک خوب کامیاب رہی۔ مگر (۱۱۳) سو سال کے بعد مسلمانوں کی سیاسی غلطی کی تلافی ناممکن تھی کیونکہ جن جن ممالک میں مسلمان رہ گئے وہیں کی اقوام میں مدغم ہو گئے اور اُن کو آبائی وطن سے کوئی ہمدردی نہ رہی اور پکار پکار کر کہنے لگے کہ مسلمان کا مادر وطن وہی ہے جہاں وہ رہتا ہو“

پروفیسر صاحب شاید بھول گئے کہ اس غلطی کا عمل اگر یہ کوئی غلطی تھی، تو خلیفہ چہارم کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔ پروفیسر صاحب نے اپنے مضمون کے آخر میں اپنا یہ عالمانہ فیصلہ پیش فرمایا ہے کہ:-

”تحریک پاکستان ہو یا پان اسلامزم یا اتحاد ممالک اسلامیہ،
دل کے بہلانے کو یہ تینوں خیال اچھے ہیں اور ان تحریکوں
کے مصنفوں کے ہم اتنے ہی شکر گزار ہیں جتنے کہ شیخ جلی
اور ڈان کو یجزاٹ کے فساد نولیسوں کے جھٹوں نے ہماری
تفریح طبع کے لیے کافی مصالحہ مہیا کر دیا ہو“

میں تو پروفیسر صاحب کے اس اجتہاد کی اشاعتِ ان اوراق میں
گوارا نہ کرتا لیکن صرف مثال کے طور پر یہ بتانے کے لیے کہ سید
جمال الدین افغانی اور ان کی تحریک سے ہندوستان کے لوگ
کس قدر ناواقف ہیں، میں نے اس بے معنی مضمون کے بعض اقتباسات
کو پیش کرنا ضروری سمجھا تاکہ ”آثارِ جمال الدین“ کے پڑھنے والے
ان اوراق کا گہرا مطالعہ کریں اور ”افغانی“ تحریک کو سمجھنے کی
کوشش کریں۔

ایک دوسرے مذہبی اور علمی رسالہ کے مدیر صاحب نے جو
”علومِ قرآنی اور حقائقِ فرقانی کا ذخیرہ“ ہے، اپنے علم و فضل کی
ایک شدید ”جھلّاہٹ“ میں ممالکِ اسلامی کی قومی تحریکات پر
تبصرہ فرماتے ہوئے یہاں تک تحریر فرما دیا کہ :-

”ہم یورپ کے ان ناخدا شناس مفکرین کی قدر کر سکتے
ہیں جنہوں نے اپنے زورِ طبع سے کسی نئے نظامِ فکر و
مذہب عمل کی بنا رکھی مگر انا ترک اور رضائے پہلوی
جیسے تھرڈ کلاس آدمیوں کی ہم کیا قدر کریں جن کی پوری
زندگی سے ایک اجتہادی کارنامہ بھی نکال کر نہیں بنایا

جا سکتا

یہ مشتبہ امتیاز صرف ہندوستان ہی کے مسلمانوں کو حاصل ہو کہ وہ سب سے زیادہ بے دست و پا بھی ہیں اور دوسروں پر نکتہ چینی کرنے میں سب سے زیادہ بلند آہنگ بھی! یہ رجعت پسند اور شدت پسند مذہبیت جس کے غیر سنجیدہ مظاہرے ہندوستان میں ہر روز ہوا کرتے ہیں ایک ایسی پست ذہنیت کا پتہ دیتی ہو جس کو ہم جو کچھ بھی کہیں لیکن ترقی پسند تو نہیں کہہ سکتے۔ یوروپین امپیرلزم کے مقابلہ میں انا ترک اور رضا شاہ پہلوی کے کارنامے بالواسطہ جمال الدین افغانی کی تحریک آزادی کے شاندار نتائج ہیں لیکن جب ہندوستان کے فرسٹ کلاس جتہ و قہ کی نظر میں یہ دولوں بھی "تھرڈ کلاس آدمی" قرار پائیں تو ظاہر ہو کہ جمال الدین افغانی تو فوراً تھک یا فقہ کلاس سے اوپر کوئی جگہ بھی نہیں پاسکتے۔ ذہنی فضا کی اس ماتم انجیز پستی میں اگر آج تک جمال الدین افغانی کے نام سے اکثر محراب و منبر نا آشنا رہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔

مگر فتم حضرت ملا ترش روست بھگاہش مغز دانش اسد از پوت
اگر با این مسلمانی کہ دارم مرا از کعبہ می راند حق اوست
(اقبال)

ان اوراق کی ترتیب میں میں نے کوشش کی ہو کہ افغانی کے متعلق مبالغہ آمیز توصیف و تحمیل سے احتراز کروں۔ چنانچہ بہت سی ایسی روایات کو میں نے نظر انداز کر دیا اور بہت سے ایسے بیانات

کے لہجہ کا جوش و خروش کم کر دیا جو ایرانیوں اور افغانستانیوں کی تالیفات میں میری نظر سے گزرے۔ ایک کام مجھ سے نہ ہو سکا اور وہ یہ کہ میں خود ایران اور افغانستان جاتا اور برسرِ موقع بعض اُن واقعات کو تحقیق کرنا جن کی صحت میں مجھے شبہ ہو۔ بہر حال ”آثارِ جمال الدین“ محض ایک نقشِ اول ہو اور اس عجیب و غریب شخصیت کی روئدادِ حیات کے بہت سے ایسے گوشے میری دسترس سے باہر رہ گئے ہیں جہاں اہل نظر کو ۱۸ویں اور ۱۹ویں صدی میں اسلامی ممالک کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے لیے بہت وسیع میدان مل سکتا ہو۔

میرا آخری فرض اُن محترم اجاب کا شکریہ ادا کرنا ہو جن کی ہمت افزائی نے مجھے اس کام پر آمادہ کیا۔ مسیح الملک حکیم اجمل خان، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا ابوالکلام آزاد کی صحبتوں میں میں ”افغانی“ کی عظمت سے آشنا ہوا اور اُن بزرگوں نے میری اس جستجو میں اکثر مشکل مقامات پر میری امداد فرمائی۔

ان تین کے علاوہ ہندوستان میں کچھ اور اربابِ نظر بھی ایسے تھے جنہوں نے وقتاً فوقتاً میری مشکلات کو آسان کیا۔ سب سے زیادہ میں سردار صلاح الدین خاں سابق سفیرِ کابل کا مرہونِ منت ہوں کہ موصوف نے کئی بار افغانستان سے میرے لیے مفید معلومات حاصل فرمائی۔

یورپ میں میری تلاش و جستجو کو سب سے زیادہ روشنی علامہ پروفیسر گارڈنر براؤن سے حاصل ہوئی۔ مرحوم مستشرق کے محترم

وجود میں تیں نے علم و فضل کی اعلیٰ کردار کا ایک نظر افروز نمونہ نہ دیکھا اور میں اُن سے اپنی اُس پہلی ملاقات کو بھول نہیں سکتا جب ایک اجنبی طالب علم کی حیثیت سے میں اُن کے گھر گیا تھا اور وہ میرے مدعا کو معلوم کرنے کے بعد مجھ سے اس طرح ملے تھے کہ گویا وہ مجھے برسوں سے جانتے ہیں اُس حالت میں جب کہ امراض قلب کی وجہ سے اُن کو ملاقاتیں کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی پہلی ہی ملاقات میں اُنھوں نے جمال الدین افغانی کے متعلق مجھے اپنا سارا خزانہ دکھا دیا اور تین گھنٹے تک افغانی کے اذکار میں اس طرح مشغول رہے کہ گویا وہ کبھی بیمار ہی نہ تھے۔ جب تک میں انگلستان میں رہا افغانی کا نام میرے اور اُن کے درمیان ایک ایسا واسطہ بن گیا تھا کہ نہ وہ گورے تھے اور نہ میں کالا تھا اور نہ وہ انگریز تھے نہ میں ہندوستانی۔ علم و فضل کی یہ سیرت و کردار میں نے اپنے ملک کے بہت کم علما و فضلا میں پائی ہو۔ دوسرا نام جو دلی شکریہ کے ساتھ میں لکھتا ہوں مس Carlton کا ہے جو شیخ کے بہت گہرے دوست مرحوم بلنٹ کی ہمیشہ رہیں اور جن سے پروفیسر براؤن نے میرا تعارف کرایا تھا۔ ان محترمہ نے بلنٹ کے تمام کاغذات مجھے دکھائے اور شیخ کے متعلق بعض دلچسپ دستاویزات مجھے ان ہی کاغذات سے حاصل ہوئیں۔

یورپ میں منجملہ بہت سے اجاب کے جنھوں نے میری امداد کی، دو اور محترم اجاب ایسے ہیں جن کا ذکر کرنا میرے جذباتِ تشکر کا تقاضہ ہے۔ ان میں ایک اسد فواد بے مارشل فواد پاشا مرحوم کے

صاحبزادے ہیں۔ موصوف کی شخصیت ترکی سیاست میں ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ اُن کے والد ماجد مارشل فواد پاشا مشہور معرکہ پلودونا میں غازی عثمان پاشا کے شانہ بشانہ لڑے تھے اور اُسی مغرکہ کی خدشات کے معاوضہ میں اُن کو سلطنت ترکیہ کے فیلڈ مارشل کا اعزاز عطا کیا گیا تھا۔ اسد فواد بے نے اپنی زندگی سلطانی استبداد کی پہلی ضرب کھا کر شروع کی تھی۔ وہ اپنی نوجوانی کے زمانہ میں سیاسی شبہ کی بنا پر غلاطہ سرلئے کے محبس میں چند روز بند ہے اور ترک احرار کی کامیابی کے بعد وزیر اعظم کامل پاشا کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ اُس کے بعد محمود شوکت پاشا کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ پھوتمیسرے وزیر اعظم پرنس سعید حلیم کے معتمد بنائے گئے۔ ۱۹۱۷ء کی جنگ شروع ہونے کے بعد وہ طلعت پاشا کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ جنگ کے ختم ہونے کے بعد اُن کو سوئٹزر لینڈ میں پناہ گزیں ہونا پڑا اور وہیں لوزان کی صلح کانفرنس کے زمانہ میں میں نے اُن کے گھر جہاں رہ کر قدیم اور جدید ترکی کی دلتواز انسانیت کا یہ نظر افروز نمونہ دیکھا۔ گویا میں نے ان چند ہفتوں میں آل عثمان کی انقلابی تاریخ کے بہت سے زندہ اوراق کا اول سے آخر تک مطالعہ کر لیا۔

دوسرے محترم دوست ڈاکٹر بہجت دہبی ہیں جو دہبی پاشا کے دوسرے صاحبزادے ہیں۔ ۱۹۱۷ء کی جنگ سے پہلے اُن کے خاندان کا مصر کے شاہی خاندان سے بہت گہرا تعلق تھا چنانچہ وہ اپنی طالب علمانہ زندگی میں شاہزادہ سعید حلیم اور شاہزادہ عباس حلیم سابق خدیو مصر کے ہم سبق رہے۔ جدید طب میں اُن کا مرتبہ بہت بلند سمجھا جاتا ہے۔

مصر میں وہ طبّی کالج کے ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے۔ کچھ عرصہ تک وہ سعد زاعلول پاشا کے اسٹاف میں اُن کے طبّی مشیر رہے اُس کے بعد برطانوی رزیڈنٹ کے ناراض ہو جانے کی وجہ سے اُن کو ترک وطن کرنا پڑا اور عرصہ تک پیرس میں مقیم رہے۔ ۱۹۳۳ء میں موصوف جامعہ ملیہ دہلی کی دعوت قبول کر کے توسیعی لکچر دینے ہندوستان بھی تشریف لائے تھے۔ اب وہ زیادہ تر مصر میں رہتے ہیں اور بین الاقوامی مسائل کے بہت بڑے واقف کار سمجھے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر دہبی کے علم و فضل کے متعلق ایک عجیب اور بہت دلچسپ بات مشہور ہے کہ اب دنیا میں صرف وہی ایک شخص ہیں جو مصری مئی تیار کرنے کے قدیم نسخہ سے واقف ہیں۔ ۱۹ویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں موصوف مصر اور ترکی کے سیاسی مسائل سے بہت گہرا تعلق رکھتے تھے۔

دیار مغرب میں ان احباب اور اُن احباب کے علاوہ بھی بہت سے احباب اور ارباب علم و فضل نے افغانی کے متعلق ایک مسافر کی تلاش و جستجو میں ہر ممکنہ اعانت فرمائی اور اُن سب کا میں مشکور ہوں۔ یہ اوراق کم و بیش دس سال کی تلاش و جستجو کا حاصل ہیں۔ اس معامل کا ایک حصہ یعنی شیخ کے مضامین اور مقالات اور قلمی کارناموں کا ایک ذخیرہ میرے پاس ابھی محفوظ ہے اور اگر زمانہ نے مہلت دی تو ان اوراق کی تکمیل کے بعد انشاء اللہ اُس کی ترتیب کا کام بھی شروع ہو جائے گا۔

محمد عبد الغفار

حیدر آباد۔ دکن
۱۵ اگست ۱۹۳۳ء۔

خاندان اور تاریخ و مقام ولادت

پہلی ہی منزل پر شیخ کے سوانح نگار کا قلم لغزش کرتا ہے۔ منزل دشوار گزار ہے۔ اُن کے خاندان، مقام ولادت اور قومیت کے متعلق بہت ابھی ہوئی بحث ہمارے سامنے ہے، بہت سے متضاد بیانات ہیں۔ نفی اور اثبات کی ایک صبر آزما آویزش ہے جس سے بچ کر نکل جانا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے۔ قضیہ دراصل ایرانیوں اور افغانیوں کے درمیان ہے۔ ایرانی شیخ کو ایرانی کہتے ہیں اور اُن کے ایرانی ہونے پر بے شمار دلیلیں لاتے ہیں۔ مگر افغان مدعی ہیں کہ وہ افغان تھے اور اپنے دعوے کو بہت سی تاریخی شہادتوں اور بیانات سے استوار کرتے ہیں۔ یہ قضیہ سراسر قومی ہے، شخصی نہیں ہے۔ دونوں ایک ہی طرہ افتخار کے لیے جھگڑ رہے ہیں۔ دونوں میں سے ہر ایک کو یہ ضد ہے کہ جمال الدین کے ہم قوم ہونے کی عزت ہمارے ہی لیے مخصوص ہو۔ یہ کہتے ہیں وہ ہمارے تھے اور ہم میں سے تھے، وہ کہتے ہیں کہ وہ ہمارے تھے اور ہم میں سے تھے۔ دونوں کے جذبات قابل احترام ہیں اور دونوں کے بیانات وزن رکھتے ہیں۔ شیخ کے سوانح نگار کے لیے خاکِ ایران اور ارضِ افغانستان کے اس قضیے میں ثالث بالآخر بننا بہت ہی مشکل کام ہے۔ پھر یہ الجھٹا کیونکر سُجھے؟ درمیانی

صورت صرف یہ ہو سکتی ہو کہ فریقین کے بیانات سے قطع نظر کر کے صرف اُسی بیان کو معتبر اور فیصلہ کن سمجھا جائے جو خود شیخ کا بیان ہو اور مستند ذرائع سے ہم تک پہنچا ہو۔ مگر یہ بھی آسان نہیں، اس لیے کہ ایک فریق اس قسم کے بیانوں کو ”بیانِ حقیقت“ نہیں سمجھتا اور شیخ کی خاص خاص سیاسی مصطلحات پر محمول کرتا ہو۔ بہر حال بہتر یہ ہو گا کہ پہلے دونوں طرف کے بیانات پیش کر دیے جائیں۔ لہذا اول اُن شہادوں کو دیکھیے جو شیخ کے ایرانی ہونے پر دلیل لائی گئی ہیں۔

(۱) ”... سید جمال الدین کے آباد اجداد ۸۸۸ھ ہجری سے اسد آباد میں مقیم تھے۔ قبروں کے کتبوں اور بعض دیگر تحریروں سے اُن کے بزرگوں کی تاریخ بہ آسانی معلوم ہو سکتی ہو۔ الغرض وہ ہر اعتبار سے اسد آبادی ہیں۔ اُن کے بزرگ اپنے علوم اور کمالات کے باعث ہمیشہ مشہور رہے۔ جلال الدولہ شیخ الاسلام قاضی سید صالح السعید الشہید بھی انھیں کے خاندان سے گزرے ہیں۔ ان کا خاندان ہمیشہ مربع خواص و عوام رہا ہو اور خوارقِ عادات کا وسیع سلسلہ اس سے منسوب ہوتا رہا ہو۔ اُن کے والد ماجد سید صفدر بن سید علی بن میر ضیاء الدین محمد الحسینی شیخ الاسلام بن میر زین الدین الحسینی القاضی بن میر ظہیر الدین محمد الحسینی شیخ الاسلام بن میر اجل الدین محمد الحسینی شیخ الاسلام مختلف فنون و علوم سے آراستہ تھے اور اپنے زمانے کے مشہور و رویش شیخ مرتضیٰ مرحوم سے بہت ربط و ضبط رکھتے تھے۔ انھیں بھی دینی امور سے بہت اعتناء تھی اور ہمیشہ اپنی زمین اور چھوٹے سے بلغم میں رہ کر قناعت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ اُن کی والدہ کا نام سکینہ بیگم تھا اور میر شرف الدین الحسینی القادری کی بیٹی تھیں۔ اس طرح وہ نجیب الطرفین تھے اور یتیموں کے مشہور و معروف خاندان سے تعلق رکھتے تھے“

لہ بیان مرزا الطیف اللہ اسد آبادی جو جامعہ ملیہ دہلی کی مطبوعہ اور شائع کردہ سوانح عمری میں نقل کیا گیا

(۲۱) "...محقق است کہ جدِ کبارش از ۶۳۰ هجری در اسد آباد توطن و سکنه داشته اند۔ از بعضی نوشتجات و بخصوص از الواح قبور نیاگان و اجدادش
..... چہار صد و ہفتاد ہفت سال می شود ۱۰۰۰

(۳) جناب اخوند ملائے طالقانی معروف بہ شیخ الرئیس نقل کرد از جناب آقا سید اسد اللہ خرقانی کہ الیوم در نجف در ادارۂ آقائے خراسانی و از بزرگانِ شہیدم کہ گفت از سید جمال الدین سبب را پر سید محبوب داد افغان در جائے کونسل نہ دارد۔ من خود را بہ افغان نسبت دادم کہ از دست کونسل ہائے ایرانی آسودہ باشم و در ہر شہرے کہ می روم گرفتار کونسل نہ باشم ۱۰۰۰

(۴) "از فرزندانِ عالم جلیل سید علی ترمذی محدث مشہور است و نسبِ عالی بہ خاس آلِ عباسین بن علی بن ابی طالب می رساند۔ تولدش ۱۲۵۴ ہجری مطابق ۱۸۳۹ء در قریہ اسد آباد ۱۰۰۰

(۵) "پدر سید جمال سید صفدر از سادات اسد آباد شغلش رعیتی بود۔ خانوادہ سید جمال الدین از خانوادہ ہائے صحیح و از ساداتِ عالی درجاتِ حسینی و اتصالِ شجرہٗ این سلسلہ بنجاس آلِ عباس حضرت امام حسین ثابت و معلوم است"

"سید صفدر پسرش سید جمال را در پنج سالگی بہ مکتب گزارده۔ چون فطانت و ذکاوتِ خوب داشت در ہشت سالگی از خواندن و نوشتن فارسی فارغ گردید ...
..... در ۱۰ سالگی سید جمال الدین از پدرش قہر کردہ بہ شہر بہمان رفت و در مدت

۱۰ لطف اللہ خان در "شرح حال و آثار سید جمال الدین اسد آبادی" مطبوعہ برلن ۱۳۲۲ء
۱۰ "تاریخ بیداریِ ایران" جلد اول۔ مؤلفہ آقائے ناظم الاسلام کرمانی۔

۱۰ مشاہیر الشرق۔ مؤلفہ جرجی زیدان۔ اس بیان کو صاحب "بیداریِ ایران" نے
بھی نقل کیا ہے۔

ہمدان مشغول تحصیل بود۔ مدتے در اصفہان و مشهد مشغول تحصیل بود۔ ازال جا بطرف افغانستان مسافرت نموده^{۷۵}

(۶)..... خانہ مسکونی پید امروز در اسد آباد معلوم است۔ طائفہ وفا میلش را ہمہ کس می شناسند۔ جناب آقا مرزا علی مجاہد سہلانی کہ از موثقین است گوید من خواہر سید جمال را در چند سال قبل در اسد آباد ملاقات نمودم۔
..... صاحب اختیار نگارندہ گفت کہ زمانیکہ جمال الدین بطہران آمد، ہلاقتش رقم و در مجلس مذاکرہ از دو سوال کردم۔ سید تجاہل کرد و فرمود شنیدہ ام کہ اسد آبائی در نزدیک ہمدان است کہ ہالیش بسیار جاہل و عامی اند چون دانستم کہ تجاہل می کند لہذا ساکت شدم۔^{۷۶}

(۷) ————— ”جناب آقائے طباطبائی فرمود کہ پسر عموی جمال الدین آقا سید ہادی در مدرسہ چار حصار ایران تحصیل می نمود و سید از اہل اسد آباد است...^{۷۷}
(۸)..... طایفہ صاحب اختیار می گویند کہ سید کمال برادر زادہ سید جمال الدین الیوم در اسد آباد است.....^{۷۸}

(۹)..... جناب جاح سیاح محلاتی کہ از دوستان سید می باشد مذکور ساخت کہ چون سید جمال الدین مقصد بزرگے داشت در بارہ ایران لہذا خود را بہ افغان نسبت داد تا از صدمہ و اذیت ناصر الدین شاہ محفوظ بماند۔ خادم و مصاحب سید کہ معروف بہ عارف آفندی است ابو تراب نامے است کہ برادرش خادم مدرسہ

۷۵ ”تاریخ بیداری ایران“

تہ صاحب اختیار سلمان خاں کا لقب تھا۔ اسد آباد ان ہی کی جاگیر و علاقہ میں واقع ہے۔
طائفہ سے مقصود ان کے خاندان کے لوگ ہیں یا ملازمین۔

۷۶ ”تاریخ بیداری ایران“ ۷۷ از تاریخ بیداری ایران “ ۷۸ ”تاریخ بیداری ایران“

چار حصار است و شہدی علی اکبر نام دارو۔ و خود عارف آفندی نوکر جناب آقا مرزا طباطبائی بود۔ در آیا میکہ جمال الدین وارد طهران گردید البتہ اب مجذوب سید جمال شدہ از آقائے طباطبائی اذن و مخصی خواست و خود را بہ عنوان خانے بہ سید بست و بایستہ مسافرت نمود۔ از تربیت و انفاں قدسیہ او نگذشت قدمے کہ بہ عارف آفندی و مصاحب سید جمال معروف گردید ^{۱۱۰}۔

(۱۰) " شیخ اسد آباد نواح کابل میں نہیں بلکہ اسد آباد متصل ہمدان میں پیدا ہوئے تھے ^{۱۱۱}۔

(۱۱) ساگس (Sykes) نے بھی اپنی تاریخ ایران جلد دوم میں بیان کیا ہے کہ شیخ ہمدان کے قریب پیدا ہوئے اور نجف میں تعلیم پائی۔ مگر اپنی معلومات کا کوئی معتبر ذریعہ ظاہر نہیں کیا ہے۔

یہ بیانات اس فریق کے ہیں جو شیخ کی وطنیت اور قومیت کو ایرانی تصور کرتا ہے۔ اُن کے مقابلے میں دوسرے فریق کے بیانات پر بھی نظر کیجیے۔

(۱۱) "..... اُن کے والد، والدہ، چچا اور تمام رشتہ دار کونان ^{۱۱۲} (؟) میں رہتے ہیں جو کابل سے جلال آباد کی سڑک پر دو دن کی مسافت ہے۔ شیخ کے ایک عزیز سید محمد بادشاہ کونان کے حاکم ہیں اور اُن کی شادی امیر دوست محمد خاں کی لڑکی سے ہوئی ہے۔..... ^{۱۱۳}۔"

^{۱۱۴} از تاریخ بیداری ایران - لہ از تاریخ بیداری ایران -

^{۱۱۵} غالباً یہ نام کنار (؟) ہے اسی نام کا ایک دریا بھی ہے جو جلال آباد کے قریب دریائے کابل سے مل جاتا ہے۔ کناریشات اور جلال آباد کے درمیان جلال آباد سے تقریباً ۳۰ میل ہے۔ نقشے میں اس کا محل وقوع ۴۰ اور ۴۲ عرض البلد کے درمیان ہے۔

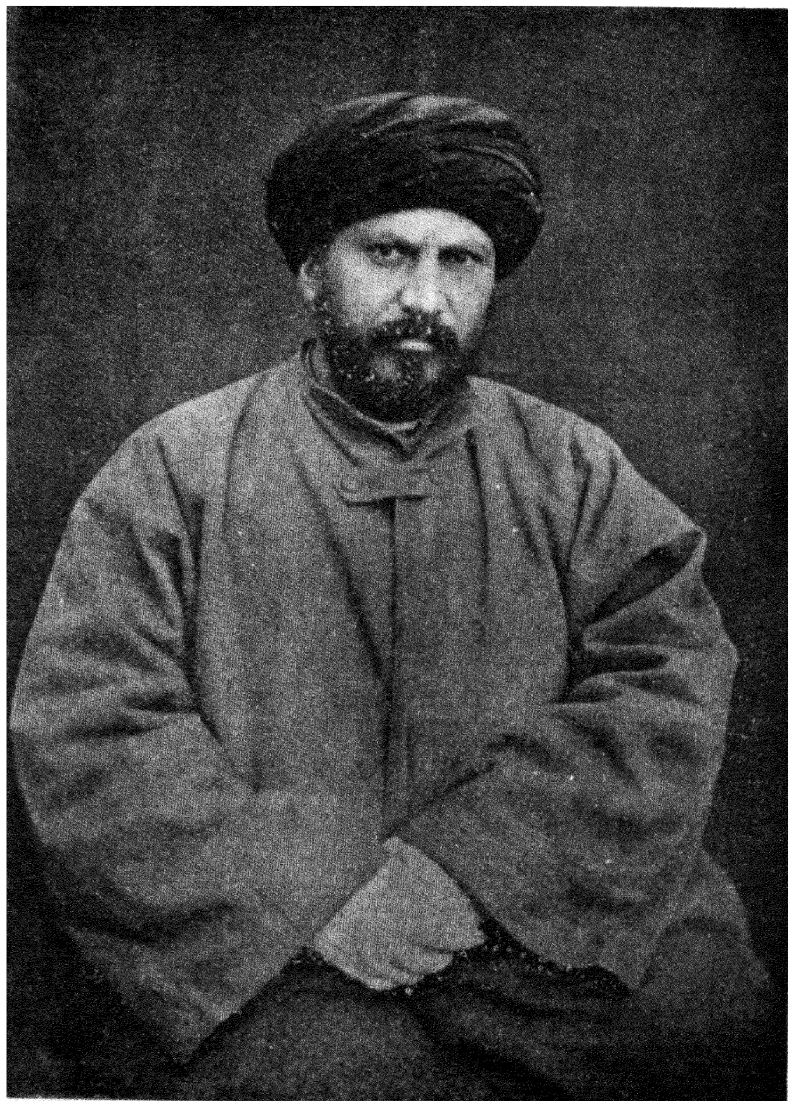
^{۱۱۶} بلنٹ "در ہندوستان" بہ عہد ہیں۔

(۳۰)..... بعض واقعات کی تائید اور بعض امور کے اضافہ میں اپنے والد محترم مولانا اصغر علی خاں افغانی کے افاداتِ علیہ سے مستفیض ہوتا ہوں کیونکہ سید جمال الدین کے زمانہ قیام کابل و ہندوستان میں میرے والد ماجد اُن سے ملے تھے اور اُن کی صحبت میں رہ کر اُن سے استفادہ کیا تھا..... سید جمال الدین ۱۲۵۴ھ ہجری (۱۸۳۹ء) میں بھٹام اسد آباد پیدا ہوئے جو افغانستان کے مشہور ضلع کنڑ میں واقع ہے۔ اس ضلع میں ساداتِ حسینی کا ایک مشہور خانمان آباد ہے جو تمام ملک افغانستان میں نہایت عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ سید جمال الدین بھی اسی مبارک خانمان کے ایک مایہ ناز فرزند تھے۔ ان کے والد بزرگوار کا نام سید صفدر تھا۔ آپ کا سلسلہ نسب سید علی ترمذی مشہور محدث سے ملتا ہے اور آگے چل کر جناب امام حسین علیہ السلام سے متصل ہو جاتا ہے۔..... علیہ السلام

(۳۱) افغانستان کے مختلف عناصر میں سے ایک جماعت سادات (اولادِ علیؑ ابن ابی طالب) کی بھی ہے جو اس ملک میں سید کہلاتی ہے۔ اس جماعت کے بعض لوگ مقام شنگ میں رہتے ہیں اور بعض ولایت کنڑ میں آباد ہیں جو جلال آباد کے پاس ہے۔ سادات کنڑ بابر شاہ کے زمانے سے لے کر آج تک علما و اکابر سے خالی نہیں رہے۔ عام طور پر تمام افغانی اُن کے ساتھ بڑی عقیدت رکھتے ہیں اُن کے عادت و اخلاق و لباس افغانیوں کے مشابہ ہیں۔

۴۱۔ ہندوستان یک عقیدہ موجود است کہ جمال الدین مرحوم را ایرانی اسد آبادی می گویند و ایں صرف خیال و ہم بہ نظرمی آید۔ تمام دلائل ایرانی بودن کے نسخ کی تالیف "تاریخ افغانستان" کے مترجم مولوی محمود علی خاں نے اپنے دیباچے میں یہ عبارت لکھی ہے۔ صاحب موصوف پچھلے چند سال تک حیات تھے۔ اور بھوپال میں مقیم۔

۴۲۔ از سید جمال الدین در "تاریخ افغانستان"



سید جمال الدین «الافغان»
(وفات ۹ مارچ ۱۸۹۷ع)

او در کاوہ موجود است و لے ہیج کد ام دلیل نیست نویسنده معق کا وہ خودش ایس را قبول نہ دارد۔ مگر بیچارہ افغان ہا کہ امروز در دنیاے صدائے در زبانے را مالک نیستند نزدیک است کہ ایس حقیقت ہم پوشیدہ شدہ و آقائے تقی زادہ کہ بہ آزادی خیال و پاکی از تعصب مشہور اند ہم با وجود شہادت بریں کہ فارسی مشارالہ مرحوم فارسی ایرانی نیست ارادہ میل بہ ایس عقیدہ دارند کہ او ایرانی خواہد بود۔ امیر شکیب ارسلان شاہی (کہ خود مولانا را ملاقات کردہ و ارادت شاگردانہ بہ او دارند) و عالم اہل موسیٰ جارائند۔ تاتاری پیش خود من از افغانیت او اعتراف داشتند۔ من شنیدہ ام کہ در دفاتر افغانیہ کا غذات نسبت بہ خاندان ایشاں و بنام پدر ایشاں (سید صفدر) موجود مہتد و از خاندان ایشاں بعض تاحال در آں جا موجود است۔ در علاقہ موجودہ کنر در افغانستان کہ برلے سکونت سادات مخصوص است شیر کدہ نام جائے است کہ معنی اسد آبادی دہد۔۔۔۔۔ تسن مولانا ربہ ہمہ وزارت مولانا در عہد امیر محمد اعظم خاں در افغانستان چیز ہائے نیت کہ غیر از افغان بودن مولانا چیزے دیگر ثابت کند۔ نیز بزرگ ترین رفقائے مولانا مجتہد معظم مصری شیخ محمد عبدہ صریحاً از جائے ولادت مولانا بنام و از افغان بودن ذکر می کند۔

(۵۱) "شیخ جمال الدین در افغانستان در تاریخ ۱۲۵۴ھ تولد و در آں جا منسوب

۱۹۱۵ و ۱۹۱۶ دیکھے ضمیمہ جات۔ ۱۹۱۷ دیکھے ضمیمہ جات۔ ۱۹۱۸ دیکھے ضمیمہ جات

۱۹۱۹۔ ۱۹۲۰ میں جب میرا قیام یورپ میں تھا تو اس زمانے میں جنرل نادر خاں مرحوم و مغفور (جو بعد کو افغانستان میں مالک تاج و تخت ہوئے) افغانی سلطنت کے نمائندے کی حیثیت سے پیرس میں مقیم تھے۔ اور مجھے اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملتا تھا۔ اس مسئلے پر مرحوم و مغفور سے بارہا گفتگو ہوئی اور میری التجا کو قبول فرما کر مرحوم نے اپنا ایک تحریری بیان مجھے عنایت فرمایا جس کا ضروری اقتباس یہ جو درج کیا گیا۔

بہ سادات معروف کوثر است۔ ۱۱۲

(۶) "در قریہ کنیز افغانستان تولد یافتند در سال ۳۵۴ ھجری۔"

(۷) "بعض از مؤرخین مثل سلطان محمد خاں - شیر محمد خاں غلزنائی ہیئت مؤرخین سراج التواریخ وے ناسید و منتسب بہ اہل نبوت و آلہ اند کہ مؤید قول شاں بعضے از مؤرخین فارس و ماوراء النہر ہم بودہ - و صاحب تالیف تذکرۃ الابرار خانوادہ سید جمال الدین را از اولاد میر سید علی ترمذی می دانند مثلاً بہ این صورت کہ سید جمال الدین بن سید حسن بن مولانا میر سید علی است چوں سید علی یک شخص عالم و فاضل و مخصوصاً در فن رسم نقاشی مہارت داشت ، ہمایوں بادشاہ اورا بمعیت خود بہ ہند برد - و پس از زمانہ ہمایوں پسرش حسن کہ در فضائل و کمالات مثل پدر بود در جملہ ندیمان اکبر بادشاہ بہ ہند می زیست - آخر ادرکابل آمدہ توقف گزین خاک کابل شد - ہمچنین بعضے از مؤرخین افغانی و خارجی مثل مؤلفین سکینۃ الفضلا ، تذکرۃ الابرار ، نگارستان ، تذکرۃ شمع بختن وغیرہ دارند کہ ورود خانوادہ سید جمال در کابل از سالہائے عہد گورگانی ہلودین ہائے افغانی ہست بہر حال مؤرخین خود یا افغانی و خارجہ جمیع بہ یادت جمال الدین و خانوادہ اش اکثریت دارند و ورود ایں خانوادہ را از عہد گورگانی ہلودین ہائی گویند - جد اعلیٰ جمال الدین کہ در تاریخ معروف است ، سید علی است اگرچہ سید علی معروف بہ ترمذی بالاتر ازاں ہم سلسلہ روشن اجدادے امی (؟) خاندان نبوت دارد وے از آل جا کہ بین سید علی قطفی مصوّر مشہور عہد ہمایوں و سید علی ترمذی شیخ معروف اشتباہ موجود است کہ آیا ایں دو نفر شخص علیحدہ یا بصفتا علیحدہ و فی حد

۱۱۳ "بیوک مجاہد شیخ جمال الدین افغانی" از سید علی خاں در اخبار وطن قسطنطنیہ اشاعت مورخہ ۳۰

اگست ۱۲۹۴ ھ - بہرہان الدین قلیچ خاں - از تلامذہ قدیم جمال الدین افغانی در جریۃ ملت قسطنطنیہ -

ذات یکے ہوئے اند۔ انہیں رونمی شود دیگر سلسلہ ابدادی سید جمال الدین رازید توضیح نمود۔۔۔۔۔ امیر دوست محمد خاں سید صفدر را مغایر روش پولتیک خود دیدہ بکابل جلب کردہ بود۔ بلکہ وجاییداد اورا بہ عنوان مصادره جایتداد سرکاری قید و ضبط داشتہ بود ابداد سید صفدر کہ بقول مؤرخین خواہ از بخارا و تبریز یا از خان آباد موجودہ وطن مشرقی کابل آمدہ باشند معلوم است بہ عالمہ نہ آمدہ بودند۔ زیرا والدہ سید صفدر وجدہ اش از افغانان صافی کتر بہ ہمیں نسبت خویشی قدیمہ سید صفدر ہم باہمان طایفہ پرداخت کردہ بود۔ سید صفدر بعضے موسم گرما را بخوگیانی جلال آباد و بعضے سالہا را بخود کابل سفر می نمود و نظر بہ عشقہ کہ در تحصیل علوم داشت گاہے بہ ہند ہم تشریف بُردہ بہ تماشای تدریس خانہ با و صحبت علمائے آنجا مشغول می باشد۔۔۔۔۔ در محاربہ سال ۱۲۵۶ ہجری سید صفدر در ردیف مجاہدین سمت مشرقی اقوام خود ہم شامل شدہ بود۔ سید ہاشم مجاہد مشہور کہ از جملہ حکام امیر دوست محمد خاں و موقع عوات شجاع الملک بہ وے تسلیم نہ شدہ و در قلعہ خصوصی خویش بہ کثر مردانہ و فاع از قوت اجنبی کردہ بود او ہم از بنی اعمام سید صفدر ہوئے است ۱۲۳

(۸)۔۔۔۔۔ رو علی الدہرین کے ترجمہ عربی مطبوعہ حیدر آباد (۱۲۵۶ھ) اور مطبوعہ بیروت (۱۲۵۷ھ) کے ابتدائی اوراق میں شیخ کے جو مختصر حالات درج ہیں وہ بھی شیخ کے افغانی ہونے پر دلالت کرتے ہیں ۱۲۴

بہر حال خاندان مولد تاج و مقام ولادت قومیت اور نسب کے متعلق یہ ہیں وہ تمام بیانات جو مختلف ذرائع سے اب تک حاصل ہو سکے ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی یہ تمام بیانات بعض امور کے متعلق بالکل متفق ہیں یعنی یہ سلسلہ ہی کہ شیخ

۱۲۵ غلام جیلانی اعظمی۔ در مجلہ کابل۔ شمارہ دوم۔ ۴ جولائی ۱۹۳۱ء

۱۲۶۔ اس رسالے کے اب جو نسخے ملتے ہیں ان میں شیخ کے حالات کا حصہ موجود نہیں پایا جاتا۔

۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے اور یہ کہ اُن کے والد ماجد کا نام سید صفدر تھا۔ سلسلہ نسب کے متعلق صرف اعلیٰ کا بیان تمام دوسرے بیانات سے مختلف ہے اور چونکہ کسی دوسرے ذریعے سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی ہے اس لیے اُس کو مشتبہ اور ناقابل اعتبار سمجھا جاسکتا ہے۔

مقام ولادت اور قومیت کے باب میں سب سے زیادہ اُلجھانے والا بیان مرزا لطف اللہ خاں کا ہے جو شیخ کے خواہر زادے کہے جاتے ہیں اور جن کی نسبت یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ عرصہ تک شیخ کی خدمت میں حاضر رہے۔ ۱۹۲۶ء میں اُن کی مرتبہ ایک سوانح عمری موسومہ ”شرح حال و آثار سید جمال الدین اسد آبادی“ چاپ خانہ ایران شہر برلن سے شائع ہوئی ہے جس کے دیباچے میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ ”اس کتاب ہر گونہ شک و شبہ را ازالہ می کند و ثابت می سازد کہ سید جمال الدین ایرانی و اسد آبادی بوده است“ نیز اس تالیف کی نمایاں خصوصیت بھی یہی معلوم ہوتی ہے کہ مؤلف نے شیخ کی زندگی کے تمام اہم حالات و معاملات کو پس پشت ڈال کر اپنا تمام زور اسی نکتہ پر صرف کر دیا ہے کہ شیخ افغانی نہ تھے بلکہ ایرانی تھے۔ درحقیقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ”شرح حال و آثار“ کا مقصد واحد صرف یہی دعویٰ پیش کرنا ہے کہ شیخ ایرانی تھے اس کے علاوہ کوئی دوسرا مقصد معلوم ہی نہیں ہوتا۔ مؤلف کا یہ غلو اُن کے دعوے اور بیانات کی قیمت کو بہت گرا دیتا ہے اس لیے ضرورت ہے کہ اُن کے بیانات پر غور کرنے سے پہلے خود اُن کی شخصیت پر غور کر لیا جائے۔ کتاب کے دیباچے میں لطف اللہ خاں کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے۔

”مرحوم (لطف اللہ) یکے از آزادی خواهان روشن فکر بود۔ از تربیت یافتگان فیض حضور فیلسوف مشرق حضرت جمال الدین اسد آبادی مشہور بہ

افغانی بود۔ در دو مرحلہٴ مسافرتش بہ پائے تختِ ایران در خدمتِ آن سید بزرگ وار مشغولِ استفادہ از فیوضاتِ معنوی و کمالاتِ صوری بودہ تا رونے کہ از ایران حرکت نمودند مرزا لطف اللہ خاں محررِ مقالاتِ سیاسی حضرت سید بودہ اند.....“

لیکن شیخ کی مسافرت و سیاحت کے جو حالات مختلف ذرائع سے ہم تک پہنچے ہیں ان میں کہیں لطف اللہ کا نام نہیں آتا۔ لطف اللہ بیان کرتے ہیں کہ وہ ہر دفعہ جب شیخ ایران آئے تو اُن کی خدمت میں حاضر رہے۔ شیخ کے اکثر سوانح نگاروں نے ایران میں اُن کے معقدینِ اجاب اور شرکائے کار کا تذکرہ بھی نام بنام کیا ہو۔ لیکن لطف اللہ کا کہیں نام نہیں آتا۔ لطف اللہ خود بیان کرتے ہیں کہ جب شیخ شاہ عبدالعظیم کی خانقاہ میں پناہ گزیں تھے تو وہ اُن کے پاس موجود تھے اور آخر تک موجود رہے۔ لیکن شیخ جب خانقاہ میں گرفتار کیے گئے تو بھی لطف اللہ کا کہیں ذکر نہیں آتا۔ بہر حال اگر اُن کے بیانات کو غلط نہ بھی کہا جائے تو اتنا تو ضرور کہا جاسکتا ہو کہ جو کچھ اُنھوں نے اپنی کتاب میں لکھا ہو وہ مبالغہ اور رنگ آمیزی سے پاک نہیں۔ آئندہ صفحات میں ان کی بعض روایات جا بجا نقل کی گئی ہیں جن سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جائے گی۔

مرزا لطف اللہ کی طرح ایک اور مدعی مؤلف ”تاریخِ بیداریِ ایران“ بھی ہیں۔ جنھوں نے اپنی تاریخ کے اوراق میں اس بحث پر بہت کچھ لکھا ہو۔ لیکن تاریخی حیثیت سے اُنھوں نے بعض ایسی غلطیاں کی ہیں جو اُن کے بیانات کی حقیقت کو بہت ناقابلِ اعتماد بنا دیتی ہیں۔ مثلاً صرف ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہو۔ شیخ کے خادم ابوتراب یا عارف آفندی کے متعلق لکھا گیا ہو کہ وہ ایران سے شیخ

کے ساتھ آیا لیکن شیخ کی زندگی میں ابوتراب کا ذکر پہلی دفعہ ۹۷۱ھ میں آتا ہے جب وہ مصر سے خابج البلد کیے گئے۔ مصر سے جب وہ حیدر آباد دکن آئے تو ابوتراب اُن کے ہمراہ تھا۔ ایران کا پہلا سفر شیخ نے ۹۷۱ھ میں کیا یعنی ہندوستان سے جانے کے چھ سال بعد۔ اگر ابوتراب مصر اور ہندوستان میں اُن کے ایران جانے سے پہلے شیخ کے ہمراہ تھا تو وہ ایران میں پہلی دفعہ اُن سے کب ملا؟۔ اس حالت میں صاحب بیداری ایران کا یہ بیان کہ ”در آیامے کہ سید جمال الدین وارد طهران گردید ابوتراب مجذوب سید جمال شدہ از آقائے طباطبائی اذن و مرضی خواست و خود را بہ عنوان خادمے بہ سید بست و بابتہ مسافرت نمود“

کمزور معلوم ہوتا ہے جب کہ وہ خود اس واقعہ کو تسلیم کرتے ہیں کہ ۹۷۱ھ سے پہلے شیخ کبھی ایران نہیں گئے۔ البتہ دس برس کی عمر میں بقول صاحب ”بیداری ایران“ وہ مشہد اور اصفہان گئے تھے۔ پھر اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اس زمانہ طفولیت میں شیخ کسی طرح طهران بھی پہنچ گئے تھے تو اس وقت ابوتراب کا شیخ کی خدمت سے وابستہ ہوجانا کسی طرح قرین قیاس نہیں۔

یہ مثال صرف اس لیے پیش کی گئی کہ ان صفحات کے پڑھنے والوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ صاحب ”بیداری ایران“ نے واقعات کو کس طرح مرتب کیا ہے اور اس کتاب کی تاریخی اور علمی حیثیت کیا ہے اور پھر تعجب یہ کہ یہ وہ کتاب ہے جس کے اکثر بیانات کو یورپین مستشرقین نے قبول کر لیا ہے! صاحب ”بیداری ایران“ نے شیخ کے بہ ظاہر افغانی مشہور ہونے کا بڑا سبب یہ بتایا ہے کہ

”چوں سید مقصد بزرگے داشت دربارہ ایران لہذا خود را بہ افغان نسبت داد تا از صدمہ و اذیت ناصر الدین شاہ محفوظ بماند...“

اور پھر شیخ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ
 ”جواب داد (شیخ) کہ افغان در جائے کونسل ندارد و من خود را به
 افغان نسبت دادم کہ از دست کونسل جائے ایرانی آسوده باشم...“
 پورین مستشرقین نے ”بیداری ایران“ کے اس سلسلہ دلائل کو بغیر
 جانچے مان لیا ہے حالانکہ اس بیان کی صحت بہت مشتبہ ہے۔ سوال تاریخی
 تحقیقات کا نہیں ہے بلکہ صرف یہ ہے کہ معمولی فہم کی کسوٹی پر اس واقعہ کو
 کس کر دیکھنے سے کیا نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔ آئیے ہم مسئلہ واقعات کو بحیثیت مجموعی
 سامنے رکھ کر اس بیان کو جانچیں۔

مان لیجیے کہ یہ واقعہ صحیح ہے کہ شیخ نے ایرانی حکومت سے بچنے کے لیے
 اپنے کو افغانی مشہور کیا لیکن ایرانی حکومت سے اُن کا تصادم عمر کے آخری
 حصے میں ہوا یعنی جب وہ افغانستان سے اپنا پیام لے کر دنیائے اسلام کی
 طرف آئے تھے تو ایرانی حکومت سے اُن کو کوئی واسطہ نہ پڑا تھا نہ پڑنے
 والا تھا۔ وہ عرصہ تک مصر اور یورپ میں کام کرتے رہے اور ایران کی
 سیاسیات سے اُن کو دور کا بھی کوئی تعلق نہ تھا۔ پھر یہ عجیب بات ہے کہ
 جو خطرہ پیش نظر بھی نہ آیا تھا اس کے لیے شیخ نے ۳۰ برس پہلے ہی پیش
 بندی کر لی تھی! اس قسم کی تیار کردہ شہادتیں عموماً فہم عامہ کی کسوٹی پر
 بہ آسانی کھوٹی ثابت ہو جاتی ہیں۔

علاوہ بریں اس بیان پر یقین کرنے والوں کی ہدایت اور رہنمائی
 کے لیے ایک اور نکتہ بھی قابلِ گزارش ہے۔

اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ مان بھی لیا جائے کہ شیخ در اصل ایرانی
 تھے اور سیاسی مصلحتوں کی بنا پر اپنے کو افغانی مشہور کرتے تھے تو یہ ظاہر ہے

کہ اُن کا یہ فریب عرصے تک اُن کے مخالفین اور خصوصاً انگریزوں سے پوشیدہ نہ رہ سکتا تھا اور انگریز جو مصر میں شیخ کی مخالفانہ کوششوں سے تنگ آچکے تھے اس راز کو فاش کر کے شیخ کو بہت بڑی شکست دے سکتے تھے۔ وہ اس طرح ازہر کے تمام علما کو اُن کے خلاف کر دیتے اور بہت آسانی کے ساتھ شیخ کے اثرات کا خاتمہ کر دیا جاتا۔ یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ شیخ نے کیوں کر ساری عمر اپنے اس راز کو چھپانے کی کامیاب تدابیر اختیار کیں۔ افغانستان میں وہ عہدہ وزارت پر فائز ہوئے۔ مصر میں وہ ازہر کے علما کو اپنا شریک کار بنانے میں کامیاب ہوئے۔ ترکی میں باوجود ترکی اور ایران کی باہمی خصامت کے، وہ اپنی قومیت کو چھپائے رہے اور باوجودیکہ ایران میں (بقول مرزا لطف اللہ خاں) بہت سے لوگ جانتے تھے کہ شیخ ایرانی ہیں اور خود شاہ ایران بھی اس راز سے واقف تھا لیکن وہ راز بدستور راز ہی رہا اور اُس وقت بھی جب کہ شاہ سلطان عبدالحمید خاں کو اس امر پر مجبور کر رہا تھا کہ شیخ کو ایرانی حکومت کے حوالے کر دیا جائے وہ یہ ثابت نہ کر سکا کہ شیخ دراصل ایرانی ہیں۔

ایک امر واقعہ اور بھی قابل غور ہے۔

شیخ کے ایک عزیز سید محمد پاشا حاکم کونان کی شادی امیر دوست محمد خاں کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ اس واقعہ کی کسی ایرانی سوانح نگار نے اب تک تردید نہیں کی (نیز امیر محمد اعظم خاں کے زمانے میں شیخ عہدہ وزارت پر بھی فائز ہو گئے تھے۔ ان دونوں واقعات کو مختلف اہل قلم نے بار بار دہرایا ہے۔ تاریخ افغانستان کا ہر مطالعہ کرنے والا جانتا ہوگا کہ اُس زمانے میں ایران اور افغانستان کے تعلقات نہایت خراب تھے حتیٰ کہ چند مرتبہ دونوں میں

لڑائی بھی ہو چکی تھی اور نہ صرف سیاسی تعلقات خراب تھے بلکہ مذہبی تعصبات بھی دونوں قوموں کے درمیان منافرت پیدا کر چکے تھے۔ ان حالات میں ایک ایرانی کا کسی طرح افغانی بن کر عہدہ وزارت حاصل کر لینا یا اس کے خاندان میں امیر کی بیٹی کا بیاہ جانا تقریباً ناممکن تھا۔ تاہم یہ دونوں واقعات ابھی تک فریقین کے درمیان مسلّمہ ہیں۔ مزید برآں ایک نکتہ اور بھی یاد رکھنے کے قابل ہو: وہ یہ کہ شیخ جو فارسی زبان کھتے اور بولتے تھے وہ ایرانی فارسی نہ تھی۔ اُن کی تقریریں اور تحریریں ہمارے سامنے موجود ہیں اور اس بحث کا فیصلہ مشکل نہیں کہ شیخ کی فارسی ایرانی تھی یا افغانی۔ اگر اس بیان کو صحیح مان لیا جائے کہ شیخ کی ابتدائی زندگی ایران ہی میں گزری اور اُنہوں نے تعلیم بھی ایران ہی میں پائی تو ناممکن ہو کہ وہ اپنی ابتدائی تعلیم و تربیت کے اثرات کو مٹا سکتے۔ نام کا بدل لینا آسان تھا لیکن زبان کا بدلنا تقریباً ناممکن تھا۔ میں نے ایک مرتبہ مرحوم پروفیسر براؤن کے سامنے بھی یہ بحث پیش کی تھی اور اُن کو بھی اتنا ماننا پڑا تھا کہ شیخ جو فارسی بولتے اور کھتے تھے وہ جو کچھ بھی ہو، ایرانی زبان تو نہ تھی۔ پروفیسر مرحوم نے اپنی تصانیف میں شیخ کے بہت کچھ حالات لکھے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ بلنٹ کے بعد مرحوم ہی یورپین مستشرقین میں سے پہلے شخص تھے جنہوں نے شیخ کی عظیم الشان شخصیت کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اُنہوں نے شیخ کی زندگی کے متعلق بہت کچھ تحقیقات کی، لیکن شیخ کی قومیت کے متعلق وہ کوئی قطعی رائے قائم نہ کر سکے اور نہ اُنہوں نے اپنی تصانیف میں کوئی ایسا فیصلہ کن واقعہ بیان کیا جو اس قضیے کا فیصلہ کرتا۔ لیکن زبانی گفتگو کے دوران میں

۵۲۔ دیکھیے ضمیمہ جات۔ ۵۶۔ دیکھیے ضمیمہ جات۔

انھوں نے ضرور مجھ سے یہ کہا کہ اُن کا موجدان اسی طرف ہو کہ شیخ افغانی نہ تھے بلکہ ایرانی تھے۔ مگر یہ کہہ کر انھوں نے اپنی اس گفتگو کو ”واللہ اعلم بالصواب“ پر ختم کر دیا!

جدید سیایاتِ مشرق کے متعلق وسیع معلومات رکھنے والا ایک مشہور صاحبِ قلم (Hans Kohn) ہینس کوہن بھی اپنی کتاب ”ہسٹری آف نیشنل ازم ان دی ایٹ“ میں شیخ کی قومیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ :-
 ”جمال الدین کی ولادت، اصل اور ابتدائی زندگی کے متعلق ہماری معلومات بہت ہی کم ہے۔ تاہم وہ خود کہا کرتے تھے کہ وہ سلسلہ میں افغانستان میں پیدا ہوئے اور انھوں نے بخارا میں تعلیم حاصل کی“

ایک اور یورپین مستشرق (Louis Massignon) نے ۱۹۱۰ء میں (Reveu du Monde Mussulman) کی بارہویں جلد میں جمال الدین کے حالات لکھتے ہوئے اپنی رائے ظاہر کی ہے کہ :-

جمال الدین میں ہم ایک خالص ایرانی تہذیب کا نمونہ دیکھتے ہیں۔ دوسرے افغانیوں کی طرح وہ تھے تو سنائی مگر مزاج اور تہذیب کے اعتبار سے وہ ایرانی تھے وہ سادات میں سے تھے اور اُن کا سلسلہ نسب مشہور محدث ترمذی سے ملتا تھا۔ اُن کا خاندان ایک ہزار برس سے زیادہ ایران میں آباد رہا تھا جمال الدین کی تربیت اور تہذیب حد درجہ ایرانی تھی۔ لیکن یورپین مستشرقین - بہ استثنائے براؤن - شیخ کے حالات میں بعض ایسے مغالطوں کا شکار ہوئے ہیں کہ اُن کے بیانات پر اعتبار کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً ان ہی (Louis Massignon) نے شیخ کے ایران سے نکالے جانے کا ذکر کرتے ہوئے ایک عجیب بات لکھ دی ہے کہ جمال الدین کو

شاہزادہ عبدالعظیم نے ایران سے نکالا اور رضا کرماتی درہل "شاہزادہ عبدالعظیم" ہی کو قتل کرنا چاہتا تھا مگر اُس نے قتل کر دیا ناصر الدین شاہ کو! موافقت کو مغالطہ یہ ہوا کہ درگاہ شاہ عبدالعظیم کو جہاں شیخ پناہ گزیں تھے اُس نے شاہزادہ عبدالعظیم بنا دیا! شیخ کے اخراج کے سلسلے میں اس نام کے کسی شاہزادے کا وجود ہی نہیں مگر درگاہ کو شاہزادہ سمجھ لینا اس امر کی دلیل ہے کہ مشرق کے سایل پر پوربین صاحبانِ قلم کچھ اس طرح قلم برداشت لکھتے ہیں کہ واقعات کی تحقیق ہل ذرایع سے نہیں کرتے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ درگاہ شاہ عبدالعظیم شاہزادہ عبدالعظیم بن جاتی ہے! :-

ایران کے مشہور صاحبانِ قلم اور وطن پرستوں میں آقائے نقی زادہ نے جو شیخ کی زندگی سے بہت کچھ واقفیت حاصل کر چکے ہیں، اخبار کا وہ (شمارہ ۳ و ۹) میں ایک مفصل مضمون لکھا تھا لیکن وہ بھی اس خاص امر کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ نہ کر سکے۔ چنانچہ خود لطف اللہ خاں اُن کے مضمون کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"زندگانی سید راتنا یک درجہ روشن ساختہ است ولے باز اظہارِ تردید در ایرانی بودن سید خود داری نفرمودہ و در آخر مقالہ نوشتہ اند کہ ایرانی بودن سید قریب بہ یقین بودہ است"

آخری دلیل شیخ کے افغانی ہونے پر مفتی عبدہ کا بیان ہے۔ مفتی عبدہ شیخ کے ارشد تلامذہ تھے اور ان کے وفادار دوست رازدار اور شریکِ کار تھے۔ مفتی موصوف نے بار بار اس امر کا اعادہ کیا ہے کہ شیخ افغانی تھے۔ بلنٹ اور مفتی عبدہ یہ دو شیخ کے سب سے زیادہ معتبر احباب تھے اور ان دونوں کی شہادتیں یقیناً قولِ فیصل ہیں۔ لیکن قطع نظر ان بیانات کے جیسا کہ شروع

میں عرض کیا جا چکا ہے، فریقین کے درمیان اس قضیے کا بہتر فیصلہ خود شیخ ہی کے ایسے بیانات سے کیا جاسکتا ہے جن کی صحت ناقابل انکار ہو اور یہی فیصلہ قطعی فیصلہ ہو سکتا ہے۔

۱۔ شیخ کے خاص اور گہرے دوست بلنٹ کا ایک قلمی روزنامہ میری نظر سے گزرا جو اب ان کی بہن مس ڈوروتھی کارلٹن Dorothy Carlton کے پاس موجود ہے، وہ ۱۹۲۳ء میں لندن کے قریب South water ساؤتھ واٹر میں بلنٹ کے آبائی مکان میں رہتی تھیں۔ اس روزنامہ میں لکھا ہے کہ جب بلنٹ نے شیخ سے اس باب میں سوال کیا تو شیخ نے فرمایا کہ اُن کے خاندان کے مورث اعلیٰ سید علی ترمذی (مؤلف صحیح ترمذی) تھے جن کو ۶۰۰ سو برس پہلے امیر تیمور ترمود (ترکستان) سے افغانستان لائے تھے۔

۲۔ بلنٹ نے اپنی کتاب ”تاریخ قبضہ مصر“

میں جابجا شیخ کے

بیانات درج کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ ہمیشہ بلا تکلف اپنے افغانی ہونے کا اعلان کیا کرتے رہتے تھے۔

۳۔ اسی طرح اپنی کتاب ”ہندوستان بہ عہدِ رپن“

میں بھی بلنٹ شیخ کے حوالہ سے اُن کے افغانی ہونے کی تصدیق کرتا ہے۔

۴۔ خود شیخ نے اپنی تاریخ افغانستان میں اپنے خاندان سادات کا ذکر کیا ہے گو کہ اپنے ذاتی حالات کچھ نہیں لکھے۔

۵۔ برہان الدین قلیج خاں نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ جریدہ ”ملت“

قسطنطنیہ کی اشاعت (مورخہ ماہ تشرین ثانی ۱۳۲۶ھ ہجری - ۱۹۰۶ء) میں خود شیخ کا ایک قول نقل کیا ہے۔ برہان الدین شیخ کے خاص تلامذہ میں سے

تھے اور کوئی وجہ نہیں کہ اُن کے بیان کو غلط یا مبالغہ آمیز سمجھا جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ :-

چوں روز ہا می شنوم کہ حضرت استاد را بعض ہا ایرانی می پندارند، بنا بریں یک محاورہ را کہ دریں خصوص حضرت استاد م با من کردہ اند عیناً می نویسم۔
 (من از سادات معروف کسر بودہ در سال ۱۲۵۴ ہجری در افغانستان تولد شدم۔ شیخ جمال الدین کہ از روسائے بانی و از اہلای ایران می باشد بہ ہر جائے کہ من رفتہ ام اہم محقق بہ آں جا رفتہ است۔ ازین سبب ایرانی ہا دانستہ یا نادانستہ مرا شیخ جمال الدین ایرانی می پندارند۔ ایں ظن فاسد مردود و سزا پاختا آلود و دروغ مطلق است۔ اگر مرا خود من خوب ترمی شناسم اینک خود من می گویم کہ من اصلاً ایرانی نیستم و افغان می باشم۔ تمام افغانی ہا مرا می شناسند و تصدیق من می کنند“
 ۶۔ ”سہیت علیہ“ استنبول نے جس کے صدر ابراہیم علاء الدین بک تھے، ”جریدۃ مصوّرہ“ میں شیخ کے حالات شایع کیے تھے۔ یہ کتاب ۱۲۵۷ھ میں مطبع ثبات استانبول سے شایع ہوئی ہے۔ اس میں بھی شیخ کی زبان سے اس قضیے میں یہی فیصلہ ہوا ہے کہ -

”بیچ احتیاج بہ ایں ندارم کہ خود را بہ یک ملتے نسبت دہم۔ من افغان می باشم“

جمال الدین بانی کے متعلق شیخ کا اشارہ بہت معنی خیز ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جمال الدین بانی اُن اطراف میں بہت عرصہ تک کام کرتے رہے جہاں شیخ مصروف کار تھے اور ناممکن نہیں ہے کہ اس زمانے کے وقایع نگاروں نے ان دو ناموں کو مخلوط کر کے یہ تکلیف دہ مغالطہ پیدا کر دیا ہو۔

علاوہ واقعات کے ایک دوسری طرح سے بھی خود شیخ نے اس تفسیر کا فیصلہ کر دیا ہے۔ انھوں نے یہ کہہ کر کہ ”ہیچ احتیاج بہ ایں نہ دارم کہ خود را بہ یک ملتے نسبت دہم“ گویا اپنی زندگی کا ایک بہترین خلاصہ بیان کر دیا اور اسی پر ساری بحث ختم ہو۔ جمال الدین جیسا مجاہد بزرگ اور مجدد اعظم آباو اجداد کی فضیلت اور بلند مقامی کا محتاج ہی کب تھا۔ اس کے نسب کا حال کچھ بھی معلوم نہ ہوتا تب بھی ہماری یہ لاعلمی کیا اس کی عظمت کو ایک ذرہ کم کر دیتی؟ نسل و خاندان کی نسبتیں ایسے لوگوں کے لیے جن کی روحانی عظمت اور عالمانہ تجربہ اور سیاسی تدبیر ناقابل انکار ہو محض بے معنی ہوتی ہیں۔ اس لیے درحقیقت یہ ساری بحث شیخ کی سیرت کا کوئی اہم اور ضروری جزو نہیں شیخ اسلامی حریت و عصیت کے علمبردار بن کر ایک ایسا کھلا ہوا پیام ساری دنیائے اسلام کے لیے لائے تھے جو جغرافیہ حدود کا پابند نہ تھا نہ خود پیامبر کی عظمت جغرافیہ امتیازات کی پابند ہو سکتی تھی۔ وہ افغانی تھے محض اس لیے نہیں کہ افغانی خون اُن کی رگوں میں متحرک تھا بلکہ اس لیے کہ اُنھوں نے افغانیوں کو بھی عالمگیر اسلامی اتحاد کی زنجیروں میں باندھ لیا۔ وہ ایرانی بھی تھے اس لیے کہ انھوں نے سب سے پہلے حریت کی وہ شمع فروزاں ایران میں روشن کی جس نے ایرانی دلوں کے آتش خانوں کو ایک دفعہ پھر گرم کر دیا۔ وہ ترک بھی تھے اس لیے کہ استبداد کے خلاف انھوں نے ملت عثمانی کو آزادی و عزت کا راستہ بتایا۔ وہ مصری بھی تھے اس لیے کہ انھوں نے مصریوں کی ٹھنڈی راکھ میں چنگاریاں پیدا کر دیں۔ وہ ہندی تھے، روسی تھے، عراقی تھے، شامی تھے، سب کچھ تھے۔ وہ اگر شیعہ تھے تب بھی جلیل القدر تھے اور سنی تھے تب بھی اُن کا منصب

بہت بلند اور ارفع تھا۔

ابر جب آسمان پر گھر کر آتا ہے اور ہر طرف برتا ہوا گزرتا ہے تو کوئی ایک قریہ یا ایک شہر یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہ بارانِ رحمت صرف ہمارے ہی لیے ہے اور یہ بادل صرف ہمارے ہی ہیں — بلا شرکتِ غیرے — وہ ابر آسمان کی وسعت پر اس طرح برتا ہوا جاتا ہے کہ ہر قصبہ اور شہر اور صحرا اور ویرانہ اُس سے اپنا حصہ پاتا ہے۔ سورج مشرق سے طلوع ہوتا ہے مگر کیا وہ صرف مشرقیوں ہی کا حصہ ہے؟۔ وہ مغرب میں غروب ہوتا ہے مگر کیا وہ مغربیوں ہی کا حصہ ہے؟ جب اس کی پُر نور شعاعیں مشرق اور مغرب کے دامنوں میں یکساں جگہ پائیں تو کس کی مجال ہے کہ وہ خورشیدِ عالمیاب کو محض اپنے ہی لیے مخصوص سمجھے!۔ حقیقت یہ ہے کہ جمال الدین کی شخصی اور انفرادی حیثیت خود اُن کے ”پیام“ میں محو ہو گئی تھی — اس طرح کہ دو چیزیں ایک دوسرے سے جدا نہ رہی تھیں۔ جہاں جمال الدین تھے وہاں اُن کا پیام تھا — آج تقریباً نصف صدی بعد جہاں اُن کا پیام ہے وہاں وہ بھی موجود ہیں۔ اُن کی زندگی کی داستان دنیا کے ہر گوشہ میں بکھری ہوئی ہے۔

اُڑائے کچھ درق لائے نے کچھ بلبُل نے کچھ گل نے

چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستانِ میری

شیخ کی زندگی کی یہی ایک بڑی خصوصیت ہے جس نے اُن کو داعیانِ حق کی صف میں ممتاز کر دیا ہے۔ ہر داعی عموماً اپنے ملک اور اپنی قوم کے لیے ایک پیام لاتا ہے اور اُس قوم اور ملک کی تاریخ میں اُس کا نام آپ زمر سے لکھا جاتا ہے لیکن جمال الدین کا نام بہت سے اسلامی اور غیر اسلامی

مالک میں اپنی جگہ بنا چکا ہے۔ اس عجیب و غریب زندگی کی داستان کہاں کہاں سے چنی اور سمیٹی گئی ہے۔ افغانستان، ہندوستان، مصر، فرانس، انگلستان، ایران، ترکی، روس، بخارا، عراق، حجاز ہر جگہ وہی ایک نقش قدم ہے۔ جو سجدہ صاحبِ نظر ان کا منتظر ہے!

دور دراز کنز میں پیدا ہو کر قوم افغان کا یہ فرزندِ جلیل استنبول کی خاک میں محوِ خوابِ ابد ہے۔ اُس نے اسلامی دنیا کے مشرق و مغرب کا دامن ایک دوسرے سے باندھ دیا اور ایسی گرہ لگادی ہے جس میں آنے والی صدیوں کے پُر شکوہ امکانات کی ایک دنیا محفوظ ہے۔

ایک سوانح نگار کے لیے وطنیت اور قومیت کی ضمنی بحث میں اُلجھ کر رہ جانا ایسا ہے کہ جیسے کوئی شخص ایک سر بہ فلک پہاڑ پر چڑھنے کا تہیہ کر کے اُٹھے اور پھر دامنِ کوہ میں ایک ہی سنگریزے کو لے کر بیٹھ رہے!

—————•—————

دَوْرِ اَوَّل

عہد انتظار

دنیاۓ اسلام پر مصائب اور ابتلا کے بادل جھوم رہے تھے۔ اور ہر طرف مغرب مشرق پر چھایا ہوا تھا۔ افنی مشرق پر کچھ برے ہوئے بادل تھے جن کی بجلیاں فنا ہو چکی تھیں۔ ہر طرف ایک عالم انتشار تھا۔ اس زمانے میں دنیا کے سب سے کم ترقی یافتہ اور سب سے زیادہ پسماندہ ملک افغانستان میں اتحاد اسلام کا داعی جمال الدین پیدا ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ایک طرف ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت حکومت کی شکل اختیار کر چکی تھی اور دوسری طرف وسط ایشیا میں خیوا اور بخارا کی آزادی روسی شہنشاہیت کی قربان گاہ پر آخری سانس لے رہی تھی۔ مصر میں سلطان ترکی کی سیادت اور خدیو کے اقتدار کا خاتمہ ہو چلا تھا ایران میں یورپین دول اپنا اپنا حصہ بانٹ رہی تھیں۔ ترکی مریض ناتواں اب بیماری کے آخری درجے میں موت کا مقابلہ کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا اور یورپ کے دشمنہ درآستین اطباء مریض کے سرہانے بیٹھے ہوئے اس کی آخری ہچکی کا انتظار کر رہے تھے۔

اس عہدِ ابتلا میں جب ہمتیں پست دل ضعیف اور حوصلے کمزور ہو چکے

تھے عالم اسلام کی ہمہ گیر تاریکی کے اندر کبھی کبھی اور کہیں کہیں ظلمت کے پردوں میں روشنی کی ایک شعاع چمک جاتی تھی اور چمک کر غائب ہو جاتی تھی۔ مختلف اسلامی ممالک میں کچھ اللہ کے بندے موت کی سختی سے گھبرا کھبرا کر اٹھتے تھے، چند قدم چلتے تھے، کچھ کہتے تھے، اور پھر گر جاتے تھے!۔ امید کا چراغ کم و بیش سو برس تک ٹوٹے ہوئے قدیم طاقتوں میں ٹٹماتے رہنے کے بعد اگر گل نہ بھی ہوا تھا تو گل ہوا ہی چاہتا تھا! سونے والوں میں سے کبھی کوئی "بار بستر" ایک دد کروٹیں لیتا تھا اور پھر فنا کی نیند میں غافل ہو جاتا تھا۔ دلوں کے آتش خانے سرد پڑے تھے۔ اگر کوئی چنگاری باقی تھی تو وہ بھی راکھ کے ڈھیر کے اندر دبی ہوئی تھی!۔

مگر موت ہی کے دامن سے حیات بندھی ہوئی ہے۔ چنانچہ قبا کی شدت اور سخت گیری داعیان حق کی روحوں کو بیدار کر رہی تھی اور اکثر اسلامی ممالک میں موت کی گھنٹی کے ساتھ ہی ساتھ زندگی کا نفاذ بھی بچ رہا تھا۔ قسطنطنیہ میں ابوالاحرار مدحت پاشا اور ان کے معاصرین مصطفیٰ پاشا، رشید پاشا، ضیا پاشا، علی ساری، فواد پاشا، عمر پاشا، نامق کمال بے اور کتنے ہی ایسے قوم پرست، ایران میں آنے والے عہد انقلاب کے حریت پرست علما اور مجتہدین :- سید عبد اللہ، سید محمد طباطبائی، حاجی مرزا حسن شیرازی، حجة الاسلام شیخ ہادی نجم آبادی، مصر میں مصطفیٰ کامل اور ان کے شرکائے کار، ٹیونس میں خیسر الدین پاشا الجیریا میں امیر عبد القادر، وسط ایشیا اور ترکستان میں شیخ محمد بیرم وغیرہ نجد میں محمد بن عبد الوہاب، طرابلس میں امام محمد بن سنوسیؒ۔ یہ ایک سلسلہ تھا

- | | | | |
|------------------|------------------|------------------|------------------|
| ۵۹۔ دیکھیہ ضمیمہ | ۶۰۔ دیکھیہ ضمیمہ | ۶۱۔ دیکھیہ ضمیمہ | ۶۲۔ دیکھیہ ضمیمہ |
| ۶۳۔ دیکھیہ ضمیمہ | ۶۴۔ دیکھیہ ضمیمہ | ۶۵۔ دیکھیہ ضمیمہ | ۶۶۔ دیکھیہ ضمیمہ |

داعیانِ حریتِ اسلامی کا جو باوجود ناموافق حالات کے دنیائے اسلام میں پھینکا جاتا تھا۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی جمال الدین افغانی تھے۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے وہ ان تمام مردانِ میدان میں اپنی ایک مخصوص شانِ امتیاز رکھتے تھے۔ حریت اور آزادی کی راہ میں یہ جتنے راہ رو تھے ان میں سے ہر ایک کسی ایک ہی ملک یا ایک ہی جغرافیہ کے اندر اپنا کام کر رہا تھا۔ مصطفیٰ کامل نے جو کچھ جدوجہد کی وہ مصری قوم کے نقطہ نظر سے، مدحت پاشانے جو قربانیاں گوارہ کیں وہ صرف ملتِ عثمانی کی خاطر، عبدالوہاب کی تحریک نجد میں مرکوز رہی، سنوسی کا جولا نگاہ طرابلس رہا، ان سب کا پیام ایک تھا لیکن ان میں سے اکثر کا دائرہ عمل محدود تھا۔ لیکن جمال الدین تمام جغرافیہ حدود سے آزاد ہو کر اسلامی ممالک کی فضا میں پھیل گیا اس نے متفرق تحریکات کو ایک ہی مرکز پر متحد کر دینے کی کوشش کی، وہ ایک شعلہ کی طرح بھڑکتا ہوا افغانستان سے اٹھا تو مصر، ایران، ترکی، ہندوستان، عراق، مراکش، بخارا اور ترکستان تک آگ اور نور برساتا ہوا گزر گیا۔ فی الحقیقت دنیائے اسلام کے عہدِ جدید کی تاریخ میں کوئی نام اس قدر ہمہ گیر اور وسیع اور اس قدر گوش آشنا نہیں مل سکتا۔ مراکش سے ترکستان اور لندن و پیرس سے پیٹروگراد تک جمال الدین کی آواز اس طرح سُنی گئی جس طرح کبھی پہلے گزشتہ چند صدیوں میں تنہا کسی ایک شخص کی نہ سُنی گئی تھی۔ شیخ کا یہ شخصی امتیاز جو ان کی روحانی عظمت کا ایک عکس تھا، ناقابلِ انکار ہے۔

افغانستان میں شیخ کی ابتدائی زندگی ایک عہدِ انتظار تھا جب وہ اپنے وطن کے فتنوں میں اپنی زندگی کے وسیع تر میدانوں کے لیے فکر و نظر کا سرمایہ حاصل کر رہے تھے۔ انیسویں صدی عیسوی کے نصفِ اول میں افغانستان خانہ جنگی

اور طوائف الملوکی کا شکار تھا، نہ کوئی مستقل حکومت قائم تھی نہ ہو سکتی تھی۔ افغان قوم کی قومی زندگی کا کوئی نظم قائم نہ تھا۔ حقیقت کوئی قومی زندگی ہی نہ تھی۔ سرزمینِ افغانہ امن و امان کے نام سے نا آشنا تھی۔ ۱۲۵۰ھ ہجری (۱۸۳۶ء) میں ہرات پر ایرانیوں نے حملہ کیا اور کامران کو سخت شکست اٹھانی پڑی لیکن بعد کو انگریزوں کی امداد سے وہ سنبھل گیا۔ برطانوی پالیسی اس وقت افغانستان میں مستقل مداخلت کا فیصلہ کر چکی تھی اسی لیے شاہ شجاع کو دوست محمد خاں پر حملہ کرنے کی ترغیب دی گئی۔ چنانچہ شجاع نے دوست محمد خاں کو شکست دے کر ملک کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا اور دوست محمد خاں انگریزی حکومت کے قیدی بنا کر ہندوستان لائے گئے۔ تقریباً ہی زمانہ شیخ کی پیدائش کا زمانہ تھا۔ انگریزی اقتدار افغانستان میں قدم جما چکا تھا اور انگریزی سیاست کے ہرے افغانستان کی بساط پر لڑائے جا رہے تھے۔ یہ ظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ افغانستان کی آزادی ختم ہو گئی اور جس طرح روس نے وسطِ ایشیا میں اپنا اقتدار قائم کر لیا تھا اُسی طرح برطانوی سیادت افغانستان میں قائم ہو جائے گی لیکن قدرت پر دوں کے پیچھے اپنا کھیل کھیل رہی تھی اور نظروں سے پوشیدہ اس کا ایک جلیل القدر ہرہ اسی بساط کے ایک گوشے میں تیار ہو رہا تھا۔ انگریزوں کو اس وقت کچھ خبر نہ تھی کہ اس ملک میں اُن کی فوجوں کا بڑا و تین سال بھی قائم اور باقی نہ رہ سکے گا۔ اور ایک نیا طوفان آئے گا جس کی ابتدا چند افغان ڈاکوؤں اور لیڈروں سے ہوگی۔

جب انگریز اپنے قبضے کی بنیادیں مضبوط کرنے میں مشغول تھے تو دفعتاً غلزی قبیلے کے اندر شورش پیدا ہوئی اور قبائل کی ایک معقول تعداد

اس شورش میں شامل ہو گئی۔ غلزی خواتین نے کابل کے راستے بند کر دیے اور موقع کو مناسب سمجھ کر دوست محمد خاں کے لڑکے محمد اکبر خاں نے اُن سے اتحاد پیدا کر لیا اور صورتِ حالات سے فائدہ اٹھا کر ایک زبردست جمعیت اپنے ساتھ فراہم کر لی، یہاں تک کہ انگریزوں نے محسوس کر لیا کہ اکبر خاں کی بڑھتی ہوئی قوت انگریزی اقتدار کو خطرے میں ڈال رہی ہے۔ چنانچہ اکبر خاں کے استیصال کا تہیہ کر کے حملہ کی تیاریاں شروع کر دی گئیں لیکن غلزی گروہ نے کابل کی شہر نپاہ کے سامنے پہنچ کر شجاع کو محصور کر لیا اور خود شہر کابل کے اندر سخت بغاوت شروع ہو گئی۔ باغیوں نے باغ شاہ اور قلعہ محمد شریف پر قبضہ کر کے انگریزوں پر زندگی کے دروازے بند کر دیے۔ بہت سے انگریز باغیوں کے ہاتھ سے مارے گئے ملکی قبائل اس فتح کے بعد زیادہ تعداد میں غلزیوں کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے لگے اور شجاع معہ انگریزوں کے ہر طرف سے گھر گیا۔ اب صلح کی تحریک شروع ہوئی بالآخر اس قول و اقرار کے ساتھ کہ افغانستان میں کسی جگہ کوئی انگریز قیام نہ کرنے پائے گا اور امیر دوست محمد خاں آزاد کیے جائیں گے انگریزی فوج کو افغانستان سے واپس جانے کی اجازت دی گئی۔ ساتھ ہی انگریزوں سے وعدہ لیا گیا کہ وہ بطور تاوان ۱۴ لاکھ روپیہ ادا کریں گے نیز چند انگریز بطور ضمانت افغانستان میں مقید رکھے گئے۔ اس معاہدے کے بعد انگریزی فوج کی واپسی شروع ہوئی۔ انگریزی فوج کا یہ وہ خوفناک سفر تھا جس کے دردناک واقعات تاریخ کے صفحات پر خون اور آنسوؤں سے لکھے گئے ہیں۔ انگریزوں کی اس فوج میں سے جو کابل سے ہندوستان کی طرف واپس ہوئی صرف ایک نفر واحد ڈاکٹر برائیڈ

زندہ بچ کر افغانستان کی سرزمین سے باہر نکل سکا تھا۔ اس طرح ۱۸۴۲ء میں آخری دفعہ انگریزی فوج افغانستان سے واپس ہوئی اور اس واقعہ کے بعد سے افغانستان کے متعلق برطانوی حکمت عملی کا رخ ہی بدل گیا۔ ابھی یہ معرکہ نہ ہوا تھا کہ ایک بار کمرئی سردار نے شاہ شجاع کو قتل کر ڈالا۔ بقول شیخ جمال الدین۔

”شاہ شجاع کی طبع حکومت اس کی موت کا باعث ہوئی اور انگریزوں کی اس طبع نے کہ افغانستان پر انگریزی قبضہ قائم ہو جائے اُن کی قبریں بھی وہیں بنادیں“ نمبر ۳،

اس طرح امیر دوست محمد خاں قیدِ فرنگ سے آزاد ہو کر پھر افغانستان واپس آئے۔ اُس زمانے کے ان واقعات میں ایک تاریخی توار اور لطیفہ غیبی قابلِ ذکر ہے۔ شاہ شجاع کے عہد کا وہ انقلاب جو وحشی اور جرائم پیشہ قبائل کی بغاوت سے شروع ہوا تھا بالکل ایسا ہی تھا جیسا کہ اختتامِ دورِ امان اللہ خاں کا واقعہ۔ ۱۸۴۳ء میں غلزی قبیلہ بھی اسی طرح کابل کے نواح میں لوٹ مار کے لیے اُٹھا تھا جس طرح قدرت نے بچہ سقہ کی حقیر شخصیت کو یکا یک اپنا آلہ کار بنالیا، اور اس ادنیٰ لٹیرے کے ذریعے امان اللہ خاں کی حکومت کا شیرازہ درہم برہم کرا دیا۔ جس طرح کج سے ۵۰ برس پہلے امیر دوست محمد خاں کے لیے استقلال اور استقبال کا راستہ صاف ہوا تھا اسی طرح ۱۸۲۹ء میں شاہ نادر خاں غازی کے لیے حکیم مطلق نے کار سازی فرمائی۔ دونوں انقلابوں کے واقعات اور نتائج بہت ہی ملتے جلتے ہیں اور جس طرح ۱۸۴۲ء کا انقلاب افغانی قوم کی زندگی کا ایک نشانِ منزل تھا اسی طرح

۱۸۴۵ء۔ اذنتہ البیان فی تاریخ افغانستان“ مؤلفہ سید جمال الدین افغانی مطبوعہ مصر ۱۹۰۷ء

۱۸ سال بعد ۱۲۹۰ء کے ہنگامے نے بھی تاریخ افغانستان کا ایک نیا درق لوٹ دیا۔ کون کہہ سکتا ہو کہ یہ محض انسان کی تدبیر کی جیت ہو یا قدرت کا کھیل ! امیر دوست محمد خاں اپنی واپسی کے بعد جب ملک کے مختلف حصوں میں خانہ جنگی اور بد امنی کا انداد کر رہے تھے اُس وقت ان کو سید صفدر کی سیاسی دلچسپیوں کے متعلق کچھ شبہات پیدا ہوئے۔ یعنی اُن کو یہ اطلاعیں ملیں کہ سید صفدر اُن کے بعض مخالفین سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ چنانچہ اِس شبہ کی بنا پر امیر نے سید صفدر کو معہ اہل و عیال کابل بلا لیا اور اُن کی جائیداد اور املاک کو بحقی حکومت ضبط کر کے ان کا گزارہ مقرر کر دیا۔ یہ واقعہ غالباً ۱۲۹۰-۱۲۹۱ء کا ہو۔

جب سید صفدر اس طرح کابل میں رہنے پر مجبور کیے گئے۔ تو شیخ کی عمر اس وقت آٹھ سال کی تھی۔ چنانچہ شیخ کی ابتدائی تعلیم زیادہ تر کابل ہی میں ہوئی۔ مؤلف ”جمال الدین“ (مطبوعہ مطبع ثبات استانبول) لکھتا ہو کہ ”معلمین ادا از جملہ علمائے متبحر افغانستان شمار می رفتند کہ از جملہ آل یکے ماہر ابن علی نام یک ذات با علم و فضل بودند“

تقریباً تمام وقائع نگار سوائے صاحب بیداری ایران اور مرزا لطف اللہ خاں کے اس حقیقت پر متفق ہیں کہ ۱۸ سال کی عمر تک شیخ کا قیام کابل ہی میں رہا جہاں خود ممدوح کے والد ماجد اور دیگر علماء و فضلاء نے اس داعی حق کے دماغ کو زیور علم سے آراستہ کیا۔ چنانچہ دس سال کے قلیل عرصے میں شیخ نے نحو، بلاغت، تاریخ، فلسفہ، تصوف، طبعیات، مابعد الطبعیات، ریاضی، ہیئت، طب، تشریح الما بدن، مہندسہ، کلام، یعنی جملہ شعبہ۔ انوس ہو کہ باوجود تلاش و جستجو کے ان صاحب کے کچھ حالات معلوم نہ ہو سکے۔

علوم رائج الوقت حاصل کر کے اور علم کی اس دولت سے مالا مال ہو کر اپنی عمر کے اُس دور کو شروع کیا جس کے ساتھ کار سازِ قدرت نے عالمِ اسلامی کے آنے والے انقلاب کا دامن باندھ دیا تھا۔ لیکن صاحب ”بیداری ایران“ اور لطف اللہ خاں کے بیانات ان شہادتوں کے بالکل خلاف ہیں جن سے مندرجہ بالا حالات اخذ کیے گئے ہیں۔ ان اختلافی بیانات پر بھی ایک نظر کرنا ضروری ہے۔

مرزا لطف اللہ خاں کہتے ہیں کہ شیخ ۱۲۶۴ھ ہجری میں قزوین بغرض تعلیم بھیجے گئے اور وہاں دو سال مقیم رہے۔ لطف اللہ خاں سید صفدر کے کابل آنے اور وہاں مقیم رہنے کا کوئی ذکر نہیں کرتے بلکہ یہ بیان کرتے ہیں کہ قزوین میں دو سال قیام کے بعد جب شیخ کی عمر ۱۱ سال کی ہوئی تو اُن کے والد اُن کو طہران لے گئے۔ طہران میں شیخ کی تعلیم کا حال یوں لکھتے ہیں کہ وہ وہاں سلمان خاں حاکم اسد آباد کے مکان پر مقیم ہوئے اور آقا سید صادق کے درس میں جانے لگے جو اُس زمانے کے مشہور علما میں سے تھے اُنھوں نے شیخ کی ذہانت کی بہت قدر کی۔ وہاں سے شیخ اپنے والد کے ساتھ عباتِ عالیات گئے اور وہاں وہ شیخ مرتضیٰ عالم و مجتہد کے پاس مقیم ہوئے۔ چار سال تک وہ وہاں حصولِ علم میں مشغول رہے اور آخر کار ممولہ سال کی عمر میں (۱۲۸۳ھ ہجری ۱۸۸۳ء) وہ پہلی دفعہ ممبئی آئے۔ ممبئی آتے ہوئے وہ بوشہر میں حاج عبدالنبی کے پاس ٹھہرے۔ ہندوستان آنے کے بعد۔

ایک سال و چند ماہ در آں جا اقامت داشتہ و علوم ادو پائی و ریاضی وغیرہ را فرمای گیرد و ماہے چند در کلکتہ منزل حاجی عبد الکَریم بودہ پس ازاں سفر کرمظہ می نماید۔

بقول مرزا لطف اللہ خاں شیخ ۱۲۴۴ھ ہجری (۱۸۵۷ء) کے قریب مکہ معظمہ پہنچے، وہاں سے نجف و کربلا گئے پھر ۱۲۴۷ھ ہجری (۱۸۶۱ء) میں چار دن کے لیے اسد آباد آئے اس کے بعد چند ماہ طہران میں رہے۔ پھر خراسان کی طرف روانہ ہوئے۔

”طائفہ از ترکمان ہا بسر زوآر و قافلہ ریختہ زوآر را غارت و برہنہ می کنند۔ بعد از ملاقات سید بہ آں ہا حالتی پیدا می شود کہ آں ہا دست و پاد را بوسیدہ با کمال عذر تمام اموال و ائصال منہوبہ را بہ زوآر مستروی دارند۔“
امام رضا کی زیارت کے بعد کابل آتے ہیں اور
”با امیر کابل مصاحب و ندیم می شوند و بعد ازاں بمخدمت امیر دوست محمد خاں می روند۔“

تقریباً پانچ سال کابل میں مقیم رہتے ہیں اور اُسی زمانے میں ”تاریخ افغانستان“ عربی میں لکھتے ہیں۔ یہاں تک مرزا لطف اللہ کا اختلافی بیان ہے جس کو ہم مستند نہیں مانتے۔

شیخ کی ابتدائی زندگی کے متعلق دوسرا بیان جو عام شہادتوں سے مختلف ہے، صاحب ”بیداری ایران“ کا بیان ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ سید صفدر کچھ پڑھے لکھے آدمی نہ تھے۔ جمال الدین نے البتہ کچھ دنوں مقامی مدرسے میں تعلیم پائی اور آٹھ سال کی عمر میں فارسی زبان میں کچھ لکھ پڑھ سکتے تھے۔ تھوڑی سی ترکی زبان بھی جانتے تھے۔ پھر وہ

”دس برس کی عمر میں اپنے باپ کے پاس سے بھاگ گئے اور ہمدان و

۱۲۴۷ھ شرح حال و آثار سید جمال الدین اسد آبادی مولفہ مرزا لطف اللہ خاں

۱۲۴۷ھ شرح حال و آثار سید جمال الدین اسد آبادی مولفہ مرزا لطف اللہ خاں

اصفہان و مشهد ہوتے ہوئے افغانستان آئے جہاں کہ انگریزی سیکھی مگر وہ اپنی ایرانی قومیت کو قبول نہ کرتے تھے۔

اس موقع پر یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ خود دو بڑے ایرانی وقایع نگاروں میں بھی شیخ کی ابتدائی زندگی کے متعلق اس قدر اختلاف موجود ہے اور ان دونوں کی بیان کی ہوئی تفصیلات اس درجہ مختلف ہیں کہ تاریخی حیثیت سے دونوں میں سے کسی پر بھی اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ پروفیسر براؤن نے بیداری ایران کے حوالے سے اس بیان کو نقل تو کیا ہے لیکن اس کی تصدیق یا تائید نہیں کی۔ دوسری تمام شہادتیں جو شیخ کی ابتدائی زندگی کے متعلق حیا ہو سکیں سب اس بیان کے خلاف ہیں۔ ان کا کوئی سوانح نگار آج تک ابتدائی عمر میں ان کے سفر ایران کا کوئی پتہ نہیں چلا سکا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ مرزا لطف اللہ خاں اور صاحب ”بیداری ایران“ کا مرکز خیال صرف شیخ کی قومیت کا سوال ہے۔ ہر پھر کر اور گھوم گھام کر موقع اور بے موقعہ دونوں بزرگ اس بحث کو بار بار اٹھاتے ہیں اور اپنی رائے کی تائید میں ہر طرف سے شہادتیں جمع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے بیانات میں ربط و یاس زیادہ اور حقائق کی مقدار بہت کم ہو جاتی ہے۔

صرف ایک بیان اور ہم کو ایسا ملتا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی عمر میں شیخ نے ایران کا سفر کیا تھا۔ وہ بیان اعظمی کا ہے جو ”مجلہ کابل“ میں شائع ہوا ہے۔ آئندہ صفحات میں اس بیان کو بھی نقل کیا گیا ہے لیکن اس سے بھی یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ شیخ دس برس کی عمر میں اپنے باپ کے پاس سے بھاگ کر ہمدان و اصفہان گئے تھے، بلکہ اس بیان کے مطابق شیخ نے

یہ سفر ۱۰۶۰ھ میں کیا تھا جب یقیناً شیخ جوان ہوں گے : جہاں تک ابتدائی عمر میں شیخ کے ایران میں رہ کر تعلیم حاصل کرنے کا سوال ہو، ہم مرزا لطف اللہ خاں اور صاحب تاریخ ”بیداری ایران“ کو نظر انداز کرنے پر اس لیے مجبور ہیں کہ دوسرے کسی بیان سے اُن کی تصدیق نہیں ہوتی اور خود یہ دونوں راوی اس قدر ضعیف ثابت ہو چکے ہیں کہ تنہا ان کے بیان پر اعتماد کرنا اصولاً نامناسب ہو۔ بہر حال ہم اپنے بیانات کو ہر باب میں مصدقہ روایات کی کثرت پر مبنی کرتے ہیں اور سلسلہ بیان اس طرح جاری رہتا ہے کہ :-

۱۰۵۵-۵۶ھ میں جب امیر دوست محمد خاں قندھار کی طرف سفر کر رہے تھے اُنھوں نے سید صفدر کی جائیداد واپس کر دی۔ اس طرح شیخ دس سال کابل میں مقیم رہ کر پھر اپنے والد ماجد کے ساتھ وطن واپس آئے۔ چند روز بعد (غالباً ۱۰۵۶ھ میں) سید صفدر کا انتقال ہو گیا اس وقت شیخ کی عمر اُنیس سال کے قریب تھی۔ سید صفدر کے انتقال کے بعد ہی شیخ کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا اور ان کا پہلا قدم اُن میدانوں کی طرف اٹھا جن میدانوں میں ان کو اپنی تمام عمر حق و باطل کی صف آرائی میں گزارتی تھی۔

امیر دوست محمد خاں کی مند حکومت کے کونے چاروں ہندوستان و حجاز | طرف کی ہواؤں سے ہر وقت اُڑتے رہتے تھے جمال الدین کی نوجوانی اس سیاسی مدوجزر کا تماشہ دیکھ رہی تھی لیکن ابھی تک وہ ایک ناظر کی حیثیت سے طوفانی سمندر کے ساحل پر کھڑے ہوئے تھے۔ ابھی ان کی کشتی موجوں کے دامن میں نہ گئی تھی۔ عمل کے میدان سے ان کا وجود

دور تھا اور وہ وقت ابھی نہ آیا تھا جب وہ ایک مستقل سیاسی مطمح نظر اور مسلک لے کر بروئے کار آتے اور نہ ابھی ان کا جو ہر پہلی پختہ اور مکمل ہوا تھا۔ دنیا کے ہر بڑے مصلح اور روحانی قاید اور مجدد کو اس عہد انتظار سے گزرنا ہوتا ہے۔ پہاڑوں کی وادیوں میں تاریک جھروں میں غاروں میں صحراؤں میں دیرانوں میں، اُن کو فکر و نظر حاصل کرنے کے لیے ایک قسم کا اعتکاف کرنا پڑتا ہے۔ یہ اُن کی تیاری اور امیدواری کا زمانہ ہوتا ہے۔ وہ زمانہ جب کچا لوہا لپکا بنتا ہے۔

شیخ نے حاکموں اور مدعیانِ حکومت کی شام و صبح اپنے وطن میں خوب دیکھ لی تھی، لیکن ابھی محکوم اقوام کی زندگی کا مطالعہ بھی اُن کو کرنا ضرور تھا۔ وہ حج بیت اللہ کا ارادہ کر کے گھر سے نکلے اور چند روز ہندوستان میں قیام کر کے منزل مقصود کی طرف چلے گئے۔ ہندوستان میں ان کا یہ مطالعہ محض سربراہ تھا۔ اُنھوں نے اس ملک میں کیا دیکھا، کیا سنا، کیا سمجھا، معلوم نہیں کہا جاتا ہے کہ اس وقت ان کی زندگی محض طالبِ علمانہ تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ۱۸۵۶ء میں ابھی لال قلعہ کے اندر دودمان تیموری کا ایک ٹٹھاتا ہوا چراغ باقی تھا۔ مغلوں کے تخت پر تیمور کی یادگار نظر تو آتی تھی لیکن "عالمِ کمپنی بہادر کا" تھا۔ خدا جانے اس وقت شیخ نے محسوس کیا ہو یا نہ کیا ہو مگر وہ ہندوستان سے اس زمانے میں اس طرح گزر رہے تھے کہ جیسے کسی کو ہر آتش فشاں پر!

۱۸۵۷ء کے خونِ ہنگامہ کے لیے سارا مواد تیار تھا اور حکومت اور حکومت کی ایک خونِ منکر ہونے والی تھی تعجب نہیں اگر شیخ نے اس وقت بھی اس آتش فشاں کے کلیجے کی آگ کو محسوس کر لیا ہو اور اسی قسم کے ابتدائی تصورات اور تاثرات اُن کی آئندہ زندگی میں اُن کے لیے چراغِ راہ بنے ہوں۔ کیا تعجب

ہو! افسوس ہو کہ پہلے سفر کی رویداد اس قدر نابود ہو کہ ہم کو یہ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ ہندستان میں شیخ کہاں کہاں گئے اور انھوں نے کن کن مقامات پر قیام کیا کس کس سے ملے اور کیا کیا دیکھا۔ سوائے اس کے کہ۔

"بعضے شہر ہائے مختلف ہند را بطور غیر معروف سیاحت کردہ ضمناً ریاضی جدید و پارہ علوم کہ تازہ بہ آن خاک قدم گزاشته بود، آن را تحصیل کرد و در سال بستم بن شریف خود کہ بہ اواخر ۱۲۶۳ھ ہجری بودہ بہ مقصد تشریف کعبہ معظمہ رہسپار گردید۔"

پروفیسر براؤن کے بیان سے معلوم ہوتا ہو کہ اس دفعہ شیخ ایک سال اور کچھ ماہ ہندستان میں رہے اور اس کے بعد حجاز تشریف لے گئے۔

اگر یہ معلوم ہو سکتا کہ شیخ نے اُس حرم قدس میں اور کعبۃ اللہ کی دیواروں کے سائے میں کیا کیا سعادتیں حاصل کیں، مستقبل کے کیا کیا جلوے دیکھے اور اپنے خالق کی بارگاہ میں اپنے ارادوں کے کیا کیا نفعے بنائے، تو شاید اُن آثار اور نفوش کا کچھ پتہ چل سکتا جنھوں نے شیخ کے قلبِ مطمئن کی تربیت و تہذیب کی ہوگی۔ مگر سوائے اس کے کچھ معلوم نہیں کہ جب ۱۲۶۵ھ میں ہندستان ایک خوفناک اور خونریز انقلاب کی کشمکش میں مبتلا تھا، تو شیخ بیت الحرام میں مقفل تھے۔ وہ ایک سال کے قریب حجاز میں رہے لیکن اُن کی زندگی کا یہ ایک سال تاریخ کے صفحات سے بہت دور ہو۔

در سال ۱۲۶۳ھ ہجری بہ نیت ادائے فریضہ حج ابراہائے یک سیاحت کہ تخمیناً بقدر یک سال دوام کردہ، علاوہ برادائے حج در بارہ اخلاق و عادات اقوام اسلامیہ کہ در راہ سیاحت او تصارف کردہ اندقتبات خیلہ عمیقاً کردہ

۵۴۴
است۔

”خیلے عیقانہ“ کی کوئی تشریح و تفصیل میسر نہیں آئی۔ اس سفر کی ابتدا اور انتہا یہ ہے کہ

”بعد ادائے فریضہ حج و زیارتِ مدینہ طیبہ روانہ شام و بیت المقدس و ازان جا بہ عراق و بعضے شہر ہائے فارس مسافرت و سیاحت کردہ دوبارہ از راہ کرمان خاک فارس وارد بلوچستان و ہندستان شدہ در سال ۱۲۰۰ ہجری موقعی کہ اعلیٰ حضرت دوست محمد خاں جہت صرف موسم شتا در جلال آباد متوقف بود، سید جمال الدین وارد خاک وطن و بہ دربار شاہی در جلال آباد بحضور شاہ معرّفی و در سلک مصاحبین بادشاہی شامل گردید۔“

مندرجہ بالا دو بیانات پر شیخ کی پہلی سیاحت کے متعلق ایک یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سفر کتنے عرصے تک جاری رہا۔ ایک بیان سے تو صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس سیاحت میں ایک سال سے زیادہ صرف نہیں ہوا لیکن دوسرے بیان سے یہ افذ کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایک سال کے قریب حجاز میں قیام کر کے پھر دوسرے اسلامی ممالک میں بھی تشریف لے گئے۔ اس صورت میں اعظمی کا بیان زیادہ قابل وثوق معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ شیخ کی روانگی اور واپسی کا وقت دوسری شہادتوں سے بھی مصدقہ ہے اور اس بنا پر ان کی سیاحت کی مدت ۱۲۰۰ھ اور ۱۲۰۱ھ کے درمیان ہے۔ افغانستان میں وہ ۱۲۰۰ھ کے قریب واپس آئے اور اسی وقت سے افغانی سیاست میں شیخ کی عملی دلچسپی کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔

۱۲۰۱ھ۔ ”جمال الدین افغانی“ مطبوعہ ثبات استنبول۔

۱۲۰۵ھ۔ اعظمی درجہ کابل۔

افغانی سیاسیات | جس وقت شیخ اپنی سیاحت سے واپس آکر دربار شاہی میں بمقام جلال آباد حاضر ہوئے تو امیر دوست محمد خاں ہرات کی ہم پر جانے والے تھے۔ اس ہم کے ساتھ اُن کی زندگی کی ہم بھی ختم ہونے والی تھی۔ افغانستان کے سیاسی حالات کی صورت اس وقت یہ تھی کہ ہرات پر ایران کا قبضہ انگلستان کی سیاسی مصلحتوں کے باطل خلاف تھا۔ انگریز دیکھ چکے تھے کہ سہہ کے ہنگامہ میں ہرات پر ایران کا قبضہ ہندستانی مسلمانوں کے مشعل کرنے کا باعث ہو گیا تھا اور اب انگریز کسی طرح بھی ہرات کو ایران کے قبضے میں چھوڑنا گوارا نہ کرتے تھے۔ اس وقت امیر دوست محمد خاں کے چچا زاد بھائی سلطان احمد خاں شاہ ایران کی طرف سے ہرات کے گورنر تھے۔ اور خطبہ شاہ ایران کے نام کا پڑھا جاتا تھا۔ چنانچہ انگریزوں نے

”امیر دوست محمد خاں کو ہرات پر قبضہ کرنے کی ترغیب دی اور عہد کیا کہ امیر اور اس کے جانشینوں کو ایک سالانہ رقم انگریزوں کی طرف سے دی جائے گی جو فوج کو درست کرنے اور قلعوں کو مضبوط رکھنے کے لیے کافی ہوگی تاکہ افغانستان کی امارت وسطی ایشیا میں روس اور ہندستان کے درمیان ایک مضبوط قلعے کا کام دے۔“

امیر دوست محمد خاں نے انگریزوں کی تحریک کو قبول کر کے ہرات کو فتح کر لیا مگر فاتح اور مفتوح یعنی دوست محمد خاں اور سلطان احمد خاں دونوں اسی جنگ کے زمانے میں ہمیشہ کے لیے اپنے جھگڑے ختم کر کے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

امیر دوست محمد خاں کے بعد اُن کے لڑکے اور ولی عہد شیر علی خاں نے

زام حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور اُس اعتماد اور بھروسہ کی وجہ سے جو دوست محمد خاں کو شیخ پر تھا، شیرعلی نے بھی شیخ کو اپنے دربار میں بطور مشیر و مصاحب رکھا۔ دوست محمد خاں کے انتقال کے وقت یہ اندیشہ قوی تھا کہ شیرعلی اور اُن کے بھائیوں میں جنگ چھڑ جائے گی اس لیے کہ دوست محمد خاں نے بڑے لڑکوں کو محروم کر کے شیرعلی کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا اور شیرعلی کے بڑے بھائی سب ملک کے ایک ایک صوبے پر قابض تھے۔ لیکن اس موقع پر شیخ کی عاقبت اندیشی اور فراست نے معاملے کو بڑھنے نہ دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ دوست محمد خاں کے سب لڑکوں پر شیخ کا کافی اثر تھا اور سب بھائی ان کا احترام کرتے تھے یہی سبب تھا کہ تخت و تاج کے معاملے میں بھی وہ بڑوں کو چھوٹے کے مقابلے میں رضامند کر سکے بہر حال شیخ کے مشورے کے مطابق محمد اعظم وغیرہ شیرعلی کے حق میں دست بردار ہونے پر راضی ہو گئے۔ لیکن بد قسمتی سے شیرعلی کے پہلو میں ایک فتنہ پرداز وزیر محمد رفیق بھی تھا جو شیخ کی صلح جوئی کو پسند نہ کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ شیرعلی کے بھائیوں کو بزورِ شمشیر مغلوب کر لیا جائے۔ وہ شیرعلی کو آمادہ فساد کرتا رہتا تھا اور شیخ اس شخص کی ریشہ دوانیوں اور فتنہ پردازیوں کو دیکھ رہے تھے۔ جو واقعات اس سلسلے میں پیش آئے اُن کا تذکرہ شیخ خود اپنی تاریخ افغانستان میں بہ این الفاظ کرتے ہیں کہ۔

”شیرعلی کا ایک خاں وزیر محمد رفیق تھا جو خاندانِ غلی سے نسبت رکھتا تھا اس نے امیر کو مشورہ دیا کہ سب بھائیوں کو گرفتار کر لیا جائے کیونکہ جب تک یہ لوگ افغانی صوبوں پر آزادانہ حکومت کریں گے اُس وقت تک شیرعلی کی حکومت مضبوط نہیں ہو سکتی۔ اس تجویز کی خبر بھائیوں



امیر شیر علی خان

کو بھی ہو گئی جو فوج میں موجود تھے وہ رات ہی کو وہاں سے بھاگ کر اپنے اپنے علاقوں میں پہنچ گئے۔“
انہیں واقعات کو ایک افغانی وقائع نگار کی زبان سے بھی سُن لینا چاہیے۔

”ہنوز اعلیٰ حضرت امیر دوست محمد خاں در جلال آباد تشریف داشت کہ خبر حملہ سردار سلطان محمد خاں مرحوم بفراہ بحضورش رسید۔ امیر کبیر در سال ۱۲۰۰ ہجری بغرض دفعِ دے از جلال آباد عازم کابل و رہسپار قذہار گردید۔ سید جمال الدین نیز در سلکِ ندیاں خاصہ بمعیتِ دے عازم قذہار شد۔ خوش بختانہ در اثرِ تدابیر و افکار برجستہ دے بدون این کہ در زحمتِ مداخلہٗ حرب عایدِ بخششِ امیر کبیر شود یا در اں واقعہ محاربہ و خونریزی بعینِ آید، عساکر و سردارانِ امیر کبیر بدون جنگ بہ تصرفِ شہر فراہ و اخراجِ سلطان احمد خاں مرحوم موفق گردید۔“

موقعیتِ سید جمال الدین دریں سفر مخصوصاً بہ دربارِ نفوذ و بلندی حاصل کرد۔“

پس از حدوثِ ایں واقعہ کہ امیر کبیر بہ تنظیمِ ادارہٗ معاملاتِ فراہ وغیرہ مصروف بود سردار سلطان احمد خاں مرحوم بارِ دویم بہ ہرات از راہِ فارس حملہ کردہ اُن شہر را از تصرفِ عمالِ امیر کبیر خارج کردہ متصرف گردید۔

سید جمال الدین کہ دریں امر دست و اغراضِ ناصر الدین شاہِ فارس را شریک و شامل می دانست رفیقِ امیر کبیر را بہ سرعتِ طرفِ ہرات تجویز و تسخیرِ ہرات را بہ زودی التزام کردہ امیر کبیر روانہٗ ہرات شد۔

شہر را بمحاصرہ انداخت۔ دے در آغازِ ایں محاصرہ عمر سلطان احمد خاں

بسیری شدہ برصحت ایزدی پیوست امیر کبیر آں شہر را بغلبہ و قہر
فتح وہ ہماں روز داخل شدہ بہ شہر وفات نمود“

والحاصل اعلیٰ حضرت امیر شیر علی خاں در سال ۱۲۴۹ ہجری در ہرآ
بہ مسند سلطنت تقرر گرفتہ سید جمال الدین رامشیر اول و مصاحب خاص
مقرر فرمود -“

از نقطہ نظر خدمات و نفوذ قومی کہ محمد رفیق خاں لودی داشت، اور
وزیر اول قرار دادہ ولے مرتبہ و عزت و احترام سید جمال الدین بحضورش
بالا تر ازاں بود۔ محمد رفیق لودی از موقعیت خود نسبت بہ نفوذ و اقتدار سید
جمال الدین اطمینان گاہ نہ داشت۔ لہذا در صدد بود کہ صدمہ بموقعیت
جمال الدین وارد کند۔

اس میں شبہ نہیں کہ امیر شیر علی کے دربار میں شیخ کے اثرات بہت
کارگر ہوتے تھے۔ اور اس زمانے کے افغانی سیاسیات میں شیخ کی شخصیت
بہت وزن رکھتی تھی۔ غالباً اسی وجہ سے وہ محمد رفیق کی آنکھ میں کھٹک رہے
تھے۔ صورت یہ تھی کہ ایک طرف تو محمد رفیق امیر کو بھائیوں کی بیخ کنی پر آمادہ کر رہا تھا
اور دوسری طرف شیخ اس پالیسی کی سختی کے ساتھ مخالفت کر رہے تھے۔ محمد رفیق
سے شیخ کے اختلافات ذرا بھی تعجب انگیز نہیں۔ اول تو اس لئے کہ دجیبا کہ
آئندہ صفحات میں شیخ کے حالات سے واضح ہوگا، ان کا مزاج بہت سخت تھا
وہ ہمیشہ اختلاف کا مقابلہ شدت اور غصے کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ وہ مسیحی زبان
اور دھیمے مزاج والے چالاک مدبّر نہ تھے بلکہ صاف گو اور پرجوش مبلغ اور داعی
اور نیز اس لیے بھی کہ شیخ کی تمام زندگی کا طور ہی یہ تھا کہ حکومتوں کے اراکین

اور عمال سے اُن کی کبھی نہ بنتی تھی۔ مصر، ترکی اور ایران میں ہر جگہ حکومت کے ٹھیکہ داروں سے وہ چند روز بھی نہ نبھا سکے بلکہ بہت سختی کے ساتھ اور بہت سی قربانیاں کر کے ان کا مقابلہ کرتے رہے۔ اس قسم کا یہ پہلا مقابلہ اور تصادم تھا جو شیخ کی زندگی میں پیش آیا۔ شیخ آخر تک اپنی اس رائے پر جے رہے کہ شیر علی کو اپنے بھائیوں سے جھگڑانہ کرنا چاہیے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ اگر شیر علی نے شیخ کے مشورے پر عمل کیا ہوتا تو افغانستان کی تاریخ کے اس دور میں خوں ریزی، بدمنی اور فتنے کی بجائے امن و امان کے ساتھ ملک کی تنظیم ہو سکتی اور وہ انقلابات پیش نہ آتے جو بعد میں عرصے تک پیش آتے رہے۔ یہ قرین قیاس ہے کہ اگر محمد رفیق اور شیخ کے درمیان یہ کشمکش ختم ہو گئی ہوتی اور رفیق کے مشوروں پر شیر علی نے عمل نہ کیا ہوتا تو شیخ عرصے تک افغانستان میں مقیم رہتے اور افغانی سیاست کی بہت سی گتھیوں کو ان کا ناخن تدبیر سلجھاتا۔ لیکن جیسا کہ بہت جلد معلوم ہو گیا، محمد رفیق اور شیر علی کے رویے نے ان کو بد دل کر دیا اور وہ اپنے وطن کی سیاست سے قطع نظر کر کے دنیائے اسلام کے متعلق بڑے بڑے خواب دیکھنے لگے۔ لیکن ہر ناخوشگوار واقعہ کا کوئی نہ کوئی خوشگوار پہلو بھی ہوتا ہے۔ شیر علی اور رفیق سے شیخ کے اختلافات دنیائے اسلام کے لیے ایک برکت عظیم ثابت ہوئے۔ جو کچھ افغانستان نے کھو دیا وہ عالم اسلام نے پایا۔ قدرت نے ان کی اس تارک الوطنی میں دنیائے اسلام کو ایک ایسا داعی حق عطا فرمایا جس کی مثال انیسویں صدی میں مل نہیں سکتی۔ جب تک شیخ شیر علی کی خدمت میں رہے وہ افغانستان کی قومی زندگی میں ایک نئی تحریک پیدا کرنے کی فکر کرتے رہے۔ انھوں نے تنظیم ملت کے نئے راستے پیدا کیے اور جس منزل کی طرف وہ افغانستان کو پہنچانا چاہتے تھے وہی منزل تھی جس کا پتہ اپنی

آئندہ زندگی میں انھوں نے دوسرے اسلامی ممالک کو دیا۔ اپنے وطن میں انھوں نے جو کچھ کیا اس کے متعلق چند مختصر اشارات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ افغانستان میں سب سے پہلا اخبار ”شمس النہار“ کے نام سے جاری کرایا اور امیر شیر علی سے اس جریدے کے اجرا کی اجازت دلوائی۔ افسوس ہے کہ اس اخبار کا اب کوئی پتہ نہیں چلتا۔ ”شمس النہار“ کے پرچے تمام ملک میں تقسیم کیے جاتے تھے اور غیر ممالک میں بھی بھیجے جاتے تھے۔ جب تک شیخ افغانستان میں رہے یہ جریدہ بھی جاری رہا۔“

جیسا کہ شیخ کے حالات سے واضح ہوگا وہ ہمیشہ رائے عامہ کی تہذیب اور تنظیم کے لیے قومی اخبارات اور جراید کا وجود بہت ضروری سمجھتے تھے۔ وہ خود اپنے زمانے میں سب سے بڑے مسلمان اخبار نویس تھے۔ جس ملک میں بھی وہ گئے انھوں نے جراید و اخبارات جاری کرائے اور اسی ذریعے سے اپنا پیام عامۃ الناس تک پہنچایا۔ شیخ کا قایم کیا ہوا وہی پہلا نقطہ تھا جو بعد کو افغانستان میں صحافت اور جریدہ نگاری کا مرکز قرار پایا۔ بقول پروفیسر باگدارو اواخر ستمہ میں امیر شیر علی کے زمانے میں ایک اور اخبار بھی جاری ہوا تھا جس کا نام ”کابل“ تھا۔ ۵

افغانستان جیسے ملک میں جہاں اہل سیاست اور حکومت تلوار اور رنفل کے سوا کسی دوسری چیز کو قومی عصبيت اور حریت کا مظہر سمجھتے ہی نہ تھے قومی سیاست میں قلم کی قوت کو داخل کر دینا شیخ ہی کا کام تھا۔

۲۔ امیر کے دربار اور دفاتر حکومت کے دروبست کو بھی شیخ نے ایک بلند تر سطح پر لانے کی کوشش کی اور متمدن طریقوں سے ایک جدید تنظیم کی

بنیاد ڈالی - افسوس ہو کہ اس زمانے کے تمام دفتری کاغذات ضایع ہو چکے ہیں اور باوجود کوشش کے مزید تفصیلات حاصل نہ ہو سکیں۔
۳۔ فوج کی جدید ترتیب قائم کرائی اور جدید اصولوں پر اس کو منظم کرایا۔

۴۔ سب سے پہلے سرکاری مکاتب قائم کرائے اور تعلیم کی ترقی کے لیے تدابیر اختیار کیں۔

۵۔ عوام کے لیے سرکاری شفا خانے قائم کرائے۔
۶۔ ڈاک اور رسل و رسائل کا کوئی باقاعدہ انتظام نہ تھا۔ اس کو جدید اصولوں کے مطابق جاری کرایا۔

۷۔ وزرا کی ایک مجلس شوریٰ قائم کرائی۔

۸۔ غیر مالک میں سفیر اور نمائندے بھیجنے کا انتظام کیا۔ وغیرہ وغیرہ
یہ تمام جدید اصلاحات وہ تھیں جن سے اُس وقت تک افغانستان ذرہ برابر آشنا نہ تھا اور بلاشبہ ان اصلاحات کا اجرا شیخ ہی کا کارنامہ تھا جس کی قدر و قیمت کو اب ان کے ہم قوم اچھی طرح محسوس کر رہے ہیں۔
"مجلہ کابل" میں اعظمی نے بھی شیخ کی ان کوششوں کی طرف بعض اشارات کیے ہیں۔

"امور دربار بصورت خیلے عالی و مطابق سلیقہ دربار شاہان بزرگ تنظیم گردید۔ عساکر خیلے مرتب و منظم کہ نظیر آں در بعض بلاد شرقی کمتر دیدہ شدہ بود بایک تعداد کافی تشکیل گردید۔ مکتب ہائے عسکری و کشوری تاسیس شد۔ تسطیع راہا و اصدات مسافر خانہ ہا در عرض طریق مسافرت برپا و تعمیر شد۔ کابینہ وزراء انصاف و خوائس صاحب منصبان عسکری و کشوری بہ آسامی زبان افغانی

وضع شد - شہر جدیدہ شیرپور احداث گردید -----
 ہمنہاں تنظیم تجارت و روابط باخارجہ بصورت گرفتہ سید جمال الدین میل
 داشت ہرچہ زود افغانستان بصورت دول معروضہ داخل اتحاد و مودت با
 دول خارجہ شود نمایندہ ہائے بعضے دول ہمسایہ ہم بہ
 کابل حاضر شدہ بودند

ان اشارات سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہوتی ہو کہ شیخ ترقی کی جدید
 راہوں پر افغانستان کو لے جانا چاہتے تھے لیکن بدقسمتی سے شیر علی نے محمد رفیق
 کے مشوروں سے متاثر ہو کر اپنے بھائیوں کے قلع قمع کرنے کا ارادہ کر لیا۔
 جب شیخ نے دیکھا کہ اُن کے مشورے کارگر نہیں ہوتے اور امن و امان قائم
 ہونے کے بجائے بھر جیگ کے شعلے بھڑکنے والے ہیں تو انھوں نے دربار
 سے قطع تعلق کرنے کا تہیہ کر لیا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ ایسا کریں امیر شیر علی
 کے بھائیوں کو کسی طرح امیر کے ارادوں سے مطلع کرا دیا۔ اسی اطلاع کی بنا پر
 محمد غنیم محمد اسلم اور محمد امین تینوں بھائی دفعتاً اپنے علاقوں کو چلے گئے جہاں
 وہ سمجھتے تھے کہ شیر علی کا دستِ دراز ان تک نہ پہنچ سکے گا۔ شیخ نے اب وطن
 سے رخصت ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

”بہر حال سید جمال الدین از اوضاع محمد رفیق خان بھگلی مایوس شدہ
 بعنوان مسافرت موقتی از حضور شاہ اجازت گرفتہ عازم ہند گردید“
 یہ واقعہ ۱۸۶۳ء یا ۱۸۶۴ء کا ہو۔

قراین یہ ہیں کہ شیخ چند روز مصلحتاً افغانستان سے باہر رہنا چاہتے
 تھے تاکہ شیر علی اور اُن کے بھائیوں کی آویزش سے بے تعلق رہیں۔

۹۰۰ عظمیٰ در مجلہ کابل

اس دفعہ شیخ کا قیام ہندستان میں چند ماہ سے زائد نہیں رہا اور اس عرصے میں وہ بہت خاموش اور گمنام رہے۔ سوائے اس امر کے کہ اُن کا اس زمانے میں ہندستان آنا بعض روایات سے متقین ہوتا ہے، باقی اس سفر کے تمام حالات نامعلوم ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اتنا اور معلوم ہے کہ شیخ کو حکومت ہند نے اس دفعہ پنجاب سے آگے جانے کی اجازت نہیں دی۔ پنجاب میں وہ کہاں کہاں رہے اور کیا کیا کرتے رہے کچھ معلوم نہیں۔ لیکن یہ قیاس غلط نہیں کہ شیخ کو جو مرتبہ افغانی سیاست میں حاصل ہو چکا تھا اس کے باعث حکومت ہند نے ان کی نقل و حرکت کی خاص طور پر نگرانی کی ہوگی اس لیے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب افغانستان کے معاملات سے برطانوی مدبرین بہت زیادہ دلچسپی لے رہے تھے اور شیر علی کو برطانوی سہر دیاں حاصل تھیں۔ دوسری طرف یہ واقعہ بھی کوئی راز نہ تھا کہ شیخ شیر علی کے طرز عمل کو ناپند کرتے تھے۔

شیخ کی روانگی کے بعد ہی شیر علی نے اپنے بھائیوں کے خلاف پیش قدمی شروع کر دی۔ پہلی ہم تو اس لیے ناکام رہی کہ خود کابل میں شیر علی کے خلاف بغاوت اور فساد کی صورت پیدا ہو گئی اور ان کو بھائیوں کی بیخ کنی کا ارادہ ترک کر کے کابل واپس آنا پڑا۔ لیکن بھائیوں کا وجود کانٹے کی طرح شیر علی کے دل میں کھٹک رہا تھا اور کابل کے حالات سے ایک گونہ مطمئن ہو کر انھوں نے پھر محمد اعظم کے خلاف فوج کشی شروع کی۔ محمد اعظم مقابلہ کی تاب نہ لا کر ہندستان کی طرف چلے گئے اور اب شیر علی عبدالرحمن خاں کے والد سردار افضل خاں کے خلاف آمادہ پیکار ہوئے۔ محمد افضل خاں بھی میدان میں اُتر آئے۔ اُس وقت شیر علی نے بظاہر اُن سے صلح کر لی اور افضل خاں اپنی سادہ دلی کی وجہ سے بالکل مطمئن ہو گئے۔ اُن کی اس غلطی کا یہ نتیجہ نکلا کہ جب تاسکرمان کے مقام پر

وہ شیرعلی سے ملنے گئے تو شیرعلی نے اُن کو بلا پس و پیش قید کر لیا۔ افضل خاں کے اس طرح قید ہو جانے پر عبدالرحمن خاں بہت بگڑے لیکن باپ نے بیٹے کو تاکید لکھا کہ وہ فوراً بخارا چلے جائیں۔ چنانچہ وہ بخارا چلے گئے اور چند روز بعد اُنہوں نے اپنے چچا محمد اعظم کو بھی بخارا بلایا۔ ادھر شیرعلی خاں افضل خاں کو مقید ساتھ لے کر اپنے تیسرے بھائی محمد امین کا فیصلہ کرنے کے لیے قذھا کی طرف لوٹے۔ دو دن کے سخت معرکہ کے بعد سردار امین خاں میدان جنگ میں مارے گئے لیکن اُسی معرکہ میں شیرعلی کا بیٹا بھی جو وارث تاج و تخت سمجھا جاتا تھا، مارا گیا۔ امیر عبدالرحمن خاں نے اپنی سوانح عمری میں بہت عبرت آموز طریقے پر یہ واقعہ بیان کیا ہے یعنی جس وقت لڑائی کے بعد شیرعلی کے سامنے اُن کے مقتول بھائی کی لاش لائی گئی تو وہ اپنی فتح کے نشے میں بہت مست تھے۔ لاش پر ایک غلط انداز نظر ڈال کر اُنہوں نے بڑی رعونت کے ساتھ حکم دیا کہ اس کتے کی لاش کو پھینک دو اور میرے بیٹے سے کہو کہ مجھے آکر مبارک باد دے۔ لوگوں کی بہت نہ پڑتی تھی کہ بیٹے کے مارے جانے کا حال بیان کریں۔ آخر وہ چپ چاپ لاش کو لے کر سامنے آئے۔ شیرعلی نے پھر اُسی رعونت کے ساتھ کہا: ”اب یہ کس کتے کی لاش ہے؟ لوگوں نے لاش کا چہرہ کھول دیا!۔“ شیرعلی اس صدمے سے دیوانے ہو گئے۔ کپڑے پھاڑ ڈالے اور عرصے تک مجنوناں کے طور پر رہے۔ درحقیقت اس عبرت انگیز واقعہ نے اُن کی کمر توڑ دی اور وہ بالکل گوشہ نشین ہو گئے۔ عبدالرحمن بخارا میں بیٹھے ہوئے کابل کے حالات کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اُن کو جب شیرعلی کے اس حال کی خبر ملی تو وہ بخارا سے بلخ کی طرف روانہ ہوئے اور چند معمولی لڑائیوں کے بعد اس صوبے پر قبضہ کر لیا۔ اُس کے بعد اعظم خاں اور عبدالرحمن پوری قوت سے کابل کی طرف

متوجہ ہوئے۔ شیرعلی کے دوسرے بیٹے ابراہیم نے مقابلہ کیا مگر شکست کھائی اور قندھار کی طرف بھاگا جہاں شیرعلی مقیم تھے۔ غرنی میں اعظم خاں نے فضل خاں کو بھی قید سے رہا کر لیا تھا اور دونوں بھائی اور عبدالرحمن کابل کی شہر پناہ کے سامنے پہنچ گئے۔ شیرعلی کے وزیر محمد رفیق نے شہر کے دروازے پر ان تینوں کا استقبال کیا۔ لیکن ان کا استقبال تو کیا کیا خود اپنی موت کا استقبال کیا۔ اُس کا بیاناں لبریز ہو چکا تھا اور محمد اعظم خاں نے کابل میں داخل ہونے کے بعد پہلا کام ہی کیا کہ محمد رفیق کو فساد کا اصلی بانی قرار دے کر پھانسی دے دی۔ اس کے بعد محمد اعظم خاں نے قندھار پر حملہ کیا اور شیرعلی شکست کھا کر ہرات کی طرف بھاگ گئے۔

شیخ ہندستان میں بیٹھے ہوئے ان تمام حالات سے باخبر تھے اور جب اُن کو یہ اطلاع مل گئی کہ کابل پر محمد اعظم خاں قابض ہو گئے اور شیرعلی بھاگ گئے اور محمد رفیق نے پھانسی کے تختہ میں اپنی زندگی ختم کر دی تو وہ ہندستان سے پھر وطن کی طرف روانہ ہوئے۔

”از واقعاتِ بالا جمال الدین در ہند مطلع گردید۔ فوراً از راہِ چین و کوئٹہ خود را بہ قندھار رسانیدہ و چوں دو بارہ تبدیلِ سلطنتِ افغان را موجب خونریزی و بربادیِ وطن عقیدہ داشت دید از امدادِ امیر شیرعلیِ مخوف و بہ تائیدِ اعلیٰ حضرت امیر محمد اعظم خاں شامل گردید۔“

قندھار کی فتح کے بعد جب محمد اعظم کابل آئے تو شیخ اُن کے ہمراہ تھے۔ یہ واقعہ غالباً ۱۲۸۶ھ کا ہے۔

کابل میں اب محمد فضل خاں سریر آرائے سلطنت ہوئے مگر اُن کی عمر نے وفا نہ کی اور صرف ایک ہی سال کے بعد ان کا انتقال

۱۲۸۶ھ تا ۱۲۸۷ھ - مولفہ سید جمال الدین افغانی ۱۲۸۷ھ عظمیٰ - در مجلہ کابل

ہو گیا۔ عبدالرحمن خاں کابل میں موجود تھے لیکن انھوں نے باپ کے بعد اپنے چچا محمد اعظم خاں کو تخت پر بٹھایا۔ شیخ اب اراکین سلطنت میں بہت عالی مقام ہو گئے تھے۔ وہ امیر کے مشیر خاص اور وزیر اعظم مقرر کر دیے گئے تھے۔ اُس زمانے میں ملک کے نظم و نسق کے متعلق ان کے کارنامے پیش نظر نہیں ہیں۔ اور کچھ معلوم نہیں کہ اس دفعہ قومی اور ملکی اصلاح اور ترقی کی کیا کوششیں انھوں نے کیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان کی وزارت کا زمانہ سال ڈیڑھ سال سے زیادہ طویل نہ تھا اور اُس زمانے کی تاریخ کی اسناد کہیں موجود نہیں۔ میں نے کوشش کی کہ افغانستان کے سرکاری دفاتر کے قدیم کاغذات کا پتہ چلاؤں، لیکن معلوم ہوا کہ اس عہد انقلاب کے دفتری کاغذات خدا جانے کب ضائع ہو چکے۔ میں شکر گزاری کے ساتھ اس امر کا اعتراف کرتا ہوں کہ میری اس جستجو میں افغانی حکام نے میری کافی امداد کی لیکن شیخ کی وزارت کے حالات کا ایک شتمہ بھی حاصل نہ ہو سکا۔ بہر حال یہ معلوم ہے کہ وہ تمام زمانہ بدامنی اور بے اطمینانی کا زمانہ تھا اور افغانستان کے عام حالات امیروں اور سرداروں کے باہمی فسادات کی وجہ سے بہت خراب تھے۔ شیرعلی نے شکست تو کھائی تھی مگر وہ شکست فیصلہ کن نہ تھی۔ وہ سرحد پر موجود تھے۔ ان کے حملے جاری تھے اور دارالسلطنت اندرون اور بیرون خطرات سے محفوظ نہ تھا۔ بدقسمتی سے امیر اعظم خاں اور سردار عبدالرحمن خاں کے درمیان ناچاقی اور بددلی شروع ہو گئی اور اسی بنا پر امیر نے ان کو دارالسلطنت سے ہٹا کر بلخ کا گورنر بنا کر بھیج دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو تقویت حکومت اور محمد اعظم خاں کو حاصل تھی وہ نہ رہی۔ شیرعلی کو جب معلوم ہوا کہ عبدالرحمن خاں اور محمد اعظم خاں کا اتحاد باقی نہیں رہا تو ان کے حوصلے بڑھ گئے۔ شیخ نے بہت کوشش کی کہ محمد اعظم خاں اور عبدالرحمن کے درمیان

صفائی اور اتحاد ہو جائے مگر مقدّرات محمد اعظم خاں کو غلط راستے پر لیے جا رہے تھے اور ان کی قسمت میں نہ تھا کہ وہ زیادہ عرصے تک برسرِ حکومت رہ سکیں۔ انھوں نے شیخ کے مشوروں پر توجہ نہ کی اور اس حالت میں شیخ کے لیے سوائے اس کے چارہ نہ تھا کہ خاموشی سے بیٹھے ہوئے واقعات کے بد و جزر کو دیکھتے رہیں۔

”سید جمال الدین کہ ہم خوب تر بہ طبیعت ایں دو شاہ مانوس بود، از آئندہ اوضاع نامطمئن چارہ جز توکل نہ دیدہ“

چند ہی روز کے اندر اعظم خاں اور شیرعلی کے درمیان ایک فیصلہ کن کشمکش شروع ہو گئی۔ ایک ہی محلے میں شیرعلی نے قذحار پر قبضہ کر لیا اور پھر کابل کی طرف بڑھنے لگے۔ اس وقت افغانستان کی سرحدوں پر انگریز اور روسی مدبرین نظریں جمائے ہوئے تھے۔ روس اور انگلستان کی سیاسی رقابت نے افغانستان کے حالات کو بہت اہم بنا دیا تھا۔ اس لیے کہ ان رقبوں میں سے ہر ایک کو شش کر چکا تھا کہ افغانستان پر اس کا اثر مستحکم ہو جائے۔ چنانچہ پھر انگریزوں نے اس بساط پر اپنی سیاسی چالیں شروع کیں۔ شیرعلی جو خارجی امداد کے بہت محتاج تھے، بہ آسانی برطانوی امداد کو قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اُس وقت اُن کے لیے یہ امداد ایک نعمتِ غیر مترقبہ تھی۔ دراصل شیرعلی کا جذبہ انتقام ہر حالت میں اور ہر قیمت پر محمد اعظم خاں کو شکست دینا چاہتا تھا۔ دونوں خارجی سیاست کے رموز اور نکات سے نا آشنا تھے۔ اور دونوں انگریزوں کو اپنا دوست سمجھنے کے لیے تیار تھے۔ محمد اعظم خاں کے مزاج کی سختی اور شدت نے اُن کو غیر ہر و لعزیز بنا دیا تھا اور خود اُن کے دربار میں لوگ اُن

سے ناخوش ہو گئے تھے۔ چنانچہ اکثر خوانین شیرعلی سے جا کر بل گئے اور محمد اعظم خاں کا پتہ ہلکا دیکھ کر انگریزوں نے بھی شیرعلی کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ شیخ خارجی سیاست کی ان کار فرمایوں کو اچھی طرح دیکھ رہے تھے لیکن معاملہ اُن کے قابو سے باہر ہو چکا تھا۔ آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ محمد اعظم خاں اور عبدالرحمن خاں شیرعلی سے شکست کھا کر مشہد کی طرف چلے گئے اور شیرعلی فاتحانہ کابل میں داخل ہوئے۔ شیخ اس وقت تک کابل میں موجود تھے اور ان کے لیے یہ وقت بہت نازک اور خطرناک تھا۔

وہ محمد اعظم خاں کے خاص مشیر سمجھے جاتے تھے اور شیرعلی کو قدرتا اُن کی طرف سے بدگمان ہونا چاہیے تھا، لیکن شیخ خدا پر بھروسہ کئے ہوئے بیٹھے ہیں اور شیرعلی نے بھی اس وقت کچھ تو شیخ کے ذاتی اثرات اور شخصی نفوذ کا لحاظ کر کے اور کچھ اس خیال سے کہ کوئی نیافتہ کھڑا نہ ہو جائے، شیخ کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی مناسب نہ سمجھی اور نہ شیخ سے کوئی تعرض کیا، البتہ شاہی دربار سے وہ دور ہی دور رہنے لگے۔

”دہم شیرعلی نظر بہ احترام افکار بلند و خدماتِ گزشتہ او را بحالِ خویش واگذاشت“^{۳۵}

لیکن شیخ خوب جانتے تھے کہ اب افغانستان میں اُن کا قیام نہ صرف فضول بلکہ خطرناک ہے۔ اُن کی نظر وطن کے باہر اب بہت دُور تک جا رہی تھی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ شیرعلی برطانوی سیاست کا ایک ہرہہ ہے اور اس ہرے کے ذریعے سے افغانستان کی ترقی و اصلاح ناممکن ہے۔ ”عہد انتظار“ اب ختم ہو رہا تھا۔ شیخ کو جو کچھ اپنے وطن میں سیکھنا اور سمجھنا تھا وہ سیکھ

^{۳۵}۔ ”عظمیٰ“ در مجلہ کابل“

اور سمجھ چکے تھے۔ وہ اب وطن سے نکل کر دوسرے اسلامی ممالک تک اپنا پیام پہنچانا چاہتے تھے اور اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ اسلامی ممالک کی عاقبت کا انحصار اب باہمی اتحاد میں ہو۔ چنانچہ انھوں نے شیرعلی سے سفر حج کی اجازت چاہی اور شیرعلی نے بھی اس شرط کے ساتھ ان کو اجازت دے دی کہ وہ ایران یا وسط ایشیا کی طرف ہو کر نہ جائیں غالباً یہ شرط اس لیے لگائی گئی کہ شیخ محمد عظیم خاں سے ایران میں اور عبدالرحمن خاں سے بخارا میں ملاقات نہ کر سکیں۔

اس طرح ۱۲۶۹ھ میں شیخ ہمیشہ کے لیے اپنے وطن سے رخصت ہوئے اور ان کی زندگی کا وہ سفر شروع ہوا جو ان کو افغانستان کی گمنامی سے نکال کر ایک ایسے میدان میں لے جانے والا تھا جہاں سیاست اور تدبیر کی بڑی بڑی بازیاں بدی جارہی تھیں۔ وہ تنہا اپنے وطن سے نکلے مگر ارادوں، حوصلوں اور عزائم کا ایک عظیم الشان قافلہ ان کے ساتھ تھا۔ وہ بظاہر بے یار و مددگار تھے لیکن عزم اور ایمان یہ دو اُن کے مضبوط بازو تھے جن کے بھروسہ پر وہ یکہ و تنہا ایک ایسی منزل کی طرف جارہے تھے جو پیغمبروں کی منزل سے صرف دوسرے درجہ پر ہو! اس سفر کا آغاز ان کی زندگی کے دورِ اول کا خاتمہ تھا۔ اپنے وطن کی خونریزیوں اور سیاسی کشمکش میں انھوں نے وہ سب تجربے حاصل کر لیے تھے جو اُن کی آئندہ زندگی میں کام آنے والے تھے۔ ان کی جیب میں پیسہ نہ تھا۔ جب وہ وطن سے چلے، لیکن تجربہ، ایمان اور قوتِ عمل یہ سب زادِ راہ ان کے پاس تھا اہل عرض کی خود غرضیاں، اربابِ حکومت کا غرور۔ اہل ثروت کی مکاریاں، فاتح کی رعونت اور مفتوح کا جذبہ انتقام۔ ملک اور مال

کے لیے انسانوں کی ریاکاریاں اور خونخواریاں۔ مشرقی اقوام کے ساتھ مغربی اقوام کی سیاسی چالیں۔ یہ سب انھوں نے زندگی کے دورِ اول کے مکتب میں سیکھا اور جانا۔ اس طبع وہ اس مدرسہ سے سندِ تحصیل حاصل کر کے دنیائے اسلام کی طرف چلے جہاں اُن کو ملتِ اسلامی پر اپنی عمر کے بقیہ ۲۰ برس قربان کرنے تھے۔

دورِ ثانی

دورِ ثانی

شیخ کی زندگی کے دورِ ثانی کے متعلق شاعر کی زبان سے کہا جاسکتا ہے کہ

رہرو راہِ محبت کا خدا حافظ ہے

اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

ہندستان بد نصیب وہ ملک ہے جہاں لوگ اپنے ہم وطن اکابر
ہندستان تیسری دفعہ | و مشاہیر کو بھی ایک ہفتہ کے اندر بھول جایا کرتے ہیں۔ تو پھر

جمال الدین کو جو اب تیسری دفعہ ہندوستان آئے تھے، آج ساٹھ برس بعد کون یاد کر سکتا ہے۔

اس دفعہ ہندستان میں شیخ کا قیام ایک ماہ سے زائد نہیں رہا۔ اس

عرصہ میں وہ کہاں کہاں رہے اور کس کس سے ملے، معلوم نہیں سوائے اس کے کہ۔

”در سال ۱۲۵۵ھ ہجری سید جمال الدین افغان بہ ہندستان رفتہ حکومت

ہند علمائے ہند را از مذاکرہ و اجتماع با مشائرا ایہ منع کرد۔ پس از یک ماہ

اقامت در ہند بہ مصر رفت " ۱۳۵۵ھ

یہ وقت تھا کہ غدر سہ۷۷ کو گزرے دس گیارہ برس سے زیادہ نہ ہوئے تھے، آگ بجھ گئی تھی مگر راکھ میں چنگاریاں باقی تھیں۔ برطانوی حکومت پھونک پھونک کر قدم رکھ رہی تھی اور قدرتاً انگریز بہت محتاط اور ہوشیار تھے۔ اس زمانے میں شیخ کا ہندستان آنا حکومت کے نقطہ نظر سے کسی طرح پسندیدہ نہ تھا۔ علاوہ بریں محمد اعظم خان اور عبدالرحمن خان انگریزی مدبرین کی نظر میں انگریزی اقتدار کے خلاف تھے اور شیخ ان دونوں کے خاص آدمی سمجھے جاتے تھے۔ شیرعلی کے متعلق جو اس وقت انگریزوں کے آدمی تھے، شیخ کے خیالات بہت ہی خراب تھے اور اغلب یہ ہو کہ حسبِ عادت وہ شیرعلی کے متعلق صاف صاف اپنے خیالات کا اظہار بھی کرتے ہوں گے۔ محمد اعظم خاں اور عبدالرحمن خاں جب انگریزی دعوت کو رد کر کے ایران اور بخارا چلے گئے تو پھر شیخ کا ہندوستان آنا انگریزی حکومت کے لئے ناگوار ہوا ہوگا۔ ہندستان کے علما کے طبقوں میں غدر کے اثرات ابھی تک باقی سمجھے جاتے تھے اور اس بارود کے پاس اس افغانی مشعل کا آنے دیا جانا قطعاً نامناسب تھا! ایسی حالت میں شیخ نے بھی محسوس کر لیا ہوگا کہ ان کا ہندستان میں زیادہ قیام باطل فصول ہو۔ بہر حال یہ امر واقعہ مستند ہے کہ شیخ اس دفعہ ہندستان میں زیادہ نہیں ٹھہرے۔ صحیح طور پر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ یہاں سے کہاں گئے۔ روتھیں مختلف ہیں لیکن تاریخ کے صفحات پر ہندستان کے بعد وہ سب سے پہلے مصر میں نظر آتے ہیں اور اس سفر کی درمیانی کڑی اگر کوئی تھی تو وہ مفقود ہے۔

پہلا سفر مصر | پروفیسر براؤن نے مفتی عبدہ کے حوالے سے بیان کیا ہو کہ "شیخ محمد عبدہ نے مجھ سے کہا کہ شیخ جمال الدین کا پہلی دفعہ مصر آنا اُن کو خوب یاد ہے شیخ سیدھے بخارا سے آئے تھے اور مغربی ممالک میں قاہرہ پہلی جگہ تھی جہاں اُن کا قیام ہوا" اگر اس بیان کو صحیح مان لیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہو کہ ہندستان سے وسط ایشیا کی طرف اگر شیخ گئے تو کدھر سے گئے۔ مشکل یہ ہو کہ مصر میں شیخ کی آمد کی صحیح تاریخ کا تعین نامکن ہو اور یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ شیخ ہندستان سے روانہ ہو کر کس قدر عرصے بعد مصر پہنچے۔ اگر یہ معلوم ہو جاتا تو مدت سفر کے طول سے اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ شیخ براہ راست مصر گئے یا حجاز ہو کر گئے یا واقعی بخارا سے مصر آئے تحقیق و تفتیش کی ساری راہیں بند ہیں۔ پس سوائے اس کے چارہ نہیں کہ براؤن اور مفتی عبدہ کے قول کو بلا تصدیق صحیح مان لیا جائے۔

مصر کی سرزمین پر بھی شیخ کے لیے وہی آسمان پیدا تھا جو اُن کا قیام ہندستان میں گوارا نہ کر سکا چنانچہ وہ صرف چالیس دن مصر میں ٹھہرنے پائے۔ اس چالیس دن کی مختصر مدت میں وہ کیا کرتے رہے اس کا حال صرف اتنا ہی معلوم ہو کہ

"در طرفِ ایں مدت با محفلِ علی الاذہر آشنا شدہ طلباء مدرسہ مذکور کہ از سورہ بودند بہ نسبت جمال الدین افغانی حرمت بیارے نشان دادہ و از مشائریہ تدریس "شرح اظہار" آرزو کردند۔ سید جمال الدین افغانی چندے بہ ایشاں "شرح اظہار" درس دادہ۔" ۴۵

اذہر میں شیخ کی تقریریں اور مواظظ کا لہجہ اور موضوع برطانوی سیاست

کے لیے خوشگوار ثابت نہ ہوا۔ وہ سیاستِ خارجہ اور ادارہء داخلہ پر اعتراضات کرنے لگے اور غضب یہ تھا کہ طلباء ان کی صاف گوئی اور ان کے خیالات سے متاثر معلوم ہوتے تھے۔ مصر کی سرزمین پر جہاں مستقبلِ قریب میں برطانوی ”ذیل“ مستقل صورت اختیار کرنے والا تھا اس قسم کے خیالات کا اظہار روا نہ رکھا جاسکتا تھا۔ برطانوی سیاست سے شیخ کا یہ تصادم پہلا علانیہ تصادم تھا اس لیے تعجب نہیں کہ انگریز

”مترصد بودند کہ برائے اخراج سید موقعہ بدست آورند۔ اتفاقاً ہمارا روز ہاکشیش از نصرانیوں مجذوب فرمایشات سید شدہ بدست وکرا اسلام آورد۔ اقوام عیسوی مقیم مصر بمعارضہ برخاستند۔ مسلمین آن جا بہ دفاع قیام نمودند۔ خدیو مصر موقعہ را غنیمت دانستہ از طول اقامت سید معذرت خواست..... پس از مرور دو ماہ یا کمتر..... بطرف استانبول مراجعہ فرمود۔“

یہ ظاہر ہے کہ اخراج کی اصل وجہ ایک نصرانی کا مسلمان ہونا نہ تھا اور خدیو مصر کا حکم بھی صرف اُسی کا حکم نہ تھا۔ سیاسی قوتیں شیخ کے خلاف کام کرنے لگی تھیں اور غالباً شیخ کو بھی اس حقیقت کا کافی اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کی منزل دور اور کڑی ہے۔ مگر جو چالیس دن اُنھوں نے سرزمینِ فراعنہ پر گزرا ہے وہ بے نتیجہ نہ تھے۔ اس قلیل مدت میں اُنھوں نے مصریوں کے دلوں میں وہ تخمِ عمل ڈال دیا جو باوجود ہر قسم کے موانع کے مصر کے ریگستانوں اور دریائے نیل کے کنارے پھیلتا پھولتا رہا اور آج بھی ایک تناور درخت کی صورت میں قائم ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ شیخ کی شخصیت میں وہ کیا جادو تھا جو اس قدر جلد کارگر ہو جاتا تھا۔ یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ جمال الدین



شیخ محمد عبدہ

ہی وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے مصر کی نوجوان نسل کو قوم پرستی اور حریت کا ابتدائی سبق پڑھایا جس صرف و نحو پر جو لیکچر جمال الدین نے ازہر کے طلباء کو دیے وہ صرف و نحو درحقیقت جذبہ ملی اور حریت اسلامی کی صرف و نحو تھی۔ اس مختصر قیام میں انہوں نے مصر کی حیات ملی کی رہنمائی کے لیے اپنا ایک قائم مقام بھی ڈھونڈ لیا تھا۔ یہ مفتی عابد تھے جو بعد کو مصر کے مفتی اعظم اور احرار مصر کے قائد محترم بنے۔ اس وقت جب پہلی دفعہ وہ شیخ کے حلقہ درس میں شامل ہوئے تو وہ ایک بیس سالہ نوجوان تھے اور ہنوز ان کی طالب علمی کا زمانہ ختم نہ ہوا تھا۔ بقول براؤن اسی زمانہ میں عابدہ شیخ کی شخصیت سے متاثر ہو گئے تھے اور دوسری دفعہ جب شیخ مصر آئے تو وہ شیخ کے سب سے قوی دستِ بازو بن گئے۔

جس زمانہ میں شیخ مصر پہنچے قسطنطنیہ میں قوم پرستوں کی ایک چھوٹی سی جماعت پیدا ہو چکی تھی اور غالباً امید کی یہی ایک شعاع تھی جو ان کو مصر سے ترکی کی طرف لے گئی۔ تعجب نہیں کہ وہ یہ اُمید لے کر مصر سے چلے ہوں کہ جو کام مصر میں ان کے لیے مشکل تھا وہ ترکی میں اس قدر مشکل نہ ہوگا مگر ان کو معلوم نہ تھا کہ ابھی اس راہ میں کتنی کڑی منزلوں سے گزرنا ہے۔

ترکی کا پہلا سفر | یہ واقعہ مشتبہ ہے کہ شیخ مصر سے سیدھے قسطنطنیہ گئے یا حجاز ہو کر گئے۔ مرزا لطف اللہ کا بیان ہے کہ۔

”و بعد از مسافرت مکہ متصرف و از آں جا عازم استانبول می شوند“
اس بیان کی تائید یا تردید میں کوئی دوسرا بیان ہمارے سامنے نہیں۔
بہر حال یہ مسلم ہے کہ مصر سے روانہ ہونے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ

استانبول پہنچ گئے اور اگر وہ حجاز گئے بھی تو اُن کا قیام وہاں کچھ زیادہ نہیں رہا۔

اُس وقت جب شیخ مصر سے رخصت ہوئے، استانبول کے تاریک گوشوں میں جماعتِ احرار کچھ مشورے کر رہی تھی۔ اس زمانے میں ترکی کے عام حالات کی تصویر شیخ کی مساعی کے لیے ایک ضروری پس منظر ہے۔ لہذا اُن عام حالات کا ایک مختصر خاکہ پیش کر دینا مناسب ہوگا۔

سترہویں صدی عیسوی کے نصفِ آخر میں آلِ عثمان کا انحطاط شروع ہو گیا تھا۔ جس وقت تک محمد فاتح کے جانشینوں کی تلوار زنگ آلود نہ ہوئی تھی اس وقت تک یورپ میں اسلامی اقتدار غیر متزلزل رہا؛ لیکن جب سلاطین عثمانی نے مکر کھول دی اور تلوار کو ہاتھ سے رکھ دیا۔ اپنے گھوٹے اہطل میں باندھ دیے اور ساحلِ باسفورس پر سمندری موجوں کی موسیقی میں راحت و آرام تلاش کرنے لگے، اُن کے آفتابِ اقبال کا نور کم ہونے لگا۔ قصرِ شاہی میں اور قصرِ شاہی کے باہر بھی سیاہ اور سفید کے اختیارات رفتہ رفتہ "کزرِ آغاسی" اور "بتان جی آغاسی" کے ہاتھوں میں منتقل ہو گئے۔ آلِ عثمان کے تاجداروں نے قصرِ یلدیز میں عیش و عشرت کی زندگی کو میدانِ جنگ کی صعوبتوں پر ترجیح دی اور اس طرح یورپ کے دل سے محمد فاتح کی یاد محو ہونے لگی۔

اُسی زمانے میں دارالسلطنت میں "جاں نثار یوں" کی طاقت اس قدر زیادہ ہو گئی تھی کہ سلطنت اور حکومت کے نظم و اصلاح کے تمام دروازے ان سپاہیوں نے روک دیے۔ سلطان سلیم ثالث نے جب اندرونی اصلاحات

کی کچھ کوشش شروع کی تو وہ اس جرم کی پاداش میں جاں نثاریوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ سلیم ثالث کے قتل کے بعد جب محمد ثانی تخت نشین ہوئے تو ملک کی بد امنی اور نظم حکومت کی خرابی تقریباً لا علاج ہو چکی تھی۔ سر ویلہ آمادہ بغاوت تھا۔ مصر میں خدیو محمد علی مالک جزو کل ہو گیا تھا۔ عرب میں وہابیوں کی تحریک قوی ہوتی جاتی تھی۔ شاہی گورنر اپنے اپنے صوبوں میں آزاد اور خود مختار ہوتے جاتے تھے اور ہر طرف سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا تھا۔

پھر جب یونان نے بھی اطاعت کی زنجیریں توڑ ڈالیں اور آسٹریا، فرانس اور روس نے حکومت عثمانی پر زور ڈال کر اس کو آزاد کرادیا تو ۱۸۳۹ء میں مصر میں محمد علی نے بھی اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ اُدھر سلطان کے گھر کے دروازے پر روس نے آبنائے باسفورس کے متعلق اپنے لیے خاص خاص حقوق حاصل کر کے ترکی سلطنت کے سینہ پر ایک پاؤ بجا دیا۔ ان نازک حالات میں سلطان عبدالمجید نے ۱۸۳۸ء میں رشید پاشا کو اپنا وزیر اعظم مقرر کیا۔ رشید پاشا نے کسی نہ کسی طرح سلطان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ سلطنت کے دروبست کی اصلاح کی جائے۔ چنانچہ اصلاح کی تجاویز خط شریف کے نام سے شایع کی گئیں۔ اُن کا خلاصہ یہ تھا کہ :-

- ۱۔ تمام عثمانی رعایا کو جان و عزت کی طمانیت دی جائے۔
- ۲۔ محکمہ ٹیکس کی اصلاح کی جائے۔
- ۳۔ قانون مساوات قائم کیا جائے۔
- ۴۔ غلاموں کی تجارت کو مسدود کیا جائے۔
- ۵۔ سول اور فوج اور اقتصادیات کے جدید محکمے قائم کئے جائیں۔

اصلاحات کی یہ کوشش جاری ہی تھی کہ بیت المقدس میں سخت فساد برپا ہو گیا اور روس نے عیسائی باشندوں کی حفاظت کا بہانہ کر کے وہاں مداخلت شروع کر دی۔ اس طرح تجاویز اصلاح کا نفاذ رک گیا۔ اور یہی دول کا عین منشا تھا۔ ۱۸۷۷ء میں جنگ کریمیا شروع ہو گئی اور دو تین سال کی خونریزی کے بعد ۱۸۷۸ء میں عہد نامہ پیرس کی رؤ سے دولِ یورپ نے عثمانی حکومت سے بہت سے حقوق حاصل کر لیے۔ اس زمانے میں بھی عالی پاشا رشید پاشا اور فواد پاشا جیسے لوگ اصلاحات کے حامی موجود تھے لیکن ایک طرف تو سلطان اپنے خود مختارانہ اختیارات کی کمی کو پسند نہ کرتے تھے اور دوسری طرف دولِ یورپ کی ریشہ دو انیاں اتنی جہلت ہی نہ دیتی تھیں کہ اصلاحات کی تحریک کو بروئے کار لایا جاسکے۔ اگرچہ ۱۸۷۸ء میں پھر ایک دفعہ ان تجاویز کا اعلان کیا گیا اور ایک ”خطِ ہمایوں“ شایع ہوا۔ لیکن فی الواقعہ کوئی نتیجہ خیز کارروائی نہ ہو سکی اور سلطنت کے اندرونی حالات بد سے بدتر ہوتے رہے۔

۱۸۷۸ء میں سلطان عبد المجید خاں کا انتقال ہو گیا اور سلطان عبدالعزیز تخت نشین ہوئے۔ دولتِ عثمانیہ کے لیے یہ بہت ہی سخت مصائب اور خطرات کا زمانہ تھا۔ دولِ یورپ اور خصوصاً برطانیہ کے اثرات حاوی ہوتے جاتے تھے۔ ۱۸۷۸ء میں سلطان عبدالعزیز نے پیرس اور لندن کا سفر کیا اور اس سفر نے ترکی کی قیمت کا گویا فیصلہ ہی کر دیا۔ عہدِ جدید کی تاریخ ہم کو بتاتی ہے کہ اُس زمانے میں مشرق اور خصوصاً اسلامی تاجداروں کی سیاحتِ یورپ اکثر ان کی تباہی کا پیش خیمہ ہوتی تھی۔ خدیو اسماعیل، ناصر الدین شاہ، سلطان عبدالعزیز یہ سب یورپ ہی سے ایسی ”برکات“

لے کر واپس آئے کہ پھر دو دن بھی چین سے اپنے تخت پر نہ بیٹھ سکے۔ اس واقعہ کے نفیات اور فلسفہ سے قطع نظر کہ ان اوراق میں اس قسم کے مباحث کی گنجائش نہیں، مختصر یہ ہے کہ سلطان عبدالعزیز کو یورپ کے لالہ زاروں کی سیاحت راس نہ آئی !

فتنہٴ یمن کی وجہ سے ترکی حکومت سخت پریشان تھی جب شیخ نے سال۱۳۰۰ء میں آل عثمان کی سرزمین پر قدم رکھا۔ یہ وقت وہ تھا کہ ترکی کی تمام فضا تاریک تھی۔ لیکن اُسی ظلمت میں شیخ روشنی کی ایک خفیف شعاع دیکھ رہے تھے۔ ملک کے مصائب اور ابتلا سے زندگی کی حرارت آہستہ آہستہ پیدا ہو رہی تھی اور شیخ کو غالباً اچھی طرح معلوم تھا کہ۔

”بجلیاں برستے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں!“

عین اس زمانے میں جب کہ ترکانِ احرار کی جماعت کا پہلا سنگ بنیاد رکھا جانے والا تھا شیخ میدانِ عمل کو تیار کرنے کے لیے ہر سرِ موقع پہنچ گئے۔ اُس وقت اُن کو یہ تو معلوم نہ ہوگا کہ اُن کی آئندہ زندگی کا کس قدر زمانہ ملتِ عثمانی کی خدمت گزاری میں صرف ہونے والا ہے اور یہ کہ جب اُن کے تخیل کی تکمیل کا وقت آئے گا تو وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہوں گے اور نہ ان کو یہ معلوم ہوگا کہ جس سرزمین پر اُنھوں نے قدم رکھا ہے اُسی کی خاک میں اُن کو ۲۲ برس بعد دفن ہو جانا ہے۔ قدرت اپنے نقشوں کو کس قدر پوشیدہ رکھتی ہے ! قصہ مختصر شیخ اُسی وقت ترکی میں پہنچے جس وقت ان کو پہنچنا چاہیے تھا۔

قسطنطنیہ میں پہنچنے کے چند ہی روز بعد شیخ کی ملاقات عالی پاشا وزیرِ اعظم سے ہوئی اور پہلی ہی ملاقات میں بقول صاحب ”بیداری ایران“

”بقوتِ جاذبہٴ فضیلت و بیانِ چناں صدرِ اعظم را بسوئے خود جذب نمود کہ مافوق تصور نمی شود!“

شیخ کی اسی قوتِ جاذبہ نے بہت جلد عثمانی قوم کے امرا اور اکابر اور علما اور عوام کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ وزیرِ اعظم نے شیخ کے علم و فضل سے متاثر ہو کر ان کو امورِ معارف کی اصلاح کی غرض سے انجمنِ معارف میں شریک کر لیا۔

”درسمیتِ این مقام را از حضورِ سلطان برائے اش چہل کردہ“^{۵۵}
چند ہی روز بعد ”انجمنِ دانش“ کے رکن بھی بنائے گئے۔ انجمنِ معارف میں شیخ کو اپنے خیالات اور اصلاحی تجاویز پر عمل کرنے کا کافی موقع ملا اور رفتہ رفتہ انھوں نے اربابِ بصیرت کے قلوب پر اپنا نقش قائم کر لیا۔
”سید در مدتِ قلیل با اصلاحاتِ معارف آں جا موفق شد ویکسر صورتِ تازہ بہ آں بخشید۔ طرزِ تحصیل و پروگرام را تغیر دادہ یک طریقہٴ خاص و موزوں و معقوے را مقرر نمود۔ کلاسہائے فنی را ایزاد کرد و در جماعِ علمیہ لائق ہائے عزہ و خطابہ ہائے پُرجوش دایر بمطالبِ علمی، صنایعِ اقتصادیات، تجارت، اتحادِ مسلمین و اشکالِ مشرق و غیرہ ایزادی فرمود۔۔۔
رفتہ رفتہ حینِ صوتِ وک در تمامِ اقطارِ ترکیہ نفوذ کردہ اہالی برائے شنیدنِ خطاب ہا و فرمایشات بہ بابِ عالی می شتافتند و سید ہم اوقاتے را برائے افادہٴ عمومِ معین کرد بلا فاصلہ ببطائے کانفرنس ہا و اجسرائے معاوضہ می پرداخت۔ اہالیِ ترکی والہ و مفتونِ فضائل و کلامِ سحر آفرین شدہ ہمیشہ بہ در او مجتمع و از وک مدح و تمجید می کردند۔ خطابہ ہائے او را

”سحر القلوب“ نام نہادہ بودند“

دائرہ معارف کے علاوہ بھی جامعہ کبیر سلطان احمد اور اباصوفیہ میں انھوں نے دینی اور اجتماعی مواعظ کا سلسلہ جاری کر دیا اور ”سحر القلوب“ کی آواز ترکی سے نکل کر شام و عراق و حجاز تک پہنچنے لگی۔ لیکن ہر دلعزیزی شہرت اور مقبولیت کے اس درجے پر اس قدر جلد پہنچ کر اُن کو ترکی کے قدامت پسند علما کی ایک سخت ہنکمر برداشت کرنی پڑی۔ ہوا یہ کہ شیخ کا فلسفہ اسلام ترکی علما کی ایک مقتدر جماعت کے لیے سخت ناپسندیدہ تھا۔ گوکہ عوام کی ایک جماعت شیخ کی طرف مائل تھی لیکن عوام کا یہی رجحان شیخ الاسلام کے گروہ کو سخت ناگوار گزرا۔ جیسا کہ ہونا چاہیے تھا اُن کی وسعت خیال اور بلند عزم جس کا اظہار وہ اپنی تقریروں میں کرتے تھے، شیخ الاسلام کی نظر میں بدعت قرار پائی۔ علاوہ بریں وہ گروہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ اگر شیخ کی ہر دلعزیزی اسی طرح بڑھتی رہی تو قدامت پسند علما کا اقتدار اُسی نسبت سے گھٹتا رہے گا۔ اور بالآخر اس جماعت کی مطلّیت کو سخت صدمہ پہنچے گا لہذا کچھ تعجب نہیں کہ استانبول کے علما کا کلیسائی اقتدار شیخ کے خلاف شمشیر بکف کھڑا ہو گیا۔

سلطان عبدالمجید کا یہ آخری زمانہ تھا اور تحسین آفندی اُس وقت جامعہ قسطنطنیہ کے صدر تھے۔ وہ اُس زمانے کے وسیع النظر علما میں سے ایک تھے اور شیخ کے خیالات کی قدر کرتے تھے۔ ان کے علاوہ جماعت علما میں سے دوسرے شخص سلیمان بٹنی تھے۔ جو اپنے علم و فضل کی وجہ سے مرجع خلائق تھے اور شیخ کی تعلیمات کو دل سے پسند کرتے تھے۔ منیف پاشا

نہ اعظمی - درمہ کابل۔

وزیر تعلیمات بھی شیخ کے قدر دانوں میں سے تھے لیکن ان سب کی متحدہ طاقت بھی شیخ الاسلام اور اس کے حاشیہ نشینوں کی ریشہ و دانیوں کا مقابلہ نہ کر سکی۔ اگر سوال صرف فلسفہ مذہب ہی کا ہوتا تو شاید اس جماعت کو شیخ پر حملہ کرنے کا موقعہ بمشکل مل سکتا، لیکن شیخ اپنے نصب العین کو دل میں رکھ کر کام کرنے کے عادی نہ تھے۔ اس کو اُن کی خوبی سمجھیے یا ان کا عیب بے باک وہ اس قدر تھے کہ کسی شخص یا جماعت سے کبھی مرعوب نہ ہوتے تھے۔ یہی باتیں اُن کے مخالفین کی تقویت کا باعث ہوئیں۔ اپنے لیکچروں میں شیخ اکثر مطلقیت اور شہنشاہیت پر بھی اعتراضات کیا کرتے تھے اور یہی اعتراضات باب حکومت اور شہنشاہیت پرست وزرا کو مشتعل کرنے کا باعث ہوئے۔ رمضان ۱۳۸۵ء میں شیخ نے دار الفنون مسجد فاتح سلطان محمد میں ایک تقریر کی اور اس تقریر سے ایک طوفان اُٹھا جس نے قسطنطنیہ میں شیخ کا قیام نامکن کر دیا۔ اس تقریر کے متعلق مختلف اور متضاد بیانات ہمارے سامنے ہیں اور افسوس یہ ہے کہ وہ سب نہایت مجمل بلکہ بعض نہایت مہمل بھی ہیں کسی بیان سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ وہ مطالب کیا تھے جن کو علمائے قابل اعتراض سمجھا اور جن کی بنا پر شیخ کے خلاف کُفر کا فتویٰ تک تیار ہو گیا۔ جس طرح کہ آج اُسی طرح اُس زمانے میں بھی علماء سُو حق کے مقابلے میں اپنی شکست کا اعلان کُفر کے فتوؤں سے کیا کرتے تھے۔ بہر حال ہم چند بیانات کو مختصراً اس جگہ درج کئے دیتے ہیں:-

۱۔ شیخ نے دورانِ تقریر میں چند اشعار کے مطالب بیان کیے اور وہ مطالب قابلِ اعتراض سمجھے گئے۔ اشعار یہ تھے کہ

علم حق در علم صوفی گم شود ایں سخن کے باورِ مردم شود
علم صوفی حادث و حق از قدیم ایں چناں در فہم آید لے سلیم

۲۔ در ماہ رمضان المبارک ۱۲۸۵ھ ہجری مدیر عمومی دار الفنون
یک کونفرنسے بدہد - مثلاً الیہ اگرچہ ضعفِ زبان ترکی را عذر قرار دادہ
آما بہ سبب اصرارِ خواجہ تحمین آفندی بالمجوریہ بہ اعطائے یک کونفرنس
را قبول کردہ مباحثہ آں را نوشتہ بنا بر معارف صفوت پاشا تقدیم
نمود - موضوع کونفرنس از طرف نظارت معارف و از طرف مجلس معارف
باممنونیت تفویض کردہ شد " ۵

۳۔ بنا بر علیہ وقتے کہ سید جمال الدین افغانی بہ منبر خطابہ برآمدہ و
ایراد نطق می نمود ، شیخ الاسلام حن فہمی افندی بہ امید یافتن یک
خطا تماماً وضعیت یک مترقب را گرفتہ بود - سید جمال الدین افغان دریں
کونفرنس خود معصیتِ انسانہ را بہ یک " بدن حی " تشبیہ و تہام صناعت
را بموقعہ یک یک عضو نشان می داد - از جسم و روح بحث کردہ وقتے
کہ مسئلہ بفرق بین نبوت و حکمت انتقال کرد ، گفت ، حضرت نبوت
موجبہ الہیہ است تا کہ بکست بدست آورده نمی شود - یَخْشَى اللّٰهُ يَهَامُنُ
يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يُجْعَلُ رِسَالَاتِهِ :- باری تعالیٰ بدرجہ
نبوت کے را می خواند از بندگانش امتیاز و اختصاص می دہد - ہم چنین
ذاتِ خداوندی داننا تر است بہ ایں کہ شخصے را بہ رسالت خود انتخاب
می نماید - فقط حکمتِ فکر و نظر با معلومات می توان بدست آورده شود ،
بین نبی و حکیم ایں چنین یک فرق نشان داد - نبی از خطا معصوم است -

۵۔ اخبار وطن قسطنطنیہ ۳ اگست ۱۹۳۴ - ۵۶۲ - اخبار وطن قسطنطنیہ - ۳ اگست ۱۹۳۴

فقط حکیم خطا می توں کرد۔ احکام نبوت چوں بالائے حکم الہی موسس است۔ دریں راہ بہ ہیچ یک صورتِ باطل صدور نمی کند و عمل کردن بہ ایں از فرائضِ ایمان است۔ فقط بیایم بہ مسئلہ حکما۔ اتباع ایں ہا اصلاً جائز نیست۔ تنہا آہنائے را کہ افضل وادے باشند، تفریق کردہ بہ آن افکار تبعیت می توں کردہ شد کہ ایں برائے قسمے کہ شایانِ اتباع باشند ہم شرط یگانہ کردم۔ مخالف نہ بودن آرا مذکورہ است بشرعِ الہی۔

ایں سخن ہا سید جمال الدین افغانی بہ سخن ہائے و نوشتہ ہائے تمام علمائے اسلامیہ موافق بود۔ فقط تنہا شیخ الاسلام بہ سببِ رقابتے کہ بہ نسبت سید داشت، بر علہ او برآند کہ سید جمال الدین نبوت را بہ مرتبہ ضاعت فرد آورده و برائے اثباتِ سخن و موضوع کانفرنس ضعت و ضاعت بود۔ برائے ایں ہم از نبوت بحث کردن ان را ہم بہ اعداد ضایع داخل کردن است۔ گفتہ اشاعت کرد حتی دریں خصوص بر علہ سید جمال الدین افغانی از طرف وکیل درس ہا یک رسالہ نیز تحریر گرفتہ شدہ بود۔

ایں را رنگ رنگ روایت می کنند۔

در اثنائے کہ جمال الدین افغانی دائر بہ صنعت و بضاعت کانفرنس مذکور را اعطای کرد، ایں را ہم گفت کہ "وقت ایں نیست کہ تنبل و مسکین بہ نشینیم۔ باید کہ بگوئیم زیرا ہر کسے تنہا بسا بہ کوشیدن می تواند و بہر مقصدے کہ داشتہ باشد، برسد۔ حتی حضراتِ انبیائے کرام عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام ہم وقتے کہ نہ کوشیدہ اند، و زحمت نہ کشیدہ اند، عقب ماندہ اند" ایں سخن جمال الدین از طرف شیخ الاسلام و طرفداران او بہ ایں صورت

تحریف کرده شد کہ " انسان باکوشیدن پیغمبر می شود " و به ایس ترتیب بر مخالفت سید جمال الدین افغانی بر آمدند " ۳۱

۳۲- سید جمال الدین افغانی در دار الفنون مُعَلِّم بود- تحمیل آفندی در اثنائے کہ

با ایس رفیق خود برابر برائے مرتبه افکار خلق خدمت می کردند بصورت غیر منظر، دو چار فلاکت شد- در وقتِ صدارت عالی پاشا یک روز سید جمال الدین افغان در دار الفنون یک درس عمومی می داد- خواجہ تحمیل آفندی ہم در کرسی تدریس با او حاضر بود- مشارالیه ایس ہارا بطلبہ می نہانید- ہوائے نیچے و تنفس باعثِ اصلی حیات می باشد-

تقریرات و تبیینات خود را با تجربہ ثابت کردن خواستہ بزرگ یک فانوس یک کبوتر نہاد - فانوس چوں با ہوا پر بود - کبوتر با الطبع طسیدن و پریدن خواست - در عقب ایس دقتی کہ ہوائے فانوس تنخیدہ کردہ شد - کبوتر اکنوں موقوف سکونت می ایستد و اثر حیات نشان نمی داد - پس ازیں تجربہ معروضہ کہ ہر روز در خانہ تکرار کردہ می باشد - انعامات و ملاحظات مہتممہ کہ سید جمال الدین افغان می داد از طرف خلق تفسیر یافتہ بنا بریں دار الفنون بند گردید- ہجوئے کہ بر سید جمال الدین افغان جریاں یافت ، تنہا بہ ایس قدر کفایت نہ کرد - در یکے جوامعہ شریفہ سلطان احمد اباصوفیہ از کتاب " اجار علوم الدین " فیلسوف اسلام امام ابو محمد غزالی کہ بہ نسبت شان خیلے احترام داشت ، راجع بہ علمائے سو یک موعظۂ آن را ایزاد کرد- الحاصل سید جمال الدین افغان کہ دریں کونفرس موعظۂ خود بقدر ذرۂ ہم از حدود شریعت تجاوز نہ کردہ بود ، تکفیر کردہ باشد چوں

مسئلہ علامہ مشار الیہ باخبر گردید، گفت: ”آں ہمارا مخیر می کنند و من ہم آنہارا“ ابن سینا در وقتِ مخیرِ او چیزها گفته بود۔

در دہر چوں من یکے و آں ہم کافر

پس در ہمہ دہر یک مسلمان نبود

من ہم بہ ایں صورت یک جواب قطعی دارم۔

اکنون برائے شیخ الاسلام حن فہمی افندی کہ یک بہانہ خوب پیدا شدہ بود، برائے تمام واعظان کہ در جوامع ایراد موعظہ می نمودند۔ بریں صورتِ تعلیم ایں را فہمائید کہ سید جمال الدین افغان نشرِ افکارِ فاسدہ می کند۔ در مقابلِ آن سید جمال الدین برائے مدافعہ برخاستہ۔ اما چوں برائے حل و فصلِ آں می بایست مسئلہ با شیخ الاسلام محاکمہ می شد، لہذا طلبِ محاکمہ نمود۔ بنا بریں موجبِ حدّثِ شیخ الاسلام گردید۔ جرایدِ آں وقت ازیں اختلاف دور و دراز بحث کردند۔ بعضے از جراید طرفِ شیخ الاسلام را و بعض از اں طرفِ جمال الدین افغان را التزام کردند۔ مسئلہ بسیار و خاست پیدا کرد بدرجہ کہ حلّ آن متوقف بہ امرِ صدارتِ عظمیٰ بود تا ایں کہ صدرِ اعظمِ عالی پاشا مفارقتِ سید جمال الدین را برائے چندے ماہ از استانبول لازم دانستہ بالمجبور بمشارِ الیہ تکلیف کرد۔ ازاں جائے کہ جمال الدین دریں مسئلہ ذکیق بود، اولاً در برابرِ ایں مغلوبیتِ ناحق را بسیار حدّث و شدّت نمودہ فقط بہ سببِ امتثالِ امرِ صدارتِ عظمیٰ در اوایلِ ماہِ محرم ۱۲۸۶ھ ہجری از اسلامبول بہ طرفِ مہر حرکت نمود۔

۱۲۸۶ھ محمد علی توفیق بک در کتاب رسداز زیر سر لوطہ مقالہ ”بدیع شعر“ صفحہ ۳۶۴ شماره ۴

۵۔ چوں روزِ موعود رسید جمعیتِ بے حساب اعیان و اشراف و علما و وزرا و سائر طبقات در دارالفنون اجتماع یافتند۔ پس سید بالائے مہر آمد و شروع بہ تکلم نمود۔ خطابہ را چنان بفصاحت و بلاغت بہ آخر رسانید کہ مردم را مات و مہبوت بہ آن سحر بیان نمود۔ روسائے اہل علم را بعضے آرائے سید در ترویج ضاعت و معارف خوش نہ آمد و مطلب را بہ شیخ الاسلام رسانیدند۔ مشائرا علیہ را نظر بہ کدورتِ سابقہ فرصت داد و راہ بہانہ بدست آمدہ تبعید سید را از سلطان استدعا نمود۔ و پس از بابِ عالی چنین حکم صادر گردید کہ برائے اسکاٹ فتنہ و رفع غایبہ سید چند ماہ از اسلامبول ہاجرت اختیار کنند و پس از آرامے و سکوت مردم اگر میل نمود باز معاودت نماید“ ۷۶۴

۶۔ شیخ نے ایک لکچر وزیر سلطنت کی فرمائش پر دیا تھا۔ جس میں کہا تھا کہ خدائے تعالیٰ نے مخلوق میں کاموں کو تقسیم کر دیا ہے۔ کوئی طبیب ہے کوئی ہندس ہے کوئی صنّاع ہے۔ اس لکچر میں اس وقت کے بعض علما شریک تھے انھوں نے اس کا یہ مطلب بیان کیا کہ جمال الدین نے نبوت کی توہین کی ہے۔ جمال الدین نے کہا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ امام غزالی کا خیال ہے اور مجھ پر تہمت ہے لیکن علما اور صوفیا کے ہجوم کی وجہ سے بعض وزرا نے شیخ کو مشورہ دیا کہ وہ چلے جائیں۔ ان وزرا نے یہ بھی کہا کہ ہم خود لوگوں کی اصلاح چاہتے ہیں، مگر معلوم ہوتا ہے کہ ہماری قوم ابھی اصلاح کے لیے تیار نہیں ہے“ ۷۶۵

۷۔ حاجی یونس وہبی نے جو اس وقت کے مشہور علما میں سے تھے

اور اس مجلس میں موجود تھے، شیخ کی تقریر کے غلط معنی پیدا کیے اور حسن فہمی افندی شیخ الاسلام کے ذریعے سے اُن کو سلطان تک پہنچایا گیا اور یہ سمجھایا گیا کہ شیخ کا انداز بیان شہنشاہیت اور مطلقیت کے بہت خلاف تھا اور ایسا تھا جس سے عامۃ المسلمین کے جذبات بھڑکنے کا اندیشہ ہو سکتا ہو۔ یونس افندی نے بعد میں اپنی اس بد اعمالی اور شیخ کے خلاف سازش کرنے کا اقبال بھی کیا اور وہ اپنے اس فعل سے تائب ہوئے۔ ۷۷

ان تمام بیانات سے یہ معلوم کرنا تو تقریباً محال ہو کہ شیخ کی وہ تقریر تھی کیا جس سے یہ سارا فتنہ برپا ہوا۔ البتہ یہ حقیقت واضح ہوتی ہو کہ اصلی جھگڑا شیخ اور شیخ الاسلام کے درمیان تھا اور موخر الذکر نے شیخ کو نقصان پہنچانے کے لیے ان کے خلاف کوئی الزام تراشا۔ مندرجہ بالا بیانات میں شیخ کی تقریر کے جن الفاظ کی طرف اشارے کیے گئے ہیں ان میں سے اکثر الفاظ مہمل اور بے معنی سے معلوم ہوتے ہیں۔ شیخ نے نبوت کی توہین کی، یا امام غزالی کے فلسفہ کو اپنی بحث میں پیش کیا، یا علمائے دقت پر نکتہ چینی کی، یا شہنشاہیت اور مطلقیت پر اعتراضات کئے۔ جو کچھ بھی انھوں نے کیا یا کہا اس کی نوعیت اور اصلیت کا تعین نہیں کیا جاسکتا اور نہ ان بیانات سے یہ امر واضح ہوتا ہو کہ فی نفسہ وہ مسئلہ کیا تھا جس پر علمائے اعتراض کیا۔

”رد علی الدہرین“ کے مقدمے میں بھی اس واقعہ کی طرف اشارہ

کیا گیا ہو مگر وہاں بھی سلسلہ واقعات کی کوئی تشریح و توضیح نہیں کی گئی۔

البتہ اگر ان بیانات سے کوئی امر صاف طور پر سامنے آتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ قسطنطنیہ کے قدامت پسند علما سے شیخ کی ٹکڑ ہوئی اور اُن کو اسی وجہ سے استانبول سے رخصت ہونا پڑا۔ اس قضیے کے اسباب کی قدرِ قلیل وضاحت دو مستند بیانات سے ہوتی ہے۔

بزنٹ نے اپنے روز نامے میں براؤن کے حوالے سے لکھا ہے کہ "جمال الدین کا نقطہ نظر درحقیقت ان کا اپنا ہی نقطہ نظر تھا، وہ قسطنطنیہ میں اس وسعت خیال کے بانی تھے جو مدت کے دستور اساسی میں نمایاں ہوئی۔ قسطنطنیہ میں شیخ کے بڑے حامی عالی پاشا اور فواد پاشا تھے۔ شیخ الاسلام ان کے مخالف تھے۔ اور ان کے متعلق ایک دفعہ شیخ نے مجھے یہ واقعہ سنایا تھا کہ جب شیخ پہلی دفعہ قسطنطنیہ گئے تو شیخ الاسلام کے یہاں بغرض ملاقات تشریف لے گئے وہاں انھوں نے دیکھا کہ ساری دنیا شیخ الاسلام کے سامنے رکوع کی حالت میں ہے مگر شیخ نے اس کی کچھ پروا نہ کی۔ وہ بڑے چلے گئے اور نہایت بے پروائی اور جرات کے ساتھ شیخ الاسلام کے پہلو میں جا بیٹھے۔ شیخ الاسلام جمال الدین کی اس جسارت کو کبھی نہ بھول سکے اور آخر کار ایک لیکچر کا بہانہ کر کے ان کے کفر کا اعلان کرادیا۔ جب کفر کا اعلان کیا گیا تو شیخ عالی پاشا کے پاس پہنچے اور مطالبہ کیا کہ ایک عام مجلس میں ان کا اور شیخ الاسلام کا مناظرہ کرایا جائے۔ مگر عالی پاشا اس درخواست کو منظور نہ کر سکتے تھے۔ صوفیا کی جماعت میں سخت شور و شغب برپا ہوا۔ اور اس لیے شیخ کو مشورہ دیا گیا کہ وہ حج کرنے چلے جائیں۔"

صرف ایک اور ذریعے سے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے:-
 ”شیخ الاسلام آں وقت احسن فہمی آفندی، خیلے مخالف جلال الدین
 افغان بود۔ ایں شخص بیچارہ از شہرت ایں ذات بابرکات بہ اندیشہ کہ مبادا
 شیخ الاسلامی ز دستش بگیرد، ترسیدہ دینا بریں رقیب او بودہ“ ۷۶
 قصہ مختصر ان اوراق کے جن پڑھنے والوں کو شیخ کے حالات
 سے اُن کی طبیعت کا اندازہ ہو گیا ہوگا وہ بہ آسانی یقین کر لیں گے کہ
 بلنٹ کا بیان شیخ الاسلام کے پہلو میں جا بیٹھنے کے متعلق غلط نہیں
 ہو سکتا اور شیخ کے مزاج کی حدت اور شدت کے باعث اس قضیے
 کا بڑھ جانا بھی بعید از قیاس نہیں ہے۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ شیخ
 کا لہجہ شہنشاہیت اور مطلقیت کے خلاف رہا ہو اور اسی بنا پر شیخ
 الاسلام نے سلطان کو ان کے خلاف بھڑکا دیا ہو۔ ہم کو معلوم ہے کہ
 شیخ کی زبان ایک شمشیر بے نیام تھی اور وہ جو کچھ دل میں ہوتا تھا
 اس کو صاف صاف کہا کرتے تھے اس لیے اس قسم کے کسی قضیے کا
 پیدا ہونا ذرا بھی تعجب انگیز نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ قسطنطنیہ کے دورانِ قیام میں شیخ کی شخصیت کے
 خدو خال بالکل واضح ہو گئے۔ ان کی جرات اور بے باکی، ان کی قابلیت
 اور قوتِ ایمانی اور قدامت پرستوں کے خلاف اُن کے شدید جذبات
 یہ سب چیزیں جو ان کی سیرت کا نمایاں جزو ہیں، قسطنطنیہ کے دورانِ
 قیام میں برسرِ عام آگئیں۔ دوستوں نے سمجھ لیا کہ شیخ کسی حال میں ہٹل
 کی قوتوں سے سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں اور دشمنوں نے جان

لیا کہ وہ دنیا کی کسی طاقت سے مرعوب نہیں ہو سکتے۔ شیخ کو بھی اپنی زندگی میں پہلی دفعہ قدامت پسند طبقے کی قوت کا اندازہ ہو گیا اور اس زمانے کے تنگ خیال علما سے ان کا یہ پہلا تصادم ان کی زندگی کا ایک نشان راہ بن گیا۔ اسی وقت انھوں نے محسوس کر لیا ہو گا کہ عالم اسلامی کے حالات کی اصلاح کا کام قدیم علما کی اصلاح سے شروع ہونا چاہیے۔ ان کا یہ تجربہ ایران میں ان کے کام آیا جہاں باوجود اپنی قدامت پسندی کے علما کی ایک بہت بڑی جماعت ان کے ساتھ ہو گئی تھی۔ اسی طرح ”مطلقیت“ اور ”شہنشاہیت“ کی قوت سے بھی ان کو پہلی دفعہ قسطنطنیہ میں واسطہ پڑا اور جو کچھ انھوں نے وہاں دیکھا وہ آئندہ زندگی میں ان کے سیاسی عقائد کا رہنما تھا۔

مرزا لطف اللہ کا بیان ہو کہ علاوہ شیخ الاسلام کی مخالفت کے خود سلطان اور ان کے وزیر شیخ کی سیاسی دلچسپیوں سے متوحش ہو گئے تھے اور فتنہ یمن کے سلسلے میں ان کے طرز عمل کو ارباب حکومت نے اچھی نظر سے نہیں دیکھا تھا۔

”سید متعبد اصلاح آل (فتنہ یمن) می شود بدون مخارج وقشون مشروط بر اینکه پس از اصلاح محضرے بہ امضائے سلطان و اولیائے دولت و ملت اصلاح آن امر را بدست سید تصدیق کنند“

یہ تو ناممکن تھا کہ شیخ بغاوت یمن اور دیگر سیاسی حالات کے متعلق خاموش رہے ہوں اور یہ بھی بالکل قرین قیاس ہو کہ ان کے خیالات ارباب حکومت کو پسند نہ آئے ہوں اس لیے مرزا لطف اللہ کا یہ خیال کہ شیخ کے قسطنطنیہ سے خارج کیے جانے کا باعث علاوہ

شیخ الاسلام کی مخالفت کے خود شیخ کے سیاسی خیالات بھی تھے، غلط نہیں معلوم ہوتا۔ غرض یہ کہ جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، حکومت کی طاقت سے بھی شیخ قسطنطنیہ میں آشنا ہو گئے اور اب تجربے کی ایک نئی روشنی لے کر وہ پھر مصر کی جانب متوجہ ہوئے۔

آغاز ۱۸۸۷ء میں شیخ نے رختِ سفر باندھا لیکن قسطنطنیہ میں وہ اپنی تعلیمات کے لازوال نقوش بہت سے دلوں پر چھوڑ گئے۔

مصر۔ دوسرا سفر | دل میں سفرِ حج کا خیال تھا لیکن اب وہ دوسرے حج اکبر کی تیاریوں میں مشغول ہو چکے تھے اور اسی کے ارادوں کو دل میں لے کر وہ ترکی سے سیدھے مصر آئے جہاں وہ ۲۲ مارچ ۱۸۸۷ء کو پہنچے اور اسی تاریخ سے مصر اور دنیائے اسلام کی سیاسی زندگی میں ان کی شخصیت پوری طرح نمایاں ہو گئی اور اسی نقطے سے ان کی شہرت بین الاقوامی اہمیت حاصل کرنے لگی۔

شیخ جس وقت دوبارہ مصر میں داخل ہوئے تو خدیو اسماعیل بہرِ حکومت تھا۔ سلطان ترکی کی سیادت محض برائے نام باقی رہ گئی تھی انگریزوں اور فرانسیسیوں کے قدم آگے بڑھتے آتے تھے۔ نہر سوئز کا افتتاح ہو چکا تھا اور یورپین سیاست کی یہ سب سے بڑی زنجیر مصر کے گلے میں پڑ چکی تھی۔ اسماعیل کی بد اعمالیوں نے ملک اور رعایا کو تباہ حال کر دیا تھا جن کے کندھوں پر خدیو کی فضول خرچیوں کا ایک پہاڑ رکھا ہوا تھا۔ اس وقت مصر کا قومی قرضہ ساڑھے نو کروڑ پونڈ تھا اور اپنی حکومت کے ہر سال میں اسماعیل اس قرضے کو ستر لاکھ پونڈ کے اوسط



اسماعیل پاشا، خدیو مصر ۱۸۶۳—۱۸۷۹

سے بڑھا رہا تھا ! - نلاصین قحط کے عذاب میں مبتلا تھے - یورپ کے سرمایہ دار اور سامہوکار اپنے منافع اور سود کے وصول کرنے کی فکریں کر رہے تھے اور باوجود ان کے سخت تقاضوں کے اسماعیل دیوایسے کی فضول خرچیاں کم نہ ہوتی تھیں - اس تباہ کن عہد کے آخری ۸ سال شیخ نے اپنی آنکھوں سے دیکھے - یہی وہ زمانہ تھا جب دولِ یورپ نے یورپین قرضخواہوں کی خاطر قرضہ کی ادائیگی کا انتظام کرنے کے لیے ایک کمیشن مقرر کر دیا تھا اور مصر کی مالی حالت کی نگرانی انگریزوں اور فرانسیسیوں نے اپنے ذمے لے لی تھی - اس کمیشن کا اصلی مقصد یہ تھا کہ مصر کے محاصل پر دول کا قبضہ قائم ہو جائے - اسی زمانے میں اسماعیل نے نہر سوئز کے حصص بھی فروخت کر ڈالے - اس کو سوائے اس کے کسی بات کی فکر نہ تھی کہ خرچ کرنے کے لیے کافی روپیہ کسی نہ کسی طریقہ سے ملتا رہے - حصص فروخت ہو جانے کے بعد نہر سوئز کے معاملات میں مصری حکومت کا کوئی دخل باقی نہ رہا اور وہ فولادی زنجیر بالکل مکمل ہو گئی جس سے دول نہ صرف مصر کو بلکہ تمام مشرقی ایشیا کو باندھنا چاہتی تھیں - بلاشبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ خدیو اسماعیل کی زندگی نہ صرف اپنے لیے بلکہ دوسروں کے لیے اور نہ صرف مصر کے لیے بلکہ غیر ممالک کے لیے بھی ایک لعنت ثابت ہوئی - اس طرح ۱۸۶۵ء اور ۱۸۸۵ء کا درمیانی زمانہ مصر کے مصائب کا بدترین زمانہ تھا اور یہی وقت مصر میں شیخ کی جد و جہد کا وقت تھا - مصر کے اس دورِ ابتلا میں شیخ نے وہاں کی مظلوم اور خستہ حال رعایا کو مطالبہ حقوق اور عزت نفس کا سبق دینا شروع کیا اور شیخ کے لیے اس وقت

دنیاۓ اسلام کی یہ تاریکی ایک زبردست پیامِ عمل بن گئی۔ وہ دیکھ رہے ہوں گے کہ ترکی جو ایک زمانے تک مسلمانانِ عالم کی نظروں اور امیدوں کا مرکز تھا، اب بسترِ مرگ پر پڑا ہوا ہے۔ روس کی فوجیں قسطنطنیہ کے دروازے پر ملت عثمانی کی موت کا نقارہ بجا چکی تھیں۔ برلن میں دولِ یورپ کی خفیہ کانفرنس اسلامی ممالک اور خصوصاً ترکی اور مصر کی قیمت کا فیصلہ کر چکی تھی، قبرس پر برطانوی قبضہ تسلیم کیا جا چکا تھا، فرانس کو تونس پر قبضہ کر لینے کی اجازت دی جا چکی تھی، شام میں فرانس کے حقوق کو برطانیہ نے تسلیم کر لیا تھا۔ ان حالات میں خدا جانے شیخ کا درد مند دل کس قدر بے چین ہوگا۔ ترکی کی طرح مصر میں بھی قومی مصائب اور ابتلائے قوم پرستوں کی ایک مختصر اور کم زور جماعت پیدا کر دی تھی اور غالباً اسی ایک خفیہ شعاعِ امید کے بھروسے پر شیخ نے مصر میں کام کرنے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ مصر پر دولِ یورپ کی گرفت اس قدر سخت ہوتی جاتی تھی کہ نالایق اسماعیل بھی اس کو محسوس کرنے لگا تھا اور گھبرا گھبرا کر قوم پرست جماعت سے امداد کا خواہاں ہوتا تھا۔ اپنے ملک کو تباہ کر ڈالنے کے بعد اب جو اس کو ہوش آچلا تھا تو وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر اس فکر میں تھا کہ کم از کم قوم پرستوں کی جماعت کو اپنا معاون بنائے اور آئینی اصلاحات نافذ کر کے اس گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالے، لیکن یورپین مدبرین اور ساموکار بھی غافل نہ تھے، وہ جانتے تھے کہ اگر خدیو نے مصری رعایا کو آئینی حقوق دے دیے تو یا تو پارلیمنٹ بہت سے قرضوں کی ادائیگی سے انکار کر دے گی

یا کم از کم اُن کی ادائیگی میں مزید مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ اس طرح اپنے روپے کو ڈوبتے ہوئے دیکھ کر یورپین سامہوکاروں نے مصر میں آئینی اصلاحات کا نفاذ روکنے کے لیے انتہائی سیاسی اثرات سے کام لینا شروع کیا۔ ان مشکلات میں مصر کی قوم پرست جماعت بھنسی ہوئی تھی اور اس نازک زمانے میں جمال الدین جیسے داعیِ حق کا مصر میں آجانا ایک فالِ نیک سمجھا گیا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہو کہ اگر اس زمانے میں شیخ نے مصر میں قومی تحریک شروع کر کے علمائے اہل ہر اور قوم پرستوں کے اندر ایک نئی روح پیدا نہ کر دی ہوتی تو یقیناً اسی زمانے میں مصر کا خاتمہ ہو چکا ہوتا۔ آئندہ سطور میں شیخ کی اس جدوجہد کو جو انہوں نے مصر میں شروع کی، اسی نقطہ نظر سے دیکھیے۔

پہلی دفعہ ۴۰ دن کے مختصر قیام میں شیخ نے جو نقوش مصریوں کے قلوب پر ثبت کیے تھے وہ ایسے نہ تھے جو مٹ جاتے۔ اسی لیے جب دوبارہ شیخ مصر میں آئے تو ان کو اپنے کام کے لیے بہت کچھ مواد تیار ملا۔ مصر میں داخل ہونے کے چند ہی روز بعد اُن کے فضل و کمال کا شہرہ ریاضِ پاشا وزیرِ اعظم کے کانوں تک پہنچا۔ پہلی ہی ملاقات میں شیخ کی شخصیت نے ان پر اتنا اثر چھلایا کہ خود وزیرِ اعظم کی طرف سے اصرار کیا گیا کہ شیخ زیادہ عرصہ تک مصر میں قیام فرمائیں۔ دوسری طرف طلبائے اہل ہر کی جماعت متمنی ہوئی کہ شیخ مصر میں مستقل قیام کا ارادہ کر لیں۔ خدیو نے بھی ریاضِ پاشا کی تحریک پر شیخ کے لیے ہزار غروش مصری ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا جو بقول براؤن "کسی خاص خدمت کے معاوضے میں نہیں

بلکہ ایک معزز مہمان کی عزت افزائی کی غرض سے ”مقرر کیا گیا تھا۔ اپنا سجادہ بچھاتے ہی شیخ نے سب سے پہلے ازہر کی طرف توجہ کی۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ ان کی تحریک اگر ازہر میں کامیاب ہوگئی تو گویا سارے ملک میں کامیاب ہوگئی۔ ایک طرف تو وہ علما کی طاقت کو شریک حال کر کے اُس سے کام لینا چاہتے تھے۔ اور دوسری طرف ان کی نظر مصر کی نئی نسل پر جمی ہوئی تھی جو ازہر کے مصلوں کے گرد جمع تھی۔ اپنی سیاسی جدوجہد میں ہر جگہ شیخ نے علما اور نوجوان نسل سے کام لینے کی کوشش کی اور ایران میں تو ان کی کامیابی کا اصلی راز یہی تھا۔

ازہر میں شیخ کی زندگی کی جو تفصیلات حاصل ہو سکیں، وہ بہت دل چسپ ہیں۔ شروع شروع میں وہ جامعہ کے اندر ہی درس دیا کرتے تھے۔ لیکن بعد کو طلباء ان کے مکان پر جمع ہونے لگے۔ اس وقت ازہر کا نصاب تعلیم وہی قدیم نصاب تھا جو زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں اور لوگوں کی بدلتی ہوئی ذہنیت سے بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ جدید علوم کی تعلیم ایک بدعت سمجھی جاتی تھی اور مغربی علوم کی روشنی کے لیے تمام راستے بدستور بند رکھے گئے تھے۔ شیخ نے سب سے پہلے بوعلی سینا کی کتابیں نصاب میں داخل کرائیں اور ان کا درس دینا شروع کیا۔ اسی کے ساتھ وہ فلسفہ اور علم الافلاک اور تصوف پر بھی لیکچر دیتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اُس زمانے میں شیخ کے شاگرد ان کے خطبات اور لیکچروں کا ایک ایک حرف قلمبند کر لیا کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ وہ خزانہ اب نایاب ہے۔

باوجودیکہ ازہر میں شیخ ہر دن غزیرے تھے مگر پھر بھی بعض قدامت

پسند علما ان کی ان ”بدعتوں“ کو ہضم کرنے کی اہلیت نہ رکھتے تھے اور اکثر ان کے طرز عمل پر اعتراضات کرتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ جب وہ جغرافیہ کا سبق پڑھانے کے لیے ایک مصنوعی کرۂ ارض مسجد میں ساتھ لے گئے تاکہ طلباء کو زمین کی گردش اور شکل بہ آسانی سمجھا سکیں تو بعض ”بزرگانِ دین“ بہت چسپن ہوئے لیکن اس قسم کی رکاوٹوں کی پروا نہ کر کے شیخ اپنا کام کیے جاتے تھے۔ ایک نئی دنیا تھی جو وہ اپنے شاگردوں کے سامنے پیش کر رہے تھے! اس زمانے میں عام مذہبی ذہنیت کی اصلاح کے متعلق جو مطمح نظر ان کا تھا اور جو کام انہوں نے کیا اس کی حقیقت ان کے دوست بلنٹ کی زبان سے سننے کے قابل ہو۔ بلنٹ لکھتا ہے کہ ”گزشتہ دو سو برس میں بہت سے ایسے داغظ گزرے ہیں جنہوں نے ہمیشہ یہ تلقین کی کہ اسلام کے تنزل کا بڑا سبب یہ تھا کہ مسلمانوں نے شریعتِ اسلامی کی اس طرح پابندی نہیں کی اور اسلام کی قدیم سادہ روایات کا وہ احترام نہیں کیا جو ابتدائے اسلام میں شعارِ اسلامی تھا۔ علاوہ بریں ترکی اور مصر میں ایسے مصلحین پیدا ہوئے جنہوں نے محض سیاسی اغراض کے لیے حکومت کا یورپین نقشہ بنایا۔ مگر ان مصلحین نے جو اصلاحات نافذ کیں وہ گویا بہ جبر نافذ کی گئیں اور عوام کے دلوں میں اُن کی جگہ پیدا نہ ہو سکی۔ جمال الدین کی ذہانت و جدت یہ تھی کہ انہوں نے اسلامی ممالک میں مغربی خیالات رکھنے والوں کی ذہنیت کی اصلاح کرنے کی کوشش کی اور اس امر کی تبلیغ و تلقین کی کہ اسلام کی موجودہ حالت پر نظر ثانی کی جائے اور بجائے ماضی سے پیٹے رہنے کے جدید علوم کے ساتھ پرانی تہذیب کے بدلنے کی تحریک کو آگے بڑھایا جائے۔ قرآن

و حدیث سے اُن کی وسیع واقفیت نے ان کو اس کا موقع دیا کہ وہ یہ بتائیں کہ اگر قرآن و حدیث کے صحیح معنی پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ درحقیقت اسلام کے اندر وسیع تغیرات کی گنجائش موجود ہے۔ اور مشکل سے کوئی آئینی اور سیاسی اصلاح ایسی ہوگی جو شریعت کے خلاف ہو.....

مصر نہیں شیخ نے اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کیا کہ اسلام ہر زمانے میں انسانوں کی تمام ضروریات کا کفیل ہونے کے قابل ہے اور عہد جدید کی تمام ضروریات کو پورا کر سکتا ہے.....

علماء کے تخیل اور ضمیر کو وہ اُن زنجیروں سے آزاد کرانا چاہتے تھے جن میں یہ لوگ صدیوں سے جکڑے پڑے تھے اور بتانا چاہتے تھے کہ اسلام ایک مردہ قالب نہیں ہے بلکہ اس کے اندر اتنی لچک ہے کہ وہ ہر زمانے کی بدلتی ہوئی ضروریات کا کفیل ہو سکتا ہے.....

لیکن یہ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ مغرب میں اصلاح کی اس تحریک کا آغاز ایک ایسے شخص سے ہوا جس نے وسط ایشیا کے جمود میں پرورش پائی تھی اور پھر کس قدر تعجب ہے کہ یہ اصلاحی تحریک دور و دراز دارالعلوم ازہر میں شروع ہوئی.....

مصر کی اس ذہنی اور اخلاقی تاریکی کی حالت میں جمال الدین کی تعلیمات ایک عجیب روشنی لے کر ہویدا ہوئیں.....“

شیخ کے شاگردوں کے اقوال سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہو کہ اُن کی تعلیمات نے کس قدر گہرے اثرات پیدا کیے تھے۔ تلامذہ کی فہرست میں ہم ایسے مشہور لوگوں کے نام پاتے ہیں جیسے کہ محمد بک

مویلی، ابراہیم، بک مویلی، مفتی عبدہ، ادیب اسحق، شیخ ابراہیم الاغانی جو سب دنیائے علم و فضل میں بہت محترم اور مفترحتے۔ اس میں شک نہیں کہ شیخ کے ارشد تلامذہ مفتی عبدہ، تھے جو بعد کو مصر کی قومی تحریک میں شیخ کے جانشین قرار پائے اور جنہوں نے شیخ کے مصر سے چلے جانے کے بعد ان کی شعل ہدایت کو روشن رکھا۔ مفتی عبدہ کے ان الفاظ سے شیخ کی تعلیمات کی اہمیت اور اثرات کا اندازہ ہوتا ہے:-

”ایں مفتی مشہور عصر در یک مقالہ خود می گوید کہ پیش از دیدن جمال الدین افغان گویا چشم کور، گوشم کر و زبانی گنگ بود“ نہ

اسی طرح ادیب اسحق جو مصر کے نامور اہل قلم تھے، شیخ کے متعلق اپنے احساسات کو یوں ظاہر کرتے ہیں کہ:-

”چیزے کہ من می دانم ہمہ آں از جمال الدین افغان آموختہ ام“

اسی طرح شیخ کے شرکائے کار اور معاونین میں ایک بڑی جماعت ازہر کے نوجوانوں کی تھی۔ جن کے جوشِ عمل نے چند روز میں مصر کی زندگی کا نقشہ ہی بدل ڈالا۔ شیخ ان لوگوں میں سے نہ تھے جو صرف علمی صحبتوں میں خاموش بیٹھے رہتے۔ ان کی فطرت پارہ کی طرح بے چین تھی اور ان کی نظر بہت دور تک جاتی تھی اور وہ خاموش رہ کر دھیمی رفتار سے کام کرنے والے آدمی نہ تھے۔ ان کا سمندر ہر وقت ایک طوفان مانگتا تھا اور ان کا بے قرار دل جلد سے جلد نتائج طلب کرتا تھا۔ منزل کی دوری کے احساس سے ان کا دل بیگانہ تھا، رفتار کی سستی ان کو گوارا نہ تھی، حق کے مقابلے میں باطل سے ان کا سمجھوتا ممکن نہ تھا۔“

اعتدال اُن کے نزدیک بزدلی کا دوسرا نام تھا، ہلج کی نرمی اور عمل کی سستی کو وہ ارادوں کی کمزوری سمجھتے تھے، اس لیے محض ازہر کے مصلے پر بیٹھے رہنا اور سبق پڑھانا کوئی دل چسپ کام نہ تھا۔ وہ اس مصلے سے چند روز بعد ہی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور اُنھوں نے ملک میں ہر قسم کی جماعتیں اور انجمنیں قائم کرنی شروع کیں، جن میں سے اکثر کے مقاصد کھلے طور پر سیاسی تھے۔ ان کی قائم کی ہوئی سب سے بڑی انجمن وہ تھی جو ”انجمن حیات الوطنی“ یا ”مجلس وطنی“ کے نام سے مشہور ہے۔ اس انجمن کے مقاصد و اغراض و اعمال کی کچھ تفصیل اس موقع پر بے محل نہ ہوگی۔ شیخ کے ایک رفیق شیخ محمد محلاتی اپنی کتاب موسومہ ”گفتار خوش یار قلی“ (مطبوعہ مطبع علویہ نجف اشرف ۱۳۳۲ھ ہجری) میں انجمن کے کچھ حالات اس طرح بیان کرتے ہیں :-

”بہ تاسیس یک انجمن موسوم بہ ”مجلس وطنی“ عزیمت فرمود۔ نوہالان تازہ مصری کہ ازین فیوضات خورشید آں بزرگوار بجائے خارِ مغیلان جہل و کسالت در کانون قلب شاں شاخ طوبائے عشق کلمہ مبارکہ توحید رویان دور تمام عروق و شریان شاں شاخ و برگ دریشہ دواندہ حیات و مہمت ملت اسلام را بالحن در امتثال فرماں سید دیدہ دعوت حقہ اش را اجابت گفتند۔ مفتاح سعادت شش کروڑ نفوس اسلامی در جامعہ مجلس وطنی قاہرہ مصر بہ دستور و ریاست سید افتاح گردید۔۔۔۔۔ عدد اعضا بقویہ ۳۰۰ و بقویہ کمتر بودہ۔۔۔۔۔“

مرزا لطف اللہ شیخ محمد محلاتی کے حوالے سے انجمن کے اغراض و مقاصد حسب ذیل بیان کرتے ہیں -

”ایں بود اول قدمے کہ در میدان جاں بازی بجالم اسلام گزاشتند۔
تجملاتِ صوری و آئینیت ہائے ظاہری را از لوازم خور و خواب پوشاک
و سواری و پذیرائی در بازار حراج ریختہ و بہ آں را در صندوقِ انجمن برائے
دستگیری در ماندگان و قضائے حوائجِ نوعیہ ملک و ملت اسلام ذخیرہ کردند۔
ثانیاً ہر یک از اعضا مقرر شد کہ خوشنن را در مقابلِ قرآن مجید مستول
بہ داند و تلاوتِ قرآن را اقل در ۲۴ ساعت یک خرب از روئے
فکر و امعانِ مواظبت نمودہ موادِ ذیل را عمل نماید۔

- ۱۔ ادائے فرائض و نوافل - ۲۔ امر بہ معروف و نہی از منکر - ۳۔ دعوت
بہ اسلام - ۴۔ بحث با دعاۃ نصاریٰ بالآئی ہی احسن - ۵۔ احسان بہ فقرا
و غیرہ وغیرہ -

نیز بقول لطف اللہ اس انجمن کے اراکین کا فرض یہ بھی تھا کہ
اپنا روزنامہ پابندی کے ساتھ لکھیں اور ہر شب اپنے نفس سے محاسبہ
کریں کہ انھوں نے دن بھر میں کتنے کام اچھے یا بُرے کئے - ایک
مہینے میں اس انجمن نے دس ہزار تومان سرمایہ جمع کر لیا - اس کے
اراکین کی ایک ماہ کی کارگزاری اس طرح بیان کی گئی ہے -

۵۰۰ مریضوں کی خدمت کی گئی -

۵۰۰ محتاجوں کی حاجت پوری کی گئی -

۲۵۰۰۰ شرابیوں، زانیوں اور عصمت فروشوں سے توبہ کرائی گئی -

۸۰ ایسے اشخاص جو انگریزی دفاتر یا کارخانوں میں ملازم تھے،

اُن دفاتر اور کارخانوں سے کنارہ کش ہو گئے -

۵۰۰ امرا اور روسا نے اپنا سامانِ نعیش فروخت کر کے سب

روپیہ کارِ خیر کے لیے دے دیا۔

۵، غریبوں کو تجارت کرنے کے لیے سرمایہ دیا گیا۔

۲۰۶ بازاری فقیروں کو جو واقعی مستحق تھے، خیرات دی گئی۔

۱۲۰ نصاریٰ دیہود مشرف بہ اسلام کیے گئے۔

۲۴ جلسوں میں نصاریٰ سے مذہبی مناظرہ و مباحثہ کیا گیا۔

شیخ اکثر انجمن کے جلسوں میں تقریریں کرتے تھے۔ اُن کا ایک خطبہ

جس کو صمعی نے ”آثار جمال الدین“ کے عنوان سے مصر میں شائع کیا

تھا، عقل اور مذہب و مادہ کے متعلق ایک دل چسپ محاکمہ ہے۔ اس

موقع پر اُس محاکمہ کے بعض اقتباسات کو درج کرنا بے محل نہ ہوگا۔

مثلاً فرماتے ہیں کہ

”آخرت نیک کردار مسلمانوں کے لیے دار النعیم ہے.....

دار النعیم کیا ہے۔ اس کو جنت سمجھیے۔ اور کافروں اور سرکشوں

کے لیے ”دارالشفاء“ ہے۔ دارالشفاء کیا ہے؟ اُسے دونخ کہ لیجیے۔.....

عقل انسانی مطلق الادراک ہے جس کی نہ حد ہے نہ پایاں۔ عام

حیوانات سے بھی عقل ممتاز کرتی ہے جو اگرچہ تکلیف اور مصیبت کا

سبب بھی ہوتی ہے.....

عالم قدیم ہے۔ اس کے لیے حدوث نہیں۔ محدثات کی حرکت سے

انواع عالم وجود میں آتی ہیں۔ حرکت کے انفکاک کا تصور ایک لمحہ کے

لیے بھی نہیں جاسکتا۔ زندگی نباتات و حیوانات کے تفاعلِ کیمیائی

کا ایک مظہر ہے۔ اس کے چار اسباب ہیں۔ تاموس یعنی تباہی افراد

اور حفظِ نوع اور تنازع للبقا اور انتخابِ طبعی۔ انسان کی حیثیتِ مادہ

اس کے بعد مذہب اور مادہ کے قضیہ پر بحث کرتے ہوئے یہ نتیجہ پیش فرماتے ہیں کہ :-

مرزا لطف اللہ ایک جگہ میں شیخ کی تقریر کے حسب ذیل الفاظ نقل کرتے ہیں :-

"دیس ازاں کہ ازیں رہنمائی الہی اخلاف مادیور شدند و قرآن و علم و عمل آں ہا کلیتاً بر نصی مواد مقدسہ قرآن قرار محو فت باہی حال منزل

رسیدند۔ قال اللہ تعالیٰ اِنَّ اللہَ لَا یَغۡیۡرُ مَا بَقُوۡہُمۡ حَتّٰی یُغۡیَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ۔“ پس در موزوں انحطاطِ مسلمین شکوہ ازار و پائیانِ خطا است و خرابیِ حالِ مسلمانان از انحطاطِ فاسدہٴ درونیِ خود مسلمین است و جبلِ المتینِ استخاصِ مسلمانان ازین ہفتم طبقہٴ پستی و خواری تمسکِ علیٰ بعروۃ الوثقائے قرآنِ مبین است۔ ایک دن شیخ کا خطبہ اس قدر پرجوش تھا کہ بقول لطف اللہ خاں یک ثلثِ اعضائے انجمن غش منودہ و بقیہ را ہم حالے نمازہ “ حتیٰ کہ شیخ کو خود ہی غش آجاتا ہے اور

”حسن عطا یک دامادِ خدیو مصر بوسیلہ عطریاتِ سید و اعضا را بحال می آورد “

اس قسم کا مبالغہ آمیز اندازِ بیان لطف اللہ خاں کا مخصوص شیوہ ہے اور ان کی تحریریں اس رنگ آمیزی سے بھری پڑی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے بیان کردہ واقعات کی صحت بھی اکثر مشتبہ ہو جاتی ہے اور ان کے بیان میں تاریخی سنجیدگی باقی نہیں رہتی ۔

شیخ محمد مملاتی کے حوالہ سے مرزا لطف اللہ بیان کرتے ہیں کہ انجمن کی کامیابی اور نفوذ نے برطانوی مدبرین کو بہت متوحش کر دیا چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ لارڈ کرومر نے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا کہ اگر یہ انجمن مصر میں ایک سال اور قائم رہی اور جمال الدین مصر میں مقیم رہے تو برطانوی اثرات تباہ ہو جائیں گے ۔

”انجمن حزب الوطنی مصر بدتر و سخت عاتقی است کہ از برائے پیش رفت تصور شود و باید باکمالِ سرعت و عجلہ از برائے تفرق آن دستور سریع لازم الاجرا برسد “

اس قسم کی چند رپورٹوں اور تحریروں کے اقتباسات مرزا لطف اللہ خاں نے نقل کیے ہیں لیکن ان اقتباسات کی کوئی سند موجود نہیں اس لیے ان کا نقل کرنا عبث ہے۔ لطف اللہ خاں کی زنگین کلامی حقایق کو بے حد الجھا دیتی ہے مثلاً لکھتے ہیں کہ :-

”از توارد ایس رپورٹ ہائے مدہش و موحش پڑ در پی کہ فی الحقیقت راپورٹ اعدام اروپ بود ملت انگلشی با کمال جدیت در اعدام و تفرقہ انجمن مذکور و رئیس آں ہمت گماشتند چرا؟ - برائے ایس کہ دانستند کہ اگر تساہل در زند و ماطلہ کنند محال است سیانت و دانش بسمارک و غلا دستون تدبیر سراید و رد گرے کنکاش پارلیمان لندن و برلن عرش توپ ہاون و تفنگ - نارنجک ہوائی - سرنگ دریائی - قوت نظام المان فرم اطیش جمعیت روس از جلو گیری و سد پیش رفت ایس مقاصد عالیہ برابند - چہ ایس نقشہ فرخندہ از کار گاہ قوت مافوق الطبعۃ است منزل گاہ ہندس ایس نقشہ را مکان در لامکان است“

صفحہ کے صفحہ اس رنگ آمیزی سے بھرے ہوئے ہیں -

بہر حال یہ امر یقینی ہے کہ ”انجمن وطنی کا وجود بہت جلد اغیار کی نظروں میں کھٹکنے لگا اور تبلیغ اسلام کی تحریک نے نصرانی مشن سے ٹکڑ کھائی۔ جب نصاریٰ اور یہودی مسلمان کیے جانے لگے تو ان اقوام کے اندر ہل چل مچ گئی اور عیسائی مشنریوں کے شور و غل نے برطانوی مدبرین کو اس پر آمادہ کر دیا کہ انجمن کا راستہ روکا جائے۔ صاحب تایخ ”بیداری ایران“ نے بھی ان حالات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

”بہ ترتیب نشر ہائے فرانسیسی انجمن تشکیل داد۔ اصحاب فکر دوستان

خود را از علما و اعیان وغیرہم در آں انجمن دعوت نمود و تقریباً سی صد نفر در آں جامعہ عضویت یافتند و بہ واسطہ تعذیبائی کہ از انگلش ہا نسبت ابنائے وطن اش شدہ بود عدوایہ مفرد بہ آں ہا داشت۔ رفتہ رفتہ کار انجمن بالا گرفت و کونسل انگلش را بہ وحشت انداخت "

انجمنوں کی تشکیل کے علاوہ مصر میں شیخ نے سب سے بڑا کام جو کیا وہ یہ تھا کہ انھوں نے ملک کے تمام طبقتوں میں اور خصوصاً عوام کے اندر اخبار نویسی اور اخبار بینی کا ذوق پیدا کر دیا۔ انھوں نے لوگوں کو مطالبہ حقوق کا یہ سب سے بڑا اور موثر راستہ بتا دیا۔ مصر کے متعلق شیخ کا یہ ایک بڑا کارنامہ ہے جس کو ان کے اکثر مشرقی سوانح نگاروں نے نظر انداز کر دیا ہے۔ اس زمانے تک مصر میں اخبار نویسی کی یہ حالت تھی کہ صرف اسکندریہ سے ایک دو چھوٹے چھوٹے اخبار اور وہ بھی محض یورپین آبادی کو خبریں پہنچانے کے لیے نکلا کرتے تھے جن کو ملکی و قومی سیاسیات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مصر کے بازاروں میں کوئی اخبار نہ بکتا تھا۔ سرکاری عہدہ داروں کو ضروری خبریں گورنمنٹ کی طرف سے چھاپ کر دی جاتی تھیں۔ کسی آزاد اخبار کے نکالنے کی اجازت نہ گورنمنٹ دیتی تھی نہ کوئی مانگتا تھا۔ شیخ نے اس کمی کو محسوس کیا اور بہت جلد اپنے شرکائے کار کی مدد سے نہ صرف مصر کا مشہور اخبار "مصر" جاری کرایا بلکہ دو پرچے اور بھی شایستہ عربی زبان میں نکلائے ایک کا نام "محروسہ" اور دوسرے کا نام "مرآۃ الشرق" تھا۔ ان اخبارات میں خاص خاص سیاسی مضامین یا تو شیخ خود لکھتے تھے یا محمد عبدہ اور ابراہیم الاغانی لکھا کرتے تھے۔ ان مضامین میں ملک

کے حالات پر بہت جرات کے ساتھ تبصرہ کیا جاتا تھا اور خدیو اور اُس کے وزرائے نکتہ چینی سے محفوظ نہ رہتے تھے۔ ابتدا میں خدیو نے ان اعتراضات کی کچھ زیادہ پروا کی نہیں اور ان جراید کی رائے کو حقارت کی نظر سے دیکھا۔ علاوہ بریں وہ خوش بھی ہوتا تھا کہ یہ جراید یورپین دول پر حملے کرتے رہتے تھے اور خدیو یورپین دول کو مصری قومیت کے جذبات کے مظاہروں سے بہکانا اور دھمکانا بھی چاہتا تھا۔ علاوہ بریں وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ دوسرے اسلامی ممالک میں قومی تحریکیں قوی ہوتی جاتی ہیں۔ اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنے ملک میں قوم پرستوں سے بگاڑ کر لے اس لیے شیخ کے جاری کیے ہوئے اخبار کی اشاعت میں اس کی حکومت کچھ عرصہ تک بالکل حاج نہیں ہوئی۔ صرف ایک اخبار "ابونظارہ" حکماً بند کیا گیا۔ اس اخبار نے اپنی تھوڑی سی عمر میں مصری قوم پرستوں کی بہت کچھ خدمت انجام دی تھی۔ "ابونظارہ" کا محرر ایک مصری یہودی جمیں سنا تھا جو پہلے کسی مصری اسکول میں استاد تھا اور علماء میں شیخ کی صحبت میں داخل ہو گیا۔ اس سے پہلے وہ شیخ کا بہت مخالف تھا مگر بعد کو وہ شیخ کے ساتھ بہت عقیدت رکھنے لگا۔ وہ اکثر شیخ کی خاص صحبتوں میں بانسری بجا کر گایا کرتا تھا۔ چونکہ سنا بہت افلاس کی حالت میں تھا اس لیے شیخ نے اس کو کچھ سرمایہ دے کر "ابونظارہ" جاری کرا دیا۔ اس اخبار کے مقاصد سیاسی تھے۔ اور وہ تفرق اور مزاح کے پیرائے میں حکومت پر سخت نکتہ چینی کیا کرتا تھا۔ خدیو، اس کے وزرا اور مقررین کا ابونظارہ کے کالموں میں

بہت مضحکہ اُڑایا جاتا تھا۔ اس مضحکہ کا ڈنک اس قدر تیز تھا کہ آخر اسماعیل اُس کی نوک کو برداشت نہ کر سکا اور ابو نظارہ بند اور سنا خارج البلد کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد جب شیخ پیرس میں جا کر مقیم ہوئے تو یہ اخبار بھی جاری ہو گیا۔ شیخ اس زمانے میں کبھی کبھی اس کے صفحات پر مضامین بھی لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ مشرق اور اہل مشرق کے عنوان سے شیخ کا ایک مقالہ اسی ”ابو نظارہ“ میں شائع ہوا تھا جو بعد کو شیخ کے مصری سوانح نگاروں نے اپنے رسالوں میں تمام و کمال نقل کیا۔ ان اوراق میں ہم اس مضمون کے بڑے حصے کا ترجمہ اس لیے نقل کرتے ہیں کہ اس سے مسائل مشرق و مغرب پر شیخ کی وسعت نظر کا پتہ چلتا ہو۔ انحطاط مشرق کے اسباب یوں صاف صاف بیان فرماتے ہیں:-

اس مقدمہ کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ اتنی زبردست سلطنت ایسی عظمت و شوکت، صنائع بدائع کی کثرت، مال و متاع کی افراط، تجارت کی گرم بازاری، علوم و فنون اور معارف و آداب کی ایسی حیرت انگیز اشاعت کے باوجود مشرق کے اپنے مرتبہ عالی اور مقام رفیع سے پستی کے غار میں جا پڑنے اس کے باشندوں پر فقر و فاقہ مسلط ہونے ذلت و مسکنت کے غالب ہونے اور اجنبی قوموں کے قابو پا جانے کی صرف یہ وجہ ہو کہ اہل مشرق نے اپنی عقلوں کے نور سے اعراض کیا، اس سے استفادہ کرنا چھوڑ دیا اور اپنے اخلاق خراب کر ڈالے۔ اسی لیے ان کا یہ حال ہو کہ جانور اور چوپایوں کی طرح بسر کرتے ہیں، کسی

بات پر غور و فکر نہیں کرتے ، اپنے افعال میں شر و فساد سے احتراز نہیں کرتے ، جلب منفعت کے لیے سعی اور ضرر سے اجتناب نہیں کرتے ۔ ان کی عقلوں پر نیند طاری ہو اُن کے افکار و خیالات اپنے حالات کی اصلاح سے عاری ہیں ، ان کی آنکھیں ان پستیوں کے معلوم کرنے سے معذور ہیں جو انھیں گھیرے ہوئے ہیں ، وہ اپنے قدموں سے ہلاکتوں میں گھٹتے اور پستیوں کے غماروں میں گمرتے ہیں ۔ اپنے نفوس کی اُن تاریک خواہشوں میں مبتلا ہوتے ہیں جو اُن کے گمراہ کن اوہام سے رونما ہوتی ہیں ۔ وہ اُن ادیام و ظنون کی پیروی کرتے ہیں جن کی جانب ان کی طبائع کا فساد رہنمائی کرتا ہو ۔ جب تک مصیبتیں اُن کے جسموں کو مس نہیں کرتیں اُس وقت تک وہ اُن کا احساس نہیں کرتے اور جب اُن کے آلام دور ہو جاتے ہیں تو جانوروں کی طرح انھیں بھلا دیتے ہیں ۔ انھیں اپنی عقلوں کے کہنہ ہونے کا احساس نہیں ہوتا نہ آنکھوں پر جہالت کے پردے پڑ جانے کی تمیز ہوتی ہو ۔ غفلت کے غلبے کی بدولت وہ صرف اس زندگی کو زندگی سمجھتے ہیں اور بھڑ بکری کی طرح کھانے پینے اور جیتے رہنے کو غایتِ حیات تصور کرتے ہیں ۔ طلبِ نام ، بقائے ذکر اور تحصیلِ شہرت اور افتخار کی جو لذتیں انسان کے لیے مخصوص ہیں ان سے انھیں کوئی سروکار نہیں ہوتا ۔ وہ عواقب کو نہیں جانتے مآلِ آخر کا ادراک نہیں کرتے جس

چیز کو کھو چکے ہیں اس کا تدارک نہیں چاہتے۔ جو آفات و حوادث آگے پیچھے سے اُن کی تاک میں ہیں اُن سے بچنے کی کوشش نہیں کرتے۔ نہ اُن سختیوں اور دشواریوں کو سمجھتے ہیں جو زمانہ اُن کے لیے مہیا کیے ہوئے ہے۔ اسی لیے ذلت و رسوائی میں پڑے ہیں اور اس کا خیال تک نہیں کرتے کہ ہم ذلیل ہیں۔ وہ غلامی اور عبودیت کو خوشی سے گوارا کیے ہوئے ہیں اور سابقہ عظمت و رفعت کو فراموش کر چکے ہیں۔ عقل کی اس بلند چوٹی سے گرنے کے بعد جن کے بغیر انسان کو کوئی عزت اور رتبہ حاصل نہیں ہوتا۔ ان پر کمینگی ادبے و قری چھا گئی ہے۔ دلوں پر قساوت و ظلم کا تسلط ہو گیا ہے۔ ان کے نفوس میں جور و جفائے گھر کر لیا ہے۔ ان میں عیب و خود بینی راسخ ہو گئی ہے جس کو مرتبہ اور فضیلت سے کوئی واسطہ نہیں۔ جو ذلت ان کے قلوب میں جڑ پکڑ چکی ہے اس کے باوجود وہ کبر و عظمت کا اظہار کرتے ہیں باہم نفاق و افتراق کو رواج دیتے ہیں۔ انھوں نے غد اور خیانت کو اپنا اور رضا بچھونا اور حسد و ندامی کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔ حرص و طمع ان کا لباس اور خجاست و بے حیائی ان کی شانِ امتیاز ہے۔ وہ بزدل اور ڈرلوک ہونے میں شہید اور ادنیٰ درجے کی خواہشوں کے پورا کرنے میں منہمک ہیں۔ بدنی لذتوں کی تکمیل میں پڑے رہتے ہیں اور اپنے آپ کو بہمی اخلاق کا خوگر بنائے ہوئے ہیں۔ سستی و بد نظمی پر

تجیکہ کیے ہوئے ہیں۔ وہ موذی حیوانات کی صفات سے متصف ہیں۔ اُن کا قوی اپنے ضعیف کو بھاڑ کھاتا ہے۔ اور باعزت بے عزت کو غلام بنا لیتا ہے۔ وہ اپنے وطنوں سے خیانت کرتے اور پڑوسیوں پر ظلم کرتے ہیں۔ کمزوروں کا مال غصب کر لیتے اور عہد و پیمان کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ اپنے ملکوں کو تباہ کرنے کی آپ کوشش کر کے اور اغیار کا ہاتھ مضبوط کرتے ہیں۔ انہیں ننگ و مذلت کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ ان میں کے عالم کہلانے والے حقیقت میں جاہل ان کے امیر ظالم اور عدالت کے حاکم یا قاضی خائن ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی رہنما نہیں جو انہیں راہ نجات دکھلائے نہ کوئی تنبیہ کرنے اور چوکانے والا ہو کہ وہ گمراہی میں پڑنے سے باز رہیں۔ غرض وہ سب کے سب اپنے اخلاق کے فساد اور عقول کی خرابی سے دوبار و ہلاکت کے ہدف بنے ہوئے ہیں۔

اب اہل مشرق کے جو حالات پہلے بیان کیے گئے اُن پر غور کیا جائے تو بہ آسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں نے عقل کے راستہ سے ہٹ کر اپنے آپ کو دائمی ذلت میں مبتلا کر رکھا ہے اور اپنے عدم تدبیر اور عواقب و انجام پر نظر نہ کرنے کی وجہ سے خود اپنے ملکوں پر تباہی کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ ان کی قومی سلطنتیں بھی ان کی سو تدبیر سے ضعیف ہو چکی ہیں اور ان کی جہالت و بد اعمالی کے نتیجہ میں خود اُن کی سازش سے انہیں کے ملکوں پر دشمن مسلط ہو گئے ہیں۔

جس زمانہ میں شاہ سلطان حسین کے عہد میں افغانی اصفہان پر چڑھ آئے تو عثمانیوں نے شاہ حسین کے خلاف ایرانی شہروں کی تقسیم پر روسی سلطنت سے اتفاق کر لیا۔ حالانکہ اگر عثمانی نگاہ تدبیر سے دیکھتے کہ روسی قوم کی کیا اصلیت ہو اور سلطنت عثمانیہ کی یونانی - رومانی - سریوی اور بلغاری رعایا کے ساتھ ان کی کیسی سازشیں رہتی ہیں اور یہ کہ مستقبل میں اس معاہدہ سے ایک زبردست دشمن کی قوت و استحکام میں کس درجہ خطرناک اضافہ ہو سکتا ہو تو وہ کبھی روسیوں سے عہد و پیمان کا خیال دل میں نہ لاتے بلکہ ان کے مضبوط ہونے سے پہلے ان کی بنیادیں کھوکھلی کرنے کی فکر کرتے اور اس درخت کو جڑ پکڑنے سے پہلے اکھاڑ پھینکتے۔ جس وقت عباس مرزا اپنے عساکر سے روسیوں کا مقابلہ کرنے اور انہیں اپنے ملکوں سے دفع کرنے میں مصروف تھا اس زمانہ میں عثمانی ترکوں نے ایرانیوں سے جنگی چھیڑ شروع کر رکھی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکوں کی اس مداخلت کی وجہ سے ایرانیوں کی قوت کمزور ہو گئی۔ ان کے استحکام میں کمی آگئی اور روس آذر بایجان کے اکثر شہروں پر قابض ہو بیٹھا لیکن اگر عثمانی اپنی عقلوں سے مشورہ لیتے تو انہیں صاف نظر آتا کہ ایرانیوں کا ضعف اور روسیوں کی تقویت یہ دونوں ترکی سلطنت کے ارکان میں تزلزل کا باعث ہیں۔ مگر انہوں نے اپنے اوہام و خطرات کا اتباع کیا اور یہ سمجھے کہ ہم جو کچھ

کر رہے ہیں یہی اچھا ہے اس لیے انھوں نے نادانستہ اپنے آپ کو تباہ کرنے میں عجلت کی۔ حالانکہ اُن کے سامنے عقل کی پر نور مشعل اور سیاستِ حقہ کا دستور العمل موجود تھا اور وہ اپنے اور ایرانی سلطنت کے درمیان ایک قومی دینی رابطہ کو دیکھ کر بجائے اختلاف و نفاق کے اس سے اتحاد کر کے اور روس کی قوت کو ضعیف کر کے اس کے خطرات اور طامعیوں سے محفوظ رہ سکتے تھے۔

جس زمانہ میں ٹیپو سلطان والٹی میور کا سفیر عثمانیوں کے دربار میں آیا اور ٹیپو سلطان کی طرف سے بعض ہندوستانی شہروں کے بدلے بصرہ کے تبادلہ کی گفت و شنود کی تو عثمانیوں نے اُس پر کوئی توجہ نہ کی اور سفیر کو ناکام واپس کیا حالانکہ ٹیپو سلطان کا مدعا اس معاملت سے صرف یہ تھا کہ ہندوستان میں عثمانیوں کا نفوذ بڑھا کر انگریزوں کا زور توڑا جائے اور عثمانی ترکوں کی طاقت بڑھائی جائے۔ عثمانیوں نے ان مستحکم تعلقات سے جو اُن کے اور ہندوستانیوں کے درمیان تھے یکسر بے اعتنائی برتی ورنہ اگر ان ممالک میں ان کا دائرہ حکومت بڑھ جاتا تو یہاں کے تمام حکام بلا پس و پیش ان کے جھنڈے کے نیچے آجاتے۔ انھوں نے راہِ عقل سے انحراف کرنے اور سیاست کی طرف سے غفلت و تساہل برتنے کی وجہ سے اس حقیقت کو نہ سمجھا کہ ایشیا میں یورپین دہل کے اقتدار کا بڑھنا خود ان کے ملکوں میں ان کے

تحکم کے ضعف کا باعث ہو اور اس طرح وہ ان ہی کے ملکوں پر دست طبع دراز کریں گے جیسا کہ اب مشاہدہ ہو رہا ہے۔

جن دنوں افغانیوں نے ہندوستان کو انگریزوں کے قبضے سے نکالنے کے لیے ہندوستان پر حملہ کا ارادہ کیا تو فتح علی شاہ بادشاہ ایران نے انگریزوں کو خوش کرنے کے لیے افغانیوں کو دھمکی دی لیکن اگر ایرانی اس وقت عقل کی روشنی میں دیکھتے تو یہ بات اچھی طرح منکشف ہو جاتی کہ ہندوستان میں انگریزوں کی قوت بڑھانا خود ان کے ملک کے لیے خطرہ عظیم اور اُن ہی کے تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ وہ غور کرتے تو خوب جان لیتے کہ وہ اور افغانی دونوں شجرِ ایران کی دو شاخیں ہیں اور ایک ہی جڑ سے نکلی ہیں ایک ہی زمین میں پروان چڑھی ہیں ایک ہی جنسیت اور دونوں کی جامع اور حقیقی اخوت دونوں کو مجتمع کئے ہوئے ہے۔ وہ عزت و شرف میں برابر کے حصہ دار اور ذلت اور بے آبروی میں یکساں شریک ہیں۔ ان میں صرف وہی ادہام نے تفریق پیدا کر دی ہے جو مذہبی بدگمانیوں سے رونما ہوئے ہیں ورنہ ان اوہام کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اگر ان میں سے ایک عقل کی طرف رجوع ہو تو سابقہ عظمت کے اعادہ اور تدارک مافات کے غرض سے اتحاد کو لازم و واجب سمجھے۔

امیر دوست محمد خاں امیر افغانستان کا بھی یہی حال رہا کہ انھوں نے آنکھیں بند کر کے اپنے ملکوں کو انگریزی حملوں کا آماجگاہ بنا دیا۔ انھوں نے انگریزوں سے مقابلہ کرنے کی غرض سے

رنجیت سنگھ سے معاہدہ کیا اور پھر انگریزی عہد و پیمان کے قریب میں مبتلا ہو کر رنجیت سنگھ کو میدانِ جنگ میں تنہا چھوڑ دیا۔ بلکہ الٹا اسے اپنی فوجوں سے دبا یا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رنجیت سنگھ کی فوجیں منہزم ہوئیں اور انگریز پنجاب کی تمام اراضی پر جو افغانستان سے ملی ہوئی ہیں چھا گئے۔ لیکن اگر دوست محمد خاں اس وقت اپنی عقل سے طالب ہدایت ہوتے اور اپنے افعال کے نتائج پر پہلے سے نظر کرتے تو معلوم ہو جاتا کہ انگریزی حلوں سے ان کے ملک کا محفوظ رہنا پنجابی حکومت کے باقی رہنے پر موقوف تھا۔ یہ حکومت باقی رہتی تو افغانستان اور انگریزی حکومت کے مابین ایک زبردست دیوار کھڑی رہتی۔ اس بات کو سمجھ کر افغانی پنجابی حکومت کی طرف سے بھی اسی طرح مدافعت کرتے جس طرح اپنی حکومت کی طرف سے کرتے۔

ادھر نواب بنگالہ اور نواب کرناٹک نے ہندوستان میں غیروں کی مداخلت کے لیے راستہ صاف کر دیا۔ نواب لکھنؤ نے تیموری سلطنت کو کمزور کر کے ان کے مقاصد کو تقویت پہنچائی۔ نواب دکن نے ٹیپو سلطان کی حکومت درہم برہم کرنے کے لیے انگریزوں کو مدد دی اور راجہ برودا کو بھی دبا یا۔

..... نتیجہ میں غلامی کا جو خود ان ہی کے کندھوں

پر آپڑا۔ یہ سمجھ لیجئے کہ ایک کی بقا دوسرے کی بقا سے وابستہ ہے اور ہر ایک دوسرے کے لیے اعضائے بدن کی طرح ہے۔ جب ایک عضو میں بیماری سرایت کر جاتی ہے تو تمام اعضا میں پھیل

جاتی ہے اور سارا بدن فاسد ہو جاتا ہے۔

اور سینے اہل بخارا تو قذہر روسیوں کے غلبہ سے خوش ہوئے اور ترکمانوں نے بخارا پر روسی قبضہ دیکھ کر بغلیں بجائیں۔ افغانوں اور ایرانیوں نے ترکمانوں پر ان کے تسلط سے مسرت و طمانیت کا اظہار کیا۔ یہ سب اس لیے ہوا کہ ان اطراف میں روسی قوت و غلبہ سے پیدا ہونے والے نقصانات سے غفلت برتی گئی۔ ان لوگوں کو ان کی جہالت نے اپنی خود غرضانہ مصلح میں مشغول رکھا۔ عقل سے محرومی نے ہلاکت میں ڈال دیا اور یہ سب دھوکے میں پڑ کر انتشار و زوال کی آخری حد کو پہنچ گئے۔ مدحت پاشا اور ان کے مددگار و رفقاءے کار اگر اپنی سلطنت کے آمادہ انہدام ارکان کی طرف دیکھتے اور عقلوں کی ہدایت اور اپنے تدبیر کی قوت سے جان سکتے کہ بلائیں انہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور حکومت کے ستون گرنے ہی کو ہیں تو ایسے وقت میں جب کہ اعدا تاک لگائے بیٹھے تھے سلطان عبدالعزیز معزول کو قتل کرنے کی گراہی میں نہ پڑتے۔ مگر انہوں نے اپنے واہی اور لغو راتوں پر اعتماد کیا اور دوسرے کی فریب کاریوں میں بھنس کر اپنی قوم کے لیے ہلاکت و اذبار کو دعوت دی اور یہ سمجھے کہ ہم اصلاح کر رہے ہیں!۔ اسماعیل پاشا نے اپنے آزاد و خود مختار ہونے کی محبت میں اپنی ان بد اعمالیوں کے نتائج سے آنکھیں بند کر کے جو بادشاہی کے نام کی حرص سے پیدا ہوتی تھیں دوسروں کو

مصر کی تمام دولت نگلادی اور یورپ کے صرافوں سے سود کی گراں قدر رقموں پر جو قرضہ لیا تھا وہ بھی انھیں کی نذر کیا۔ پھر اس سے فائدہ کیا اٹھایا۔ یہی کہ خود ملک سے معزول ہوئے۔
توفیق پاشا کے وزیروں نے اپنی جہالت، خود رانی اور اداہام باطلہ کی وجہ سے انتہائی کوشش کے ساتھ دول کو مصری مالک میں کھینچ بلایا اور اُن ہی کو اس ملک کا مالک بنادیا۔ اور بجائے خود یہ سمجھا کئے کہ ہم اس طرح خدیو کے دشمنوں کے خلاف مدد حاصل کر رہے ہیں۔ اگر وہ یورپین سیاست پر غور کرتے تو اپنی اپنے خدیو اور پاشا کی جانوں کے لیے اس مصیبت کو نہ دعوت دیتے اور کتے کے بھوکنے کے ڈر سے شیر کے منہ میں نہ جا پڑتے۔

اہل مشرق کے معاملات پر اب تک جو کچھ نقد تبصرہ کیا گیا اس سے واضح ہے کہ ان لوگوں نے سیاست میں ہدایت و موثندی کا طریقہ اختیار نہیں کیا اور اپنی عقلوں سے ذرا بھی کام نہ لیا نہ اپنے افعال کے عواقب اور اعمال کے نتائج پر غور کیا۔ انھوں نے اپنے حال و مال کو نور بصیرت سے دیکھا ہی نہیں بلکہ اپنے سطحی منافع کے آگے انجام اور اصل مصالح سے بے نیاز رہے اور گمراہی کے جگل میں بھٹکا کیے۔ انھوں نے اپنے ہی ہاتھوں اپنے ملک تباہ کیے اور سوہ تدبیر سے اپنے شہروں کو برباد کیا۔ اپنی فاسد کوششوں سے اپنی گزشتہ اغیار کے بھندوں میں پھنسا دیں۔ ان کی اولاد کا فرض تھا کہ

وہ اپنے اسلاف کی بھڑکائی ہوئی جس آگ اور ان کی نازل کی ہوئی جن مصیبتوں میں مبتلا ہیں ان سے عبرت حاصل کرتے سوچتے اور ان بلاؤں سے بچنے۔ متحد ہونے کی سعی کرتے افتراق اور قشتت سے پرہیز کرتے اوہام و خطرات سے سرگرداں نہ ہوتے۔ مگر افسوس ہو کہ ایسا نہیں ہوا۔ وہ بھی ان ہی نقوش قدم پر چل رہے ہیں۔ ان ہی غلطیوں کا اتباع کر رہے ہیں۔ عقل و ہدایت سے منحرف ہیں۔ حق اور آثارِ حق سے منکر ہیں۔ امانت ان میں سے اٹھ چکی ہو۔ خیانت رواج پا چکی ہو۔ محبت کے رشتے کٹ چکے ہیں جنسیت کی گرہ کھل چکی ہو۔ ہر شخص اپنے آپ کو دیکھتا اور شخصی منفعت کی سعی کرتا اور یہ نہیں جانتا کہ اس کی سعادت تمام افرادِ قوم کی سعادت سے وابستہ ہو۔ وہ بغیر سب کی سعادت کے اس مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اسی خود غرضی کا نتیجہ ہو کہ وہ فقیر بن گئے ہیں۔ اپنی معاش کے لیے سرگرداں ہیں۔ آغاز و انجام کی ہدایت سے بے خبر ہیں۔ قریب ہو وہ وقت کہ ان پر ابدی ذلت اور دائمی موت طاری ہو جائے۔ اور ان کی جنسیت و جمعیت کا شیرازہ کلیتہً بکھر جائے۔ مگر باوجود اس تمام تباہی کے ابھی تلافی کا موقع نہیں گیا۔ اب بھی تدارک کا وقت باقی ہو۔ ان کے لیے امید کے اسباب اور دروازے بند نہیں ہوئے۔ مگر حقیقت یہ ہو کہ ان میں ناامیدی گھر کر چکی ہو ان پر یاس غالب آچکی ہو۔ ان کی ہمتیں پست اور عزائم سست ہو چکے ہیں۔ ان کے کان نصیحتوں

کے سننے سے عاری اور آنکھیں حق کے دیکھنے سے اندھی ہو گئی ہیں
 قلوب میں قساوت پیدا ہو گئی ہے اس لیے وہ گمراہی میں پڑتے
 چلے جا رہے ہیں وہ اپنے سچے رہنماؤں کا خون بہاتے اور گمراہ
 کرنے والوں کی راہوں کی پیروی کرتے ہیں ۔

اس قدر طویل اقتباس کو اس موقع پر پیش کر دینے کا مقصد بجز اس
 کے کچھ نہیں کہ اس زمانہ کی اسلامی اور مشرقی سیاست کے متعلق شیخ کا
 نقطہ نظر واضح ہو جائے۔ جو کچھ انھوں نے آج سے ۶۰ سال پہلے کہا تھا
 اس کا بڑا حصہ آج بھی بے محل نہیں ہے۔ اس مضمون میں بعض ایسے واقعات
 کا ذکر کیا گیا ہے جن کا ان اوراق کی ترتیب میں کچھ دیر بعد ذکر آئے گا۔ لیکن
 مضمون کے تسلسل کو خراب نہ کرنے کے خیال سے اس موقع پر وہ اجزا بھی
 درج کر دیے گئے۔

واقعہ یہ ہے کہ شیخ نے مصر میں اخبار نویسی کی ایک نئی فضا پیدا کر دی
 اور معاملات ملکی پر بحث اور تبصرہ کا ایک ایسا راستہ کھول دیا جس سے پہلے
 کوئی واقف نہ تھا۔ ان کا ایک سوانح نگار شیخ کی ان دل چسپیوں کو اس طرح بیان
 کرتا ہے :-

”یکے از مقررین مصر کہ ادیب اسحق نام داشت در کتابے کہ در ان وقت
 بنام ”الدر“ نشر کرده است درباره سید جمال الدین افغانی اس سطور رami
 نوید:- ایں اوقات در جریدہ مصر مقالات بسیارے نشر کرده برائے توسیع
 افکار عمومیہ کوشیدہ است (منظر بن وضاح) نام مستعار آں جمال الدین
 است آں وقت در مصر احوال نوشتن تعلیق بایک اسلوب
 درست تقریباً وجود نداشت۔ ارباب قلم بسیار محدود بود و ایں ہم با عبارت

از عبد اللہ پاشا محمد پاشا سید احمد پاشا فکری پاشا و وہبی پاشا بودند۔ اگرچہ بعضے ازیں ہا مسیح و مستقیم مکتوب می نوشتند و بعضے ازاں ہا کتب دینی و اخلاقی و قسماً کتب اول تالیف می کردند۔ اینک در اثنائے فقدان ادبا با غیرت و ہمت سید جمال الدین در مصر ادبا و محدثین دیدہ شد۔ مرحوم شیخ عبدہ می گوید کہ:- "از وہ سال بایں طرف در بین تمام محدثین و ارباب مصر از اشخاص قدیمہ الی شخصے رانمی بینم۔ اصحاب اہل قلم مصر را کہ جوان و فقط در صنعت ایشاں پیرو استاد داند ہمہ از تلامذہ سید جمال الدین افغانی شمار می شود و یا از تلامذہ او فیض گرفته اند" کونفر نہائے کہ سید جمال الدین افغانی راجع بہ نظم و نثر و مسجع و احوال تحریر دادہ است شاعر سور یہ ادیب اسحق در "کتاب الدرر" خود بہ اہتمام مخصوص ضبط کردہ است در بارہ تاثیر فیض بخشائے کہ سید جمال الدین افغانی در عالم تحریر موجود آوردہ است و ذاتے کہ استطلاع آل را لازم داشتہ باشند کونفر نہائے مذکور را ملاحظہ بفرمایند ۛ

شیخ کی تعلیمات کا حلقہ جس قدر وسیع ہوتا گیا اور شیخ کے قلم کی روانی جس قدر زیادہ ہوتی گئی اسی قدر ان کے اثر سے نئے نئے اہل قلم میدان میں آتے گئے۔ سعد ز اغلول عبد اللہ نعیم بے احسان بے اور کتنے ہی ایسے نام اس زمانے کے اخبارات میں نمایاں نظر آتے ہیں اور یہ سب شیخ ہی کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بتایا جا چکا ہے شیخ کے عقائد میں سے ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ تنظیم ملت کے لیے ہر ایک ملک میں اخبار نویس کو آگہ کار بنانا نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ چند ہی روز بعد جب شیخ مصر سے خارج البلد

ہو کر ہندوستان تشریف لائے اور عرصہ تک حیدر آباد میں مقیم رہے تو اکثر اپنے خیالات حیدر آباد کے رسالہ معلم کے ذریعہ سے شائع کرتے رہے۔ اسی زمانہ میں انھوں نے فوائد جریہ کے عنوان سے ایک مضمون شائع کرایا۔ اس موقع پر اس مضمون کے بعض اقتباسات بے محل نہ ہوں گے۔ فرماتے ہیں کہ :-

”لیکن اخبار وہ بے مثل ضاعت ہے کہ اس کا موضوع عوام کے احوال اخلاقی قومی اور اس کی غایت اصلاح اخلاق امت و جلب سعادت دامن امان اپنی قوم بلکہ تمام قوموں کے لیے ہے۔ (۱) ایسا اس لیے ہے کہ جریہ (اخبار نامہ) ارباب فضائل کے فضیلت بیان کرنے میں مسابقت کرتا ہے اول تو ان کی بجا مدح کرنے کے خیال سے جو صاحب فضیلت کا حق ہے و ثانیاً اس لیے کہ اس مدح کو پڑھ کر دوسروں کو فضائل حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو (۲) اور رزائل پر نکتہ چینی کرتا ہے۔ چونکہ ان کے ضرر متعدی ہیں اور اس طرح وہ روکتا ہے دوسروں کو ان حرکات کے ارتکاب سے جو رزائل کرتے ہیں۔ (۳) اخلاق جمیلہ کے منافع کا ایسا بیان شافی کرتا ہے کہ عوام اس سے فائدہ اٹھا سکیں اور خواص بھی بے بہرہ نہ رہیں۔ ہر روز وہ اپنا فرض انجام دیتا ہے اور بری خصلتوں اور ان کی مضرتوں کو عام انسانوں سے دل پزیر عبارتوں میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کرتا ہے (۴) عام لوگوں کے لیے علوم کے فوائد کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ ہر شخص کو یقین ہو جائے کہ امت کی سعادت

علوم حقہ اور معارف حقیقی کی وجہ سے اور بغیر ان کے نہیں - اور جہل کے نقصان و خسارہ کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ ہر جاہل و غبی اعتراف کرے کہ ہر بلا اور مصیبت و نقصان جو اس کو پہنچا ہے جہل کی وجہ سے پہنچا ہے (۵) علوم کے درجات کو عالم انسانی میں ان کے فوائد کی نسبت سے قرار دیتا ہے اور ہر ایک کے لوازم کی مقدار کو دلیلوں سے ثابت کرتا ہے تاکہ نادان اپنی عمروں کو ضائع نہ کریں اور اس فائدہ سے جو حصولِ علم میں مشغول رہنے سے حاصل کیا جاتا ہے محروم نہ رہیں - (۶) اور منافع کی ضرورت کو جو عالمِ مدینیت میں علوم کا نتیجہ ہے ثابت کرتا ہے اور دلائل سے یہ ثابت کرتا ہے کہ بغیر ضاعت میں ترقی کے رفاهیت حاصل نہیں ہوتی (۷) اور تمام معارف ضروریہ کا مثلاً جغرافیہ، طبیعیات، فلکیات، زراعت، حرفت، طب، تربیتِ منزلی، تنظیمِ بلاد - تربیتِ اولاد اس طرح ذکر کرتا ہے کہ عوام الناس ان سے بہرہ ور ہوں - (۸) فضیلتِ انسانیت کی تشریح کر کے اغنیا اور اربابِ دولت کو اس کی طرف دعوت دیتا ہے اور مضامین لکھ کر علوم و معارف و ضایع اور قیام دار الشفا وغیرہ کی ترغیب دیتا ہے (۹) اور بجنسوں کو بڑھانے اور نفوس کو زندہ کرنے کی غرض سے بزرگانِ سلف و اجدادِ سابقہ کا ان کے اولادوں کے سامنے ذکر کرتا ہے اس طرح کہ وہ بھی ان کی روایات کو اپنا فرض سمجھیں (۱۰) گزری ہوئی قوموں کے احوال و اخبار کو تفصیل کے ساتھ درج کرتا ہے تاکہ صاحبانِ سیاست اپنے حال کو اس کے مطابق کریں اور اہل قوم ان کے حال پر

نظر کر کے اگر اہل سعادت ہیں تو اجتہاد کریں اور اہلی اسباب کو سمجھ کر اپنی ہمت بڑھائیں اور غیرت و حمیت کو متحرک کریں اور اگر اہل شقا ہیں تو عبرت حاصل کر کے اس کے اسباب سے اجتناب کریں۔ (۱۱) اور حاکم کو عدل کی دعوت دیتا ہو اور اس کے فوائد بیان کرتا ہو اور رعیت کی وکالت کرتا ہو اور ان کی شکایتیں حکومت تک پہنچاتا ہو اور حکام کے غل کا دفع کرتا ہو۔ اور حکام رشوت خوار کا انسداد کرتا ہو حوادث و واقعات کی تحقیقات کر کے ارباب حل و عقد کو اطلاع کرتا ہو تاکہ اس کا علاج کر سکیں اور حکومت اور رعیت ایسے حکام کے ضرر سے محفوظ رہے (۱۲) اور اگر شخص غیر قوم کے متعلق نامناسب بات کہے تو دلیلوں اور براہین سے جو عقلمندوں کے نزدیک تلوار سے زیادہ مؤثر ہیں اپنی قوم کا دفاع واجب جانے (۱۳) اور ہر عاقل کے افکار کو تمام عقلا تک پہنچائے اور اہل دنیا کو ایک دوسرے کے خیالات سے مطلع کرے (۱۴) حکایات لطیفہ اور نظائرف و اشعار بلیغ اپنے قارئین کے لیے کبھی کبھی شایع کرے (۱۵) قوم کے اجزاء اعضاءے منتشر کو جمع کر دے اور حیات تازہ سے ان کو زندہ کرے (۱۶) اور اپنے قارئین کا سیر و سیاحت دنیا سے گھر بیٹھے دل شاد کرے (۱۷) بیماروں کو جو مزمنہ بیماریوں میں مبتلا ہوں اطبا اور ماہرین تک پہنچائے اور جاہلوں کی علما تک برہی کرے (۱۸) قوم کے دوست کو دشمن سے تمیز کرائے اور دھوکہ اور فریب کو نہ چلنے دے۔

اور فی الجملہ اخبار ایسے انسان کے لیے جو نیکی و سعادت چاہے ایک جہاں غما دور بین ہے ایک طبیب شفیق ہے ایک سچا ناصح ہے ایک متواضع معلم ہے ادب سکھانے والا ہے اور آنکھ ہے بیدار اور چوکیدار ہے ہشیار۔ معالج ہے کامل عوام کے لیے اور تریاق شافی ہے تمام لوگوں کے واسطے اور تنبیہ کرنے والا ہے غافلوں کو اور روح بخش ہے دلہائے مردہ کے لیے اور جگانے والا افکارِ افسردہ کو۔ تنہائی میں جلیس ہے۔ وحشت میں انیس ہے علما کا سرمایہ ہے۔ تاجروں کا رہبر، حکام کا مشیر معدلت گستر۔ زراعت پیشہ لوگوں کی فلاحت کا مددگار۔ صناعتوں کا استاد جوانوں کا مکتب ارباب بصیرت کا نور دیدہ۔ خداوندانِ سیات کا دستورِ پندیدہ مدینیت کا مضبوط قلعہ اور سعادت انسانی کے لیے مضبوط پہاڑ۔

اور اخباروں کی ترقی و بلندی اور کثرت قوموں کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔ جس قدر علوم و معارف میں قوم ترقی کریگی اور مدارجِ مدینیت میں بڑھے گی اسی قدر اخبارات کی تعداد زیادہ ہوگی۔

پس ہر اتمے کہ جو یانِ سعادت و خواہانِ رفاہیت بودہ باشد باید بداند کہ بغیر از جراید و اخبار ناہائے یومیہ بمقصود اصلی و مطلوب حقیقی نخواہد رسید۔ و لاکن شرط آنکہ صاحب جریدہ بندہ حق بودہ باشد۔ نہ عبد دینار و درہم۔ زیرا کہ اگر بندہ دینار و درہم بودہ باشد حق را باطل۔ باطل را حق و غائین را امین و امین را غائین و صادق

را کاذب و کاذب را صادق و عدو را صديق و صديق را عدو و قرب را بعيد و بعيد را قرب و ضعيف را قوى و قوى را ضعيف و منفعت را مضر و مضرت را منفعت و حن را قبح و قبح را حن و موهوم حقيقى را موجود و موجود حقيقى را موهوم دامى ناپيد - والبتہ عدم ايس گونه جريده از وجود آن بر مراتب غير متناهيہ بہتر است -

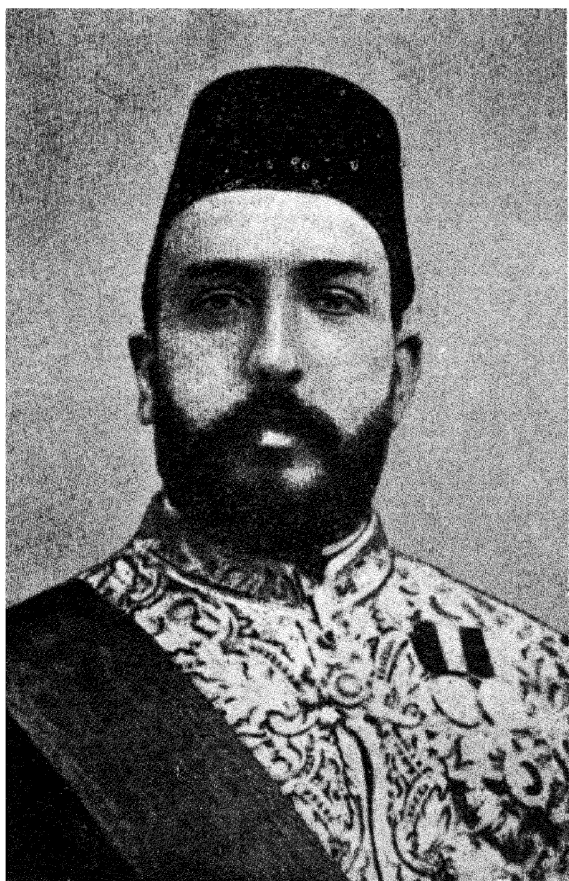
چون فايده اخبار ناہيا و عزيت آہنا معلوم گرديد اکنون مرا مى رسد کہ تاسف خوشين اظهار کرده بگويم کہ ہندوستانی کہ از قديم معاون علوم و معارف و منبع ضايع و بدايح و ميووع حکم و فلسفہ و کلا قوانین و نظامات مذيت بوده است چرا بايد جرايد را در او ايس قدر کہ بايد و شايد مقدار منزلت نہ باشد - و جرايد منطبقہ در آن عبارت از معدودے چند باشد با کثرت عدد سکان آن کہ بدو صد مليون (۲۰ کروڑ) بالغ مى شود و در اہالی آن مملکت را رغبت تامہ در خواندن جرايد نباشد با عظم فايده و کثرت منافع آن -

و اما آن عذرے کہ بعضے از ارباب و جاہت ہند در باب خواندن جريده تقديم کرده مى گویند کہ جرايد مطبوعہ درين ممالک مطابقہ نافعہ و مقالات مفيدہ را عاوى نيست لهذا طبع بقرآت آن رغبت نهي ناپيد البتہ آن عذر مقبول نخواہد افتاد - زيرا کہ معلوم است کہ نزد ہر صاحب بصيرتے کہ اتفاق ضاعت و احکام حرف و تائق در اعمال و تحمين افعال بر حسب رغبت و ميل عموم امت مى باشد پس نقص را بايد در افکار عموميه دانست نہ در اخبار ناہيا -

اگر عموم ابالی را رغبته کامل و میلے صادق از برائے خواندن
جرايد حاصل می شود بے شبه صاحبان جرايد صرف افکار نموده
آنچه در خیابان عقول داشته باشند برائے خواہش افراد امت
بمنصیہ شہود جلوہ خواهند داد۔ بلکہ فکر خویش را با افکار دیگران
شریک کرده ہر روزے مقابلائے شیریں از برائے تربیت و
تہذیب عموم انشا خواهند نمود۔ این است محل آنچہ می خواستم در
فضیلت جرايد بیان کنم۔ (در معلم شفیق دسمبر ۱۸۸۷ء)

یہ ظاہر ہو کہ جب شیخ ایک طرف از ہر کے طلبا اور نوجوانوں کے حلقوں
میں اور دوسری طرف اخبارات کے ذریعہ سے عوام کے اندر قوم کے سوتے ہوئے
قویٰ کو متحرک کر رہے تھے تو برطانوی ادارے کی بہت بری نظروں ان پر پڑ
رہی ہوں گی۔ شیخ کا وجود جو ہر طرح برطانوی مصالح اور مقاصد کے خلاف
تھا یقیناً برطانوی ”دخل“ کے اہلکاروں کے اندر مخالفانہ جذبات پیدا کر رہا
ہوگا۔ اگر خدیو اسمعیل اپنے ذاتی اغراض کو مد نظر رکھ کر اور اپنے یہ یورپین
قرض خواہوں کو دھمکانے کے لیے قوم پرست جماعت کا قایم رکھنا ضروری
نہ سمجھتا تو شاید آٹھ برس تک شیخ کا مصر میں مقیم رہنا ہی مشکل ہوتا۔

مگر شیخ اسمعیل کے حالات سے بہت مایوس تھے اور در پردہ توفیق
بے سے تعلقات پیدا کر رہے تھے۔ اس زمانہ میں توفیق عام طور پر قوم پرستوں
کا ہمدرد اور معاون سمجھا جاتا تھا اور شیخ کی جماعت کو یہ امید تھی کہ اگر اسمعیل
کسی طرح معزول ہو جائے اور توفیق اس کا جانشین قرار پائے تو غالباً قوم
پرستوں کی امیدیں بھی سرسبز ہو سکیں۔ شیخ کا اثر اب مصر میں اس قدر کافی
قایم ہو چکا تھا کہ نہ صرف مذہبی صحبتوں میں ان کے اجتہادات واجب التعظیم



توفیق پاشا خدیو مصر

۱۸۷۹-۱۸۹۲

سمجھ جاتے تھے بلکہ سیاسی جماعتیں بھی اپنی مشکلات کو شیخ کے مصلے کی طرف لاتی تھیں۔ سطح کے اوپر اسماعیل حقوق طلب جماعت کی آواز سے متاثر نظر آتا تھا اور اس نے اس جماعت کو خوش کرنے کے لیے آئینی اصلاحات کے متعلق اپنا ایک اعلان بھی شائع کرادیا تھا مگر شیخ جانتے تھے کہ یہ سب دھوکہ ہے اس لیے شیخ کے خلوت خانہ میں اسماعیل سے نجات پانے کی بہت سی تدابیر پر غور کیا جا رہا تھا۔ اس صحبتِ راز کے بعض مشوروں کا پتہ مفتی عبدالہ کے بیانات سے چلتا ہے۔ اگر اسی عرصہ میں برطانوی حکومت نے اسماعیل کے معزول کئے جانے پر اصرار کر کے سلطان سے معزولی کے احکام جاری نہ کرا دیے ہوتے تو تعجب نہیں کہ قوم پرست جماعت اسماعیل کے خلاف کوئی کارروائی کرتی۔ معزولی کا حکم تو درحقیقت ”دخل“ کی طرف سے دیا گیا تھا لیکن سلطان نے اپنی سیادت کا نام قائم رکھنے اور اپنی ذلت پر پردہ ڈالنے کے لیے ایک فرمان بھی جاری کر دیا۔ اسماعیل کی معزولی نے اس کو قوم پرستوں کے حلقے سے بچا لیا۔ ورنہ مشورے تو یہاں تک ہوئے تھے کہ اسماعیل کو کسی دن قتل کرادیا جائے۔

القصہ جب اسماعیل کا اقبال جواب دے چکا اور دول نے اس کی معزولی کا فیصلہ کر لیا تو بالآخر ۲۶ جون ۱۹۰۹ء کو اس کے بجائے خدیو توفیق نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔

توفیق کے تقرر نے قوم پرستوں کی اُمیدوں کو تازہ کر دیا۔ لیکن اس وقت تک شیخ کو شاید یہ معلوم نہ تھا کہ توفیق بھی تختِ حکومت پر قدم رکھتے ہی کچھ سے کچھ ہو جائے گا۔ اور یہ کہ تختِ حکومت حاصل کرنے کی امیدوں میں وہ قوم پرستوں کو محض دھوکہ دے رہا تھا۔ توفیق کی سندیٰ

کو ایک مہینہ بھی نہ گزرا تھا کہ اس کا اصلی رنگ ظاہر ہو گیا۔ وہ جن اثرات کی وجہ سے اس مرتبہ پر فائز ہوا ان ہی اثرات کی طرف بھٹکنے لگا، وہ خیالات اور ارادے جن کا وہ قوم پرستوں پر اکثر اظہار کیا کرتا تھا یکسر بدل گئے۔ لیکن وہ زیادہ عرصہ تک اپنی اس دورنگی کو قائم نہ رکھ سکتا تھا اور جب قوم پرستوں نے ایفاءِ وعدہ پر زور دینا شروع کیا اور دوسری طرف دول کے نمائندوں نے دباؤ ڈالنا شروع کیا تو وہ مجبور ہوا کہ اپنے اصلی رنگ میں پوری طرح ظاہر ہو جائے چنانچہ سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ شریف پاشا کو جو شیخ کی جماعت کے رکن تھے وزارتِ عظمیٰ سے برطرف کر کے ان کی جگہ ریاض پاشا کو جو قنصل خانوں کا نیاز مند تھا قلمدانِ وزارت سپرد کر دیا۔ چنانچہ اسی ایک واقعہ نے ہوا کا رخ بخوبی ظاہر کر دیا اور قوم پرستوں کی تمام امیدیں جو رفیق کے ساتھ وابستہ تھیں ختم ہو گئیں۔

اس کے بعد شیخ کی باری تھی۔ توفیق کے لیے اُن کا قیام مصر میں یقیناً تکلیف دہ ہوتا اور خارجی قونصل خانے بھی چاہتے تھے کہ شیخ کو جلد سے جلد نکال دیا جائے۔ چنانچہ توفیق نے ان کے خارج البلد کئے جانے کا حکم جاری کر دیا۔

اس سلسلہ میں ایک واقعہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ -

”روزے یک لورد انگلس در مصر در حالیکہ سید جمال الدین افغانی

ہم حاضر بود افغان ہارا تحقیر کرد و بنار علیہ سید یک چوکی برداشتہ یک

ضربہ قوی بفرق آن لارد اور وہ بود۔ بعد ازاں از مصر مفارقت نمود“۔

لیکن کسی دوسرے سوانح نگار کے بیان سے اس بیان کی تصدیق

نہیں ہوتی۔ بہر حال فوری سبب جو کچھ بھی ہوا ہو مصر سے شیخ کا اخراج اس طرح عمل میں آیا کہ۔

”ایک دن شب کے دو بجے ایک دستہ فوج نے ان کی فرودگاہ بمقام خان خلیل کا محاصرہ کر لیا ان کو سوتے سے جگایا گیا۔ وہ صرف جلابہ (لمبا کرتہ) پہنے سو رہے تھے۔ اُسی حالت میں اُن کو آپشیل ٹرین میں بٹھا کر سوئز بھیج دیا گیا۔ جوں ہی یہ خبر مشہور ہوئی تو سخت ہسجان پیدا ہو گیا۔ اور قریب تھا کہ شورش ہو جائے۔ ایرانی سفیر نے سید صاحب کی خدمت میں تین ہزار پونڈ یہ کہہ کر پیش کئے کہ آپ اپنی بے سرو سامانی کو اس رقم سے دور کیجئے۔ مگر شیخ نے اس رقم کے لینے سے انکار کر دیا۔“

ایرانی سفیر کے متعلق یہ واقعہ اس طرح بھی بیان کیا گیا ہے کہ جب اس نے سوئز جا کر یہ رقم شیخ کی خدمت میں پیش کی تو شیخ نے نہایت تحقیر کے لہجہ میں فرمایا کہ ”اس رقم کو تم ہی اپنے پاس رکھو۔ مجھ سے زیادہ تم کو اس کی ضرورت ہے۔ شیر تو جہاں جاتا ہے اپنے لیے خود غذا پیدا کر لیتا ہے۔“

عثمان غالب افسر پولیس نے توفیق کے حکم سے شیخ کی ایک ہزار کتابیں بھی ضبط کر لیں اور اس طرح بے سرو سامانی کی حالت میں وہ ستمبر ۱۹۴۷ء میں مصر سے رخصت ہوئے۔

مرزا لطف اللہ خان نے اپنے بیانات میں بعض بہت ہی سخت ٹھوکریں کھائی ہیں حتیٰ کہ تاریخی واقعات کو بالکل غلط بیان کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب اعرابی پاشا کو مصر میں شکست ہو گئی اور انگریزی فوجوں

۱۹۷۱ البوسید العربی در ”جہان اسلام“ قسطنطنیہ ۱۹۷۱ بلنٹ در ”روزنامہ“

نے فتح پائی اس وقت شیخ کو بھی مصر سے نکلوا دیا گیا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ شیخ اعرابی پاشا کی قضیہ سے پہلے ہی مصر سے نکالے جا چکے تھے اور جس وقت اعرابی کا قضیہ شروع ہوا ہے تو وہ حیدر آباد اور کلکتہ میں موجود تھے۔ بہر حال مرزا لطف اللہ کی یہ غلطیاں اس قابل بھی نہیں کہ اُن پر ان اوراق میں زیادہ بحث کی جائے۔

شیخ کے ساتھ ہی ساتھ مفتی عبدہ بھی مدرسہ کی ملازمت سے برطرف کر کے قاہرہ سے خارج البلد اور نظر بند کر دیے گئے۔ استاد اور شاگرد دونوں کی امیدیں یوں دفعتاً مایوسی سے بدل گئیں۔ لیکن دونوں نے محسوس کر لیا کہ یہ کھیل جس کو سیاست کہتے ہیں ایک دھوکہ کا کھیل ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ شیخ اس دفعہ مصر سے رخصت ہوئے تو ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ ان کا کام گویا اس ملک میں ختم ہو گیا تھا۔ اور اپنی تحریک کا جو بنیادی پتھر انھوں نے وہاں نصب کر دیا تھا اسی پر بعد کو اُن کے جانشینوں اور عقیدتمندوں نے ایک بہت بڑی عمارت بنالی جو باوجود مصر کی بد نصیبیوں کے اب تک اپنی جگہ قائم ہے۔

مالک اور اقوام کی تاریخوں میں ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں کہ ایک غیر ملک اور نسل کا آدمی کسی اجنبی ملک کو اپنا ملک اور کسی اجنبی قوم کو اپنی قوم بنا کر اور اس طرح ہر قسم کی قربانیاں کر کے اُس ملک کی خدمت کرے اور اس کا رہنما بن جائے۔ سوائے پیغمبروں کے یہ سعاد بہت کم انسانوں کو حاصل ہوتی ہے اور اگر ہوتی ہے تو اُن لوگوں کو جو کسی نہ کسی حیثیت سے پیغمبری سے قریب ہوتے ہیں!۔

مصر کے قوم پرستوں کا قاید اول نہ مصری تھا نہ مصر میں پیدا ہوا

نہ وہاں اُس نے پرورش پائی تھی نہ وہ مصری قوم کی قدیم روایات سے آشنا تھا۔ وہ ایک جگہ نیم وحشی افغان قوم کا فرد تھا جس نے اپنے دور دراز وطن سے مصر آکر آزادی اور حریتِ اسلامی کا علم بلند کیا اور اس طرح مصریوں کی قومی زندگی میں نفوذ حاصل کیا کہ وہ مصر کا بزرگ ترین رہنما اور داعی بن گیا۔ درحقیقت شیخ کی جدوجہد کی بنیادیں اور وطن اور قومیت سے بالاتر تھیں۔ ان کا یہ خیال تھا کہ کوئی بھی اسلامی یا مشرقی ملک ہو اُس کی ترقی میں تمام دنیائے اسلام کی تقویت مضمر ہو۔ وہ دنیائے اسلام کو ایک جسم تصور کرتے تھے اور اسلامی ممالک کو اُس جسم کے اعضائے رئیسہ۔ اس لیے اُن کے خیال میں جو عضو بھی قوی ہو جائے اس کی قوت سارے جسم کی قوت میں اضافہ کرتی تھی۔ یہی نقطہ تھا جس پر شیخ نے اپنے ”پہن اسلامزم“ کی بنیاد قیام کی تھی۔ لیکن شیخ کا پہن اسلامزم بھی درحقیقت ایک بزرگ تر مقصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ تھا۔ جو لوگ شیخ کو صرف بہ اصطلاح سیاست۔ اتحادِ اسلامی کا داعی سمجھتے ہیں وہ محض نصف حقیقت سے آشنا ہیں۔ جیسا کہ شیخ کی زندگی کے حالات سے معلوم ہوتا ہے وہ مغربی اقوام کی ملک گیری اور مشرق پر مغرب کے تفوق کو حد درجہ خطرناک سمجھ کر مغربی استعماریت کے مخالف اور دشمن تھے اور اسی مخالفت اور دشمنی کو نتیجہ خیز بنانے کا ایک ذریعہ پہن اسلامزم تھا جس کی دعوت وہ اسلامی ممالک کو دے رہے تھے۔ شیخ کی تقریروں اور تحریروں کے اقتباسات سے جو کسی دوسری جگہ درج کئے گئے ہیں یہ حقیقت بخوبی واضح ہوتی ہے۔

مصر میں شیخ کے کارناموں کو مختصراً تین حصوں میں تقسیم کیا

جا سکتا ہو۔

(۱) جامعہ ازہر اور علما کی اصلاح اور بیداری - شیخ نے اپنے اجتہادات سے علما اور مذہبی طبقوں کے خیالات و توہمات میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ فلسفہ جدید کے بعض اجزاء کو اپنی تعلیمات کا جزو قرار دے کر انھوں نے مصری قوم کی نوجوان نسل کے اندر بیداری اور قوت عمل پیدا کر دی۔ ان کی نظر کو وسیع اور ان کے خیالات کو بلند کر دیا۔ ایسے نوجوان پیدا کر دیے جو جدید تمدن اور سائنس کے مقابلہ میں اپنے وقار کو قائم رکھ سکتے تھے اور ساتھ ہی علوم جدیدہ سے نا آشنا نہ رہتے تھے۔ شیخ نے مصر میں خالص اسلامی مذہبیت کے ساتھ عہد جدید کی ترقیوں کی روح پیدا کر دی۔ ان کی بہت سی "بدعتوں" کو قدامت پسند طبقہ ناپسند کرتا تھا لیکن باوجود مخالفت کے انھوں نے مذہب کو ازہر کے محراب اور ممبر سے باہر لا کر دکھا دیا کہ اسلام دنیا کی زندگی کے ہر شعبہ میں عملی حیثیت سے کامیاب ہو سکتا ہے۔ قدامت پسند علما قابل ہو گئے اور نئی نسل نے پورے جوش کے ساتھ لبیک کہا۔

(۲) اخبار نویسی کے ذریعہ سے جدوجہد -

پہلی دفعہ مصر کی تاریخ میں شیخ نے پیش قدمی کرنے والے اخبار اور اخبار نویس پیدا کئے اور ملک میں مطابہ حقوق انسانیت کی ایک ایسی آواز بلند کر دی جو آج بھی کسی قوت کے دبائے نہیں دب سکتی۔ قطع نظر دوسری خدمات کے بجائے خود تنہا یہی ایک کارنامہ شیخ کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔

(۳) فلاحین اور عامۃ الناس کی بیداری -

تقریروں، تحریروں، مواعظ اور مختلف تبلیغی تدبیروں سے شیخ نے



عربی پاشا

عامۃ الناس کے دلوں میں مطالبہ حقوق کا وہ جذبہ پیدا کر دیا جس سے آج بھی مصر کی قومی زندگی کا چراغ روشن ہے۔ یہ شیخ ہی کی تعلیمات کا ادنیٰ اثر تھا کہ ۱۸۸۱ء میں ایک غریب فلاطین سپاہی نے وزیر جنگ کے عہدہ تک ترقی کی۔ ظل الکبر پر اعرابی کی مقاومت اور بعد کے تمام انقلابات اسی تخم سے پیدا ہوئے تھے جو شیخ نے مصر کی سرزمین پر ڈالا تھا۔ گو کہ اعرابی کی شورش سے براہ راست شیخ کا یا مفتی عبدہ کا کوئی تعلق نہ تھا بلکہ جیسا کہ شیخ نے عروہ العرفی میں لکھا وہ اس وقت اعرابی کے اس طرز عمل کو دانشمندانہ بھی نہ سمجھتے تھے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اعرابی کی تحریک اسی عام قومی تحریک کا ایک شاخسانہ تھی جس کا بانی مصر میں شیخ کے سوا کوئی نہ تھا۔ فلاطین کی زندگی میں شیخ نے جو مشعل حیات روشن کر دی تھی اُسی کی روشنی اعرابی کو بھی حاصل ہوئی تھی۔ بلنٹ نے اپنی کتاب ”میکریٹ ہٹری آف دی اکیوشن“

میں اس حقیقت کو بخوبی واضح کر دیا ہے۔

جس طرح مصر میں اعرابی کی تحریک شیخ کی تعلیمات کا ایک عکس تھا اسی طرح سوڈان میں مہدی سوڈانی کا خروج بھی شیخ کے لگائے ہوئے دھت کی ایک مضبوط شاخ تھا۔ خود شیخ نے اپنے ایک خط میں بلنٹ کو بتایا ہے کہ مہدی سوڈانی کی جماعت میں شیخ کے بہت سے معتقدین شامل تھے۔ شیخ کے مصر جانے سے پہلے مصری فلاطین کی حالت بھیڑ بکریوں کی حالت سے بہتر نہ تھی مگر شیخ نے اُن مردوں کو زندہ کیا۔

اس طرح مصر کی ہیئت قومی کا کوئی جزو ایسا نہ تھا جو شیخ کے اثرات

سے دور رہا ہو اور بلاشبہ مصری قومیت کا نقشِ اول شیخ ہی کا بنایا ہوا تھا۔ وہاں اب بھی اہلِ نظر شیخ اور شیخ کے ”پیام“ کو بھولے نہیں ہیں۔ مگر آج ہمارے ہندوستان کو دیکھتے تو یہاں بڑے بڑے علامہ بھی شیخ کے نام سے واقف نہیں!۔

ہندوستان۔ پانچواں سفر | مصر کو خیر باد کہنے کے بعد شیخ نے پہلے حجاز جانے کا قصد کیا۔ مگر پھر ہندوستان کی طرف

روانہ ہو گئے۔ مصر کے دورانِ قیام میں برطانوی حکومت ان سے ناخوش ہو گئی تھی اور وہ یہ ضرور جانتے ہوں گے کہ ہندوستان میں اُن کو برطانوی حکومت کی نگرانی میں رہنا پڑے گا پھر تعجب ہو کہ انھوں نے ہندوستان آنے کا کیوں قصد کیا۔ جس قدر واقعات پیشِ نظر ہیں اُن سے شیخ کی اُن مصلحتوں کا کوئی علم نہیں ہوتا جن کی بنا پر وہ بجائے کسی دوسرے ملک کو جانے کے ہندوستان آئے۔ کیا وہ ہندوستان آنے پر مجبور کئے گئے؟ کیا وہ افغانستان جانے کے خیال سے اس طرف آئے؟ یا اُن کے کچھ ایسے خاص احباب ہندوستان میں تھے جن کی وجہ سے انھوں نے اس طرف کا رخ کیا؟۔ بہر حال وہ آخر ۱۹۴۷ء میں پانچویں دفعہ ہندوستان تشریف لائے اور غالباً ممبئی سے براہِ راست حیدر آباد تشریف لیگے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ۱۹۴۷ء کے واقعات کے بعد ہندوستان پر موت کی خاموشی طاری تھی اور اُس وقت نہ یہاں اخبارات تھے نہ سوانح نگار جو شیخ کی زندگی کے حالات کو قلمبند کرتے۔ اس لیے حیدر آباد میں شیخ کی زندگی کے جو حالات معلوم ہو سکے۔ وہ زیادہ تر زبانی اور سماعی ہیں۔ شیخ کے خاص خاص احباب اگر اُس زمانہ میں یہاں تھے تو ظاہر ہو کہ اُن کے

لبوں پر مہریں لگی ہوئی تھیں۔ مصر سے علم و فضل کی جو شہرت لے کر شیخ یہاں آئے تھے اس کے کانٹے ان کے مخالفین کی آنکھوں میں کھٹک رہے ہوں گے اور اس کا کوئی پھول نظروں میں نہ سماتا ہوگا۔ شیخ کا کم و بیش دو برس تک اس ملک میں قیام ہمارے لیے ایک بند کتاب ہے اور ان کے سوانح نگاروں کو ان دو برسوں کے متعلق جو کچھ مواد ملتا ہے اس کے ذرائع صرف یہ ہیں:-

- ۱۔ بلنٹ کا "روزنامہ" چند ورق
- ۲۔ بلنٹ کی کتاب "انڈیا انڈر رین" چند ورق
- ۳۔ رسالہ "معلم شفیق" اور معلم کے چند صفحات
- ۴۔ "رونیچریہ" چند صفحات -
- ۵۔ جبل المتین کلکتہ
- ۶۔ "اودھ اخبار" لکھنؤ
- ۷۔ "مشیر قیصر" لکھنؤ

بس یہ کاینات ہے جو شیخ کی زندگی کے متعلق ہندوستان والوں کے پاس ہے۔ وہ بھی زیادہ تر دوسروں کی دی ہوئی۔ حیدرآباد میں اب ایسے لوگ باقی نہیں جنہوں نے شیخ کی صحبتیں دیکھی ہوں۔ بہت تلاش اور جستجو کے بعد صرف ایک صاحب ایسے ملے جو کبھی کبھی شیخ کی صحبتوں

۵۔ ششہ میں حیدرآباد سے جاری ہوا ایڈیٹر مولوی محب حسین مرحوم

۵۔ ششہ میں حیدرآباد سے جاری ہوا ایڈیٹر محمد سجاد مرزا ایم۔ اے

۵۔ "رد دہریان" فارسی ۴، صفحات مطبوعہ ممبئی ۱۹۷۹ء :- اردو میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ عربی ترجمہ مفتی عبدہ نے "رد علی الدھریں" کے نام سے کیا تھا۔ جو ۱۳۲۰ھ ہجری میں بیروت سے شائع ہوا۔

میں بیٹھے تھے افسوس ہو کہ اُن کے پاس کوئی تحریر یا کاغذ ایسا نہیں تھا جو شیخ کی زندگی سے تعلق رکھتا ہو۔ جب راقم الحروف ان سے ملا تھا تو یہ صاحب بہت ضعیف ہو چکے تھے اور بہ اقتضائے عمر اُن کا حافظہ بہت ضعیف تھا۔ تاہم جو کچھ وہ زبانی بتا سکے اس کا ضروری خلاصہ حسب ذیل ہے۔

"شیخ جب حیدر آباد آئے تو محی الدولہ نواب رسول یار جنگ کے مکان پر مقیم ہوئے۔ عموماً فارسی یا عربی بولا کرتے تھے۔ ترکی اور فرانسیسی زبانیں بھی جانتے تھے۔ مزاج میں غصہ تھا۔ حیدر آباد کے علما فضلا بکثرت ان کی صحبت میں شریک ہوتے تھے۔ مولوی عبدالصمد صاحب اور مولوی ابراہیم صاحب سے اکثر علمی مباحثے ہوتے رہتے تھے۔ ایک دن مولوی ابراہیم صاحب سے "جزو لایتمیز" پر بحث ہوئی اور شیخ نے اس قدر عالمانہ تقریر کی کہ سب لوگ حیران رہ گئے۔ نیچری فرقہ کے بہت خلاف تھے۔ چنانچہ ایک مضمون "مقالہ" انگھوریاں باشوکت و شان" کے عنوان سے مولوی محب حسین صاحب کے رسالہ "معلم" میں شائع کرایا۔ جب مضمون لکھنے والے تھے تو ایک دن احباب سے دریافت کرنے لگے۔ کہ یہاں سب سے کم درجہ قوم کون سی ہے۔

۴۴ - دیکھو ضمیمہ

۴۵ جھنجھانہ کے رہنے والے ایک مشہور عالم و فاضل شخص تھے اور مدرسہ اعزا حیدر آباد کے صدر مدرس تھے۔ دو بھائی تھے غدر کے زمانہ میں دونوں اپنے وطن سے ہاگ گئے ایک حجاز چلے گئے اور ایک حیدر آباد آئے اور یہیں مقیم ہو گئے۔

۴۶ مولوی صاحب موصوف کے صاحبزادے زندہ ہیں انھیں کی عنایت سے مجھے معلم کا پورا فائل میسر آیا جس سے شیخ کے مضامین نقل کیے گئے۔

لوگوں نے بتایا کہ اس کو اگھوری کہتے ہیں یہ سن کر نیچریوں کے متعلق اسی لفظ کو پسند کیا اور اپنے مضمون کا یہی عنوان قرار دیا۔

شیخ کے علم و فضل کا حیدر آباد میں اس قدر شہرہ ہوا کہ سرسالا جنگ اول نے اُن سے ملنے کی خواہش کی اور مولوی مسیح الزماں خاں اُستاد حضورِ نظام کو ان کے پاس یہ پیام لے کر بھیجا۔ شیخ جاکر سرسالا جنگ سے ملے اس ملاقات کا سالار جنگ اعظم پر یہ اثر ہوا کہ انھوں نے مولوی مسیح الزماں خاں اور دیگر اکابر کے ذریعہ سے یہ تحریک کراچی کہ شیخ حیدر آباد میں بہ سلسلہ منصب و ملازمت اقامت اختیار کریں۔

شیخ نے ایک دن نواب رسول یار جنگ سے کہا کہ ”مجھے کوئی کیا نوکر رکھے گا میرا دماغ بگڑا ہوا ہے۔ میرے لیے ایسی کونسی خدمت ہو جو تجویز ہوگی“ پھر ایک دن تنہائی میں نواب صاحب کو سمجھانے لگے کہ ”بات۔ یہ ہے کہ حیدر آباد میں حسد بہت کیا جاتا ہے۔ میری ترقی کو دیکھ کر بہت سے لوگ حاسد بن جائیں گے۔ اور پھر مجھے ذلت کے ساتھ یہاں سے نکلنا پڑے گا اور انگریزوں کو بھی میرے خلاف بھڑکایا جائے گا۔“ ان ہی خیالات کی بنا پر انھوں نے باوجود نواب سالار جنگ کے سخت اصرار کے منصب و ملازمت سے انکار کر دیا۔

شیخ کا ملازم عارف بھی پڑھا لکھا آدمی تھا اور فارسی اور عربی میں گفتگو کر سکتا تھا۔ اکثر شب کو اجاب کے رخصت ہونے کے بعد شیخ اس کو بلا لیتے تھے۔ وہ چائے تیار کر کے لاتا تھا۔ شیخ چاہ پیتے جاتے تھے اور کسی علمی مسئلہ پر اُس سے گفتگو کرتے جاتے تھے۔ شیخ کے عقاید سنیوں کے عقاید تھے۔ نماز بھی وہ سنیوں کے طریقہ پر پڑھتے تھے۔ نواب

رسول یار جنگ نے ان سے فرمائش کی کہ ایک عربی کی لغت مرتب کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے لغت کی ترتیب کا کام شروع بھی کر دیا تھا مگر وہ نامکمل رہ گیا۔ یہی صرف ایک معتبر بیان ہے جو شیخ کے متعلق حیدر آباد میں حاصل ہو سکا اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ خارجی ذرائع سے میسر ہوا ہے۔

بلنٹ اور لیڈی این بلنٹ نے جابجا اپنے سفرنامہ ہندوستان میں شیخ اور ان کے احباب کا ذکر کیا ہے۔ جب یہ دونوں ہندوستان آئے تھے تو شیخ یہاں سے جا چکے تھے مگر یہ دونوں ان کے اکثر احباب سے ملے۔ بلنٹ لکھتا ہے کہ حیدر آباد میں سید علی بلگرامی کو شیخ کی قابلیت کا بہت معترف پایا مگر ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے تھے کہ

”شیخ اس قدر زیادہ سوشلسٹ اور تیز مزاج تھے کہ کسی اصلاحی کام کی تکمیل نہ کر سکتے تھے“ اور اس میں شبہ نہیں کہ ایک حد تک یہ رائے بالکل صحیح تھی۔ شیخ کا خمیر دوسری قسم کا تھا۔ وہ تحریکیں پیدا کر کے فضا کو بدل سکتے تھے، نفعی بنا سکتے تھے معمار اور کاریگر مہیا کر سکتے تھے، لیکن یہ ناممکن تھا کہ وہ خود کسی ایک مرکز پر جم کر کسی ایک ہی کام میں مصروف ہو جاتے۔ ان کی زندگی کا مقصد اس قدر وسیع تھا کہ اس کے کسی ایک جزو کو لے کر وہ بیٹھ رہیں یہ ممکن نہ تھا۔

بلنٹ اور لیڈی بلنٹ کے روزنامچے کے بعض ایسے اقتباسات جن کا تعلق شیخ سے ہے بہت دلچسپ ہیں۔

یکم دسمبر ۱۸۸۷ء شام کو رسول یار جنگ ملنے آئے

.... انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں جمال الدین جیسا ایک عالم بھی نہیں مل سکتا۔

۱۰ دسمبر ۱۸۸۳ء :- رسول یار جنگ نے دو گھنٹہ کا سفر میرے ساتھ کیا کہنے لگے کہ اسی فاصلے تک میں جمال الدین کو بھی رخصت کرنے آیا تھا۔

۲۲ دسمبر ۱۸۸۳ء :- مولوی ایم۔ اے۔ جمال الدین کے قسم کے آدمی ہیں۔ جمال الدین نے ان کے خیالات مسلمانوں کی اصلاح کے متعلق بدل دیے ہیں۔ (یہ صاحب ہائی کورٹ میں مترجم ہیں) انھوں نے مجھ سے کہا کہ جمال الدین کلکتہ کے مسلمانوں سے بہت مایوس ہوئے تھے۔ یہ لوگ گورنمنٹ کے خوف سے ان سے بات تک نہ کرتے تھے۔ جمال الدین نے ان لوگوں کو بہت خود غرض اور حرب وطن سے خالی پایا۔ جمال الدین کی رائے امیر علی کے متعلق اچھی نہ تھی۔ عبد اللطیف کو وہ ڈرپوک سمجھتے تھے۔ اور بقیہ مولویوں کو حد درجہ جاہل۔ ۲۴ دسمبر ۱۸۸۳ء کلکتہ میں مولوی ایم۔ اے کے یہاں جمال الدین کے معقدین سے ملا۔ یہ لوگ جمال الدین کی پرستش کرتے تھے۔ یہ سب ابو نظارہ اور النخل پڑھتے ہیں۔ مگر بہت غریب ہیں۔

یکم جنوری ۱۸۸۳ء :- وہب نوجوان ہیں طلبا اور پر جوش نوجوان۔ مجھے اندیشہ ہے کہ سب انگلستان سے دلی نفرت رکھتے ہیں۔ مذہب کے متعلق ان کے خیالات وسیع تھے۔ درحقیقت وہی خیالات تھے جو جمال الدین کے ہیں۔ جمال الدین کے پانچ دوست ملنے آئے۔ وہ سب نوجوان طلبا ہیں اور انگلستان سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ سب ابو نظارہ پڑھتے ہیں۔ ان میں سے صرف ایک انگریزی جانتا تھا۔ یہ لوگ نہایت صفائی سے ہر مضمون پر گفتگو کرتے تھے۔ مجھے ان کی یہ صاف گوئی بہت پسند آئی۔

۵ جنوری ۱۹۳۷ء: "ایک نوجوان طالب علم تیدا ایم۔ ملنے آئے اور مجھ سے یونیورسٹی کے تجویز کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ انھوں نے کہا کہ تمام مسلمان طلباء اس کام میں مدد کریں گے اگر سید جمال الدین بھی میری کوشش سے اس یونیورسٹی کے پروفیسر بنا دیے جائیں یہ طلباء جمال الدین کی پرستش کرتے ہیں....."

یونیورسٹی کی تجویز کا قصہ بہت دلچسپ ہے۔ حیدر آباد کے قیام کے زمانہ میں شیخ کو یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ مسلمانوں کے لیے ایک یونیورسٹی ایسی بنائی جائے جس میں تعلیم سب مادری زبان میں دی جایا کرے۔ آج حیدر آباد میں دوسرے اہل نظر کے ہاتھ سے یہ تخیل کسی حد تک جامہ عمل پہن چکا ہے۔ لیکن شیخ کی وسعت نظر کو دیکھئے کہ آج سے پچاس سال پہلے وہ اُسی تجویز کو پیش کر رہے تھے جو آج ہر شخص کی رائے میں ایک اہم قومی کام ہے۔ قیام حیدر آباد کے زمانہ میں شیخ نے اس تجویز کے متعلق پُر زور مضامین لکھ کر شایع کرائے۔ اور جب بلنٹ ہندوستان آنے لگے تو پیرس میں اُن سے خواہش کی کہ وہ لارڈ رین کو اس طرف متوجہ کریں۔ چنانچہ بلنٹ نے ہندوستان آکر حیدر آباد و کلکتہ وغیرہ کے اہل الرائے اصحاب سے مشورہ کیا اور پھر لارڈ رین کے سامنے یہ تجویز پیش کی اور سر سالار جنگ کو بھی اپنی رائے سے متفق کر لیا۔ جس وقت حضور نظام پہلی مرتبہ دیس رائے سے ملنے کلکتہ گئے تو بلنٹ وہاں موجود تھے اور وہیں انھوں نے سالار جنگ ثانی اور دوسرے امرا سے تجویز یونیورسٹی کے متعلق گفتگو کی۔ بلنٹ لکھتے ہیں کہ وہ سب آمادہ اور رضامند تھے اور اُن کی رائے تھی کہ یہ تجویز باقاعدہ صورت میں حضور نظام کے سامنے پیش کی جائے۔ چنانچہ.....

۲۵ جنوری ۱۹۳۷ء کو بلنٹ نے یہ تجویز مع ایک خط کے جو حضور نظام

کے نام تھا نواب سالار جنگ کو بھیج دی۔ بلنٹ کے ”روز نامہ“ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے لارڈ رپن سے گفتگو کرنے کے بعد یہ تجویز حضور نظام کی خدمت میں بھیجی تھی۔ چنانچہ اس تجویز کی نقل بلنٹ کے انڈیا انڈر رپن India under Ripon کے ضمیمہ میں درج کر دی گئی ہے۔ حضور نظام کی طرف سے اس تجویز کا جو جواب دیا گیا وہ بھی اُسی کے ساتھ موجود ہے۔ اس جواب کے بعض فقرات نقل کرنے کے قابل ہیں۔

”حیدر آباد دکن ۱۳ فروری ۱۸۸۴ء۔“

”..... ہز ہائینس نے لارڈ رپن سے جب وہ یہاں مختصر زمانہ کے لیے تشریف لائے تھے اس معاملہ کے متعلق گفتگو کی تھی اور ہز ہائینس اس تجویز کو پسند کرنے اور اُس کی حمایت کرنے کے لیے تیار تھے۔ ہز ہائینس اس تجویز کو مسلمانوں کی ترقی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں اور وہ خوش ہوں گے اگر دوسرے مقامات کے مقابلہ میں حیدر آباد کو اس یونیورسٹی کا مرکز بنادیا جائے۔ چونکہ یہ تجویز آپ ہی نے شروع کی ہے اور آپ ہی نے اس کے متعلق ملک کے دوسرے حصوں میں اہل الرائے اصحاب کی آرا معلوم کرنے کی تکلیف برداشت کی ہے اس لئے ہز ہائینس کی خواہش یہ تھی کہ آپ تجویز کو مکمل کرنے کے لیے چند روز اور اس ملک میں ٹھہرتے۔ بہر حال اگر آپ کی دوسری مشغولیت آپ کو پھر ایک دفعہ حیدر آباد آنے کا موقعہ دے سکے تو ہز ہائینس اس معاملہ میں آپ کی امداد حاصل کر کے خوش ہوں گے۔ ہز ہائینس کو مسرت ہے کہ ہز ہائینس دایرے نے بھی اُن سے اس کام میں امداد کرنے کا وعدہ کیا ہے۔“

آپ کا مخلص۔ سالار جنگ۔“

معلوم ہوتا ہے کہ بلنٹ کے ہندوستان سے جلد چلے جانے کی وجہ سے یہ تجویز آگے نہ بڑھ سکی اور ختم ہو گئی۔ لیکن شیخ کا تخیل جس چیز کو پچاس برس پہلے دیکھ رہا تھا وہی چیز پچاس برس بعد کسی نہ کسی طرح عملی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ بلنٹ کے بیانات سے اور نیز دوسرے ذرائع سے اور خود شیخ کی تقریروں اور تحریروں سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی زیادہ توجہ ہندوستانی نوجوانوں کے خیالات کی اصلاح اور نشوونما کی طرف رہی اور نوجوانوں ہی پر شیخ کے اثرات زیادہ تر قائم ہوئے۔ علما اور خواص کی جو حالت اس وقت تھی اُس سے شیخ مایوس ہو چکے تھے اور اس لیے وہ اپنی ساری قوت نئی نسل پر صرف کر رہے تھے۔ ان کے ایک سوانح نگار نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ۔

”سید جمال الدین وقتے کہ بس جوانے در ہندوستان بود چنانکہ بحرکت مشہور اختلاہ بمبار داخل بود۔ ہم چناں پاکسانے کہ در مصر حادثہ اعرابی پاشا حاضر کردہ بودند برابر کار می کرد“۔

لیکن یہ بیان بہت دور از قیاس ہے۔ اول تو شیخ کلکتہ میں صرف چند ہی روز ٹھہرے اور دویم اُن پر حکومت کی سخت نگرانی قائم تھی بلکہ فی الواقعہ وہ نظر بندی کی حالت میں تھے۔ پس یہ کسی طرح ممکن ہی نہ تھا کہ وہ کسی خفیہ سازش میں شریک ہو سکتے۔ اس کے علاوہ شیخ کی فطرت سازشوں اور خفیہ کارروائیوں سے بہت بعید تھی۔ ان کی زندگی میں کوئی چیز کبھی راز بن کرنے نہ رہی۔ اگر اس بیان میں زرا بھی کوئی اصلیت ہوتی تو ہم خود شیخ کی زبان سے ضرور کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ سُن لیتے۔ بات کا چھپانا اور

زبان کو روکنا جانتے ہی نہ تھے۔ خود ان کے اقوال سے ہم کو معلوم ہے کہ اس دفعہ ہندوستان میں وہ سیاست سے بالکل علیحدہ رہے۔ البتہ عام حالات کے متعلق جو خیالات وہ رکھتے تھے ان کا وہ بلا تردد اظہار کیا کرتے تھے۔ لیڈی این بلنٹ نے اپنے ”روزنامچہ“ میں اکثر وہ باتیں لکھ دی ہیں جو شیخ ہندوستان کے متعلق کہا کرتے تھے مثلاً۔

”۱۳ ستمبر ۱۸۵۷ء (پیرس)۔ ہمارے ہوٹل پہنچنے کے بعد ہی جمال الدین آگئے ان سے معلوم ہوا کہ وہ فرانسیسی زبان پڑھ رہے ہیں۔ اور اُن کا قصد جاڑوں بھر پیرس رہنے کا ہے۔ ولفرڈ (بلنٹ) شیخ کی رائے سلطان اور ہندوستان کے متعلق معلوم کرنا چاہتے تھے۔ شیخ نے کہا عبد الحمید خان کے زمانہ سے پہلے ہندوستان میں کوئی شخص بھی سلطان کے متعلق کچھ نہ جانتا تھا نہ ان سے کوئی تعلق رکھتا تھا۔ لوگ بس اتنا ہی جانتے تھے کہ کسی دور دراز مقام پر ایک مذہبی پیشوا ہے۔ اب بھی لوگوں کا یہ خیال نہیں ہے کہ سلطان کو ہندوستان میں کوئی مادی قوت حاصل ہو جائے۔ ہندوستان میں عام طور پر یہ خیال ہے کہ روسی حملہ کریں گے اور انگریزوں کو نکال دیں گے اور یہ کہ یہ واقعہ جلد پیش آنے والا ہے۔ ہندوستان میں روسی جاسوس نہیں ہیں۔ شاید کبھی کوئی جاسوس آجاتا ہو۔ مگر وہ ٹھہرتا نہیں۔ اب روسی مرد تک آپکے ہیں۔ وہاں بہت جلد روسی حکومت قائم ہو جائے گی۔ اور پھر ہندوستان میں بھی روسی جاسوس آیا کریں گے۔

ولفرڈ نے ہندوستان میں البرٹ بل اور لوکل گورنمنٹ ایکٹ کے اختلاف کے متعلق شیخ سے معلومات حاصل کرنی چاہی۔ جمال الدین کا بیان یہ تھا کہ مسلمانوں کو آمادہ کرنا بہت مشکل ہوگا اس لیے کہ وہ اس

بات سے ڈریں گے کہ کہیں اُن کو پھانس کر بھڑاُن کا راز انگریزوں پر نہ کھول دیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ برطانوی ہندوستان گورنمنٹ ہند کے جاسوسوں سے بھرا ہوا ہے۔ جن میں بہت زیادہ ہندو ہیں۔ یہ حالت ہندوستانی " انقلاب کے زمانہ سے ہے۔ شیخ سہسہ کی بغاوت کو " انقلاب " کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔

..... شیخ نے کہا کہ ہندوستان میں گورنمنٹ ہمیشہ مختلف اقوام کے درمیان نا اتفاقی پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ خصوصاً ہندو اور مسلمانوں کے درمیان۔ اور یہ ظاہر اس کو کامیابی بھی ہوتی ہے.....
..... شیخ سے میری گفتگو دیر تک ہوتی رہی۔.....

نامناسب نہ ہوگا اگر اس موقع پر ہم ہندوستان کے متعلق شیخ کے خیالات کا صحیح عکس پیش کرنے کی غرض سے اُن کے بعض ایسے مضامین کے مختصر اقتباسات درج کر دیں جن کا تعلق ہندوستان کے معاملات سے ہے۔ ہندوستان کے متعلق شیخ کی دلچسپیوں کا کافی اندازہ ان اقتباسات سے ہو سکے گا۔

اسی زمانہ میں جب کہ شیخ حیدرآباد میں مقیم تھے اور اہل ہند کے قومی مسائل پر غور و فکر میں ان کا وقت گزر رہا تھا رسالہ معلم (حیدرآباد) میں اُن کا ایک مقالہ " فلسفہ وحدت جنسیت و اتحاد لغت " کے عنوان سے شایع ہوا جس میں شیخ نے اجتماعی زندگی کے بعض اہم مسائل کے متعلق اپنے احساسات کو اس ملک کے سامنے پیش کیا تھا۔ ان کے الفاظ آج بھی اتنے ہی صحیح اور بر محل ہیں جتنے کہ سترہ سال پہلے لیکن شاید اُس وقت ان باتوں کے سمجھنے والے ایسے نہ تھے جیسے آج ہیں۔ شیخ نے علوم جدیدہ

کی تعلیم مادری زبان میں دینے پر زور دیتے ہوئے لکھا تھا کہ :-
 ”ہندوستان کے حالات پر نظر کر کے کہوں کہ اہل ہند میں سے وہ
 لوگ جو نورِ بصیرت کی چوٹی پر آگئے ہیں اور جنسیت کے معنی سمجھنے لگے
 ہیں اور اس کے فائدوں سے واقف ہو گئے ہیں اور مستقبل پر نظر رکھتے
 ہیں اور تدبیر کی خوردبین سے قوموں اور قبائل کے حالات کا راز دیکھتے
 ہیں کیوں اس اہم مسئلہ پر غور نہیں کرتے اور کیوں اس ضروری کام کو
 انجام نہیں دیتے اور کیوں اس کا اہتمام نہیں کرتے۔ کیا وہ نہیں جانتے
 کہ جنسیت کی بقا کا انحصار اس پر ہے کہ مدارس میں تعلیم وطنی زبان میں
 ہو۔ کیا یہ امر باعثِ تعجب نہیں کہ علومِ جدیدہ نے سارے عالم پر قبضہ
 کر لیا ہے اور فنون نے کرۂ زمین کا احاطہ کر لیا ہے۔ لیکن حال یہ ہے کہ
 اس میں سے کسی اچھی چیز کا زبانِ ہندی میں ترجمہ نہیں کیا گیا۔ کیا اہل
 ہند اس نکتہ سے غافل ہو گئے کہ اگر ان کی قومی زبان میں علومِ نافعہ
 ان کی قومی مدنیت کا جزو نہ بنیں گے تو ان کی قومیت کو پایداری حاصل
 نہ ہوگی۔ کیا یہ خبر نہیں کہ عقلا کے ذمہ پہلا فرض یہ ہے کہ دطن کی زبان
 کی تو سمجھ کریں۔ پھر کیوں علومِ جدیدہ کو قومی زبان میں اور خصوصاً اردو
 میں جو بمنزلہ عام ملکی زبان کے ہے ترجمہ کر کے کیوں دوسری زبانوں سے
 جیسی کہ سنسکرت، مرہٹی اور بنگالی ہیں مدد نہیں لیتے اور کیوں وقتِ
 ضرورت اپنی زبان کی کمی پوری کرنے کے لیے لغتِ انگریزی سے مدد
 لیتے ہیں۔ بہت زمانہ ہو گیا قومِ انگریز جو علومِ نافعہ اور فنونِ مفیدہ کی
 استاد ہے ملکِ ہندوستان میں حکمرانی کر رہی ہے۔ پس کس وجہ سے دانشمندان
 ہندوستان اُس سے فائدہ حاصل نہیں کرتے اور اُس کے علوم سے اپنے وطن

کے لیے ایک ذخیرہ حاصل نہیں کرتے۔ اور کیونکر ممکن ہے کہ ان علوم جدیدہ سے اپنے وطن کے لیے ذخیرہ حاصل کریں جب تک کہ اُن علوم کو زبانِ وطنی میں ترجمہ نہ کر لیں اور کیونکر ممکن ہے کہ علوم ملک میں عام ہو جائیں جب تک کہ وہ اس ملک کی زبان میں رائج نہ ہوں اور وہ علوم جو بیگانہ زبانوں میں ہوں کیونکر پایدار ہو سکتے ہیں اور کسی کو فخر کرنے کا کیا موقع ہے اگر اس کے کتب خانے میں غیر زبان کی ہزار ہا کتابیں ہیں حالانکہ قوم کے فائدہ کی ایک کتاب بھی ملکی زبان میں موجود نہ ہو۔ کیا کوئی عاقل دوسروں کے فخر کو اپنا فخر سمجھ سکتا ہے اور کیا سوائے اپنی جنس کے دوسرے کی جنس پر کوئی عقلمند فخر کیا کرتا ہے..... اگر کوئی (سیاچوہا،) یعنی پہلوان پنجہ یہ کہے کہ جدید علوم کا مقصود ایک ہی ہے خواہ وہ وطنی زبان میں ہوں یا غیر زبان میں اور مفید علوم سب انگریزی زبان میں موجود ہیں اور انگریزی قوم عرصہ سے تمام ہندوستان پر حکمران ہے اور غالب کی متابعت اور مماثلت ہر حال میں لازم ہے اس لیے ہم ہندوستانیوں کو چاہیے کہ غالب قوم سے منافع حاصل کرنے اور فوائد حاصل کرنے کے لیے اپنی ہستی کا لباس اتار ڈالیں اور تعین قومیت کی قید کو اٹھا دیں اور یکبارگی غالب قوم کے وجود میں فنا ہو جائیں اور علوم معارف کو فاتح قوم کی زبان میں حاصل کریں اور ان کی زبان کو ہر چیز پر ترجیح دیکر وطنی زبان کے بجائے استعمال کریں بلکہ تمام امور میں ایسا ہی کریں۔ پس ایسے شخص سے کہنا چاہیے کہ اولاً اگر یہ خواہش غالب کی طرف سے ہو تو اس کو غالب کے تعلی اور سخت کے مدِ اعتدال سے گزرنے پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر مغلوب اس بات کو اپنی زبان

پر لائے تو بلا شک اُس کا منشا سوائے خوشامد اور تعلق کے کچھ نہیں
یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ
زبان انگریزی کی تعلیم کو بالکل بند کر دیا جائے بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ زبان
انگریزی کا حاصل کرنا چند وجوہ سے ہندوستانیوں پر لازم ہے۔ نمبر ۲
ان وجوہ کو بیان کرتے ہوئے اپنے مقالہ کو ختم کرنے سے پہلے شیخ
امت انجلیسیہ سے مخاطب ہوتے ہیں اور ہندوستان کے متعلق اس کو
مشورہ دیتے ہیں کہ :-

”جو کچھ یہاں تک کہا تھا اُس کا روئے سخن ہندوستانیوں کی
طرف تھا۔ اب انگریزوں کی قوم سے جو بڑی قوم ہے کہتا ہوں کہ مغربی
قوموں کی حرص و طمع اندازہ سے باہر ہو گئی ہے۔ دولتِ روسیہ نے ایک
قدم مَرُو کی طرف بڑھایا اور ایک ہاتھ استانبول کے دروازہ کی طرف اور
دولتِ فرانسیہ نے ٹیونس کو مضمم کر کے اب طرابلس اور مصر کی طرف نظر
کی ہے اور دولتِ اطالیہ بھی مصر و طرابلس کی فکریں ہے اور دولتِ جرمن
بھی کبھی جزیرہ کریٹ کی طرف نظر کرتی ہے اور کبھی ساحلِ شام پر مستعمرات
کی بنیادیں کرتی ہے۔ انگریزوں کو ہندوستان کی حفاظت کے
لیے بہت قوی وسائل جن سے آرامِ دل حاصل ہو محض استحکاماتِ جبل
الطارق و قبرس و باب المندب و عدن و جزیرہ سقطرہ و کیپ و درہ خیبر
و در بولان و شہر قندھار سے حاصل نہ ہو سکیں گے۔ بلکہ
حفاظتِ کامل اور حراست و اطمینانِ خاطر و سکونِ قلب اُس وقت حاصل
ہے فلسفہ وحدت و جنیت“ از رسالہ معلم ترجمہ از فارسی۔ مکمل مضمون کتاب
کے آخری حصہ میں درج کیا گیا ہے۔

ہوگا جب کہ اپنی حکومت کے استحکامات کو ہندیوں کے قلوب میں مستحکم کر دیں۔ یہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ہندوستانی زبان کو حکومت کی زبان قرار دیں“ ۵

آج جس موضوع پر اخبار و رسائل کے ہزار ہا صفحات کالے کیے جاتے ہیں پچاس برس پہلے اسی موضوع کا ہر پہلو شیخ کے پیش نظر تھا اور اُس زمانہ میں جب ملک کی کوئی سیاسی یا قومی جماعت نہ علی گڑھ اور نہ کانگریس۔ قومی زندگی کی اس ضرورت کو محسوس کرتی تھی۔ شیخ اس کے لیے اپنے قلم اور زبان کی طاقت صرف کر رہے تھے۔

جیسا کہ ان صفحات میں جا بجا واضح ہوگا شیخ کی عادت تھی کہ جو کچھ کہتے تھے صاف صاف کہتے تھے۔ لگی پٹی نہ رکھا کرتے تھے۔ بلکہ بعض اوقات اُن کے الفاظ کی سختی حد اعتدال سے بھی گزر جاتی تھی۔ ہندوستان کے علما اور قدیم طریقہ تعلیم دینوی کے متعلق وہ اکثر اپنے خیالات صاف صاف ظاہر کیا کرتے تھے چنانچہ لکھتے ہیں کہ:-

”..... صاحبو! فی زمانہ مسلمانوں کی تعلیم کا طریقہ شروع سے آخر تک بگڑا ہوا ہے۔ مثلاً عربی کو لیجئے۔ عربی تعلیم کا مفہوم علم نحو کو حاصل کرنا سمجھا جاتا ہے علم نحو کے حاصل کرنے کا اصل نشا اور مقصد یہ ہے کہ صحیح طور پر زبان کا بولنا اور لکھنا پڑھنا آجائے اور بس۔ لیکن مسلمان طلباء کا تمام وقت اُس کی لایعنی بحثوں میں اور فلسفیانہ افکار میں صرف ہو جاتا ہے اور عمر بھر عربی پڑھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ تو عربی میں دو جملے صحیح بول سکتے اور نہ لکھ سکتے ہیں حتیٰ ایں کہ دو سطر بھی صحیح نہیں پڑھ سکتے۔“

۵ ”فلسفہ وحدت وجہیت“ از رسالہ معلم

علم معانی و بیان جس کو ادبیات کہتے ہیں اور جس کی تحصیل سے انسان منشی خطیب اور شاعر ہو سکتا ہو اس کا یہ حال ہو کہ تمام عمر پڑھنے کے بعد روزمرہ کی گفتگو پر بھی طالب علم قادر نہیں ہوتا۔ علم منطق جو میزانِ افکار کہا جاسکتا ہو اور انسان کو حق و باطل اور صحیح و فاسد کا امتیاز کرنے پر قادر کرتا ہو اس کا اثر مسلمان سلطنتوں پر یہ ہوا کہ ان کے دماغ ممکنہ خرافات اور واہیات سے مملو پائے جاتے ہیں۔ اور اُن کے اور بازار یوں کے افکار میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔ علم حکمت جس کا تعلق موجوداتِ خارجہ کے اصول کی بحث سے ہو اس میں مسلمانوں کی یہ کیفیت ہو کہ ”صدری“ اور ”شمس بازغہ“ پڑھ لیا اور خود کو حکیم سمجھنے لگے حالانکہ دائیں بائیں کا فرق نہ معلوم ہوا اور اتنی بھی صلاحیت پیدا نہ ہوئی کہ معلوم کریں کہ خود کیا ہیں کون ہیں اور ان کو دنیا میں کیا کرنا چاہیے۔ کبھی بھولے سے نہ پوچھا کہ یہ تار برقی کیا ہو یہ بخاری کشتی کیا چیز ہو ریل کیسے بنتی ہو اور چلتی ہو۔

صاحبو! میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب میں اُن لوگوں کا خیال کرتا ہوں جو چراغ لئے شام سے صبح تک ”شمس بازغہ“ کا مطالعہ کرتے ہیں اور کبھی اس بات پر غور نہیں کرتے کہ چراغ کی چمپنی نکال دی جائے تو کیوں چراغ دھواں دینے لگتا ہو اور چمپنی لگا دینے سے کیوں دھواں موقوف ہو جاتا ہو۔ نف ہو ایسے حکما پر اور نف ہو ایسی حکمت پر۔ حکیم وہ ہو جو حوادثِ اجزائے عالم پر غور کرے نہ کہ اندھوں کی طرح راستہ چلے جن کو منزلِ مقصود سمجھائی نہیں دیتی۔

مسلمانوں کا علم فقہ حاوی ہو تمام حقوقِ بلدیہ اور دولیہ پر۔ پس

چاہیے کہ مردِ فقیہ صدرِ اعظم یا سفیرِ کبیر ہو سکے حالانکہ ہم اپنے فقہاء کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے گھروں کا انتظام کرنے سے بھی قاصر ہیں۔ اور اپنی ناقابلِ فخر سمجھتے ہیں۔

علمِ شریعت درحقیقت حکمت و قوانین سے واقف کرتا ہے اور مختلف احکام کے عللِ منفعت و مضرت کو ظاہر کرتا ہے لیکن حالت یہ ہے کہ ہمارے شاعرین و علماء قوانینِ مدنیہ کے سمجھنے سے محض عاری ہیں۔ بہر حال ہمارے علماء کی حالت ایک باریک فیلہ کی سی ہے جس پر ایک کمزور شعلہ ٹٹمارا ہوا جو نہ تو اپنے اطراف روشنی پہنچا سکتا ہے اور نہ دوسروں تک اس کی روشنی پہنچ سکتی ہے۔ عالم اگر حقیقی عالم ہو تو اس کی مثال ایک نور کی سی ہو سکتی ہے کہ جس کی روشنی تمام عالم پر پھیلتی ہے اگر تمام عالم کو منور نہ کرے تو اقلًا اپنے گھریا اپنے قریہ یا اپنے شہر کو وہ روشن کر سکتا ہے۔ یہ ہمارے علماء کیسے ہیں کہ چراغ تلے اندھیرے کی مثال ان پر صادق آتی ہے۔

افسوس اور عجب تو یہ ہے کہ ہمارے علماء نے علم کی دو قسمیں قرار دے رکھی ہیں۔ ایک کو علمِ مسلمانان اور دوسرے کو علمِ فرنگ کہتے ہیں۔ اور اس طرح بعض مفید علوم کے حاصل کرنے سے لوگوں کو منع کرتے ہیں۔ اتنا نہیں سمجھتے کہ علم وہ شریف شے ہے جو کسی طریقہ سے مخصوص نہیں... کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ مسلمانانِ علوم کو جو ارسطو اور افلاطون سے منسوب ہیں غایتِ رغبت کے ساتھ سیکھتے ہیں لیکن اگر غالیلہ (گلیلیو) اور کپلر کے علوم کی جانب اُن کی توجہ مبذول کرائی جائے تو اُس کو کفر سمجھتے ہیں! حق وہ ہے جو دلیل اور برہان رکھے جو علماء علوم اور معارف

کے حاصل کرنے کے لیے منع کرتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ہم حفاظت اسلام کر رہے ہیں۔ حالانکہ فی الحقیقت وہ اسلام کے دشمن ہیں۔ وہی مسلمان اسلام کے محافظ ہو سکتے ہیں جو علوم و معارف مختلفہ سے آشنا اور واقف ہوں۔.....الحاصل مسلمانوں کی اصلاح اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ہمارے روساء دین خود اپنی اصلاح نہ کریں اور علوم و معارف سے خود بہرہ ور نہ ہوں۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پہلے خرابی و تباہی ہمارے علمائے دین میں واقع ہوئی اور ان سے یہ عام امت میں سرایت کرتی گئی۔۔۔۔۔“

پھر فرماتے ہیں کہ:-

”..... و باید دانست کہ مراد ما از عالم آں عالم است کہ معارف آں مگر اہان طریق سعادت را ہادی و رہنما باشد۔ و دانشش دلہائے مردہ را حیات و زندگانی تازہ عطا کند و سخنہایش بیماراں دل و مکتت را شفا بخشد۔ و عبارتش چوں مقناطیس اجزائے متشرہ امت را جمع کند و حکماش صیقل دہد نفوس را از کدورت نہ آں عالم است کہ در ظلمت کدہ و خشتناک او ہام نشستہ علی الدوام بہ بہمہ و دہد مرہ مشغول و افساد را اصلاح گمان می کند۔ و خود را نمی داند و راہ بری و دعوی می نماید۔ نہ آں عالے کہ در گورستان ہائے کہنہ و خشت گماں ہا و ویرانہ ہائے سہنناک در می دہد و سخرابی و دمار و ہلاک مژدہ می رساند..... نمبر ۷

۵ "العلم" حیدرآباد جلد دو نمبر ۱۱ ۵۹ - "تعلیم و تربیت" معلم شفیق "جنوری ۱۳۸۱ھ"

اس کے بعد تعصب مذہبی پر یوں تبصرہ فرماتے ہیں کہ :-

..... چوں کلام بدیں جا رسید می خواہم بہ ہزار

تاسف بگویم کہ مسلمانان ہندوستان میں حمایت دین یعنی تعصب

دینی را بسیار بہ ہنج بد بکار برودہ اند کہ موجب بغض علوم و معارف

و سبب تنفر از صنائع و بدائع گردیدہ است و چنان گمان کرد

اند کہ انچہ منسوب بہ مخالفین دیانت اسلامیہ بودہ باشد باید

از روئے تعصب دینی آں را مکروہ و منحوس داشت۔ اگرچہ علوم

و فنون بودہ باشد و حال آنکہ از روئے تعصب دینی برایشان

واجب چنان بود کہ ہر جا فضیلت و کمالے و علیٰ و معرفت بہ بیند

خود ہا را حق دار مے دانستہ در استحصال آں سعی ہا و کوشش

ہا بکار برند و نگزارند کہ مخالفین دیانت حقہ اسلامیہ در فضیلت

از فضایل و در کمالے از کمالات برایشان سبقت گیرند۔ افسوس

ازیں سور استعمال تعصب دینی کہ عاقبت آں بہ تباہی و ضحاک

منجر خواہد شد می ترسم کہ سور استعمال دینی مسلمانان ہند بجلے

برند کہ یکبارگی مسلمانان دست از حیات شستہ۔ زندگانی

را ترک کنند بجهت آں کہ مخالفین آیات اسلامیہ ازیں عالم

زندگانی می کنند۔ لاحول و لا قوۃ الا باللہ العلیٰ العظیم... نمبر۔

پھر عنوان قائم فرماتے ہیں :- ”مجهول مطلق و معلوم مطلق“ اور لکھتے ہیں کہ

..... ”آیا عیب نمی باشد از برائے عالم دانا و حکم بنیا

کہ جمیع عالم را فنون جدیدہ و اختراعات نو و اثنائہ تازہ فرا

۵ ”اسباب حقیقت و سعادت و شغلے انسان“ در رسالہ شفیق معلم۔

گمراہ نہ ہو، بلکہ عالم از عالمی بہ عالمی دیگر منقول شدہ باشد و اوسر
از خواب غفلت نذر آلالیق است محقق را کہ سخن ہادر مجہول
مطلق براند و معلوم مطلق را نداند۔ و در مہیات موبہومہ مؤشگانی
ہا کند و از معرفت امور ظاہرہ باز ماند۔ اس است محل انجہ می خواہم
در اس معنی بیان کنم..... نمبر ۵۲

اُس زمانہ کے ہندوستانی علمائے کرام کے متعلق شیخ کے خیالات ان چند
اقتباسات سے بخوبی واضح ہو جاتے ہیں اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے
کہ آج سے پچاس برس پہلے علما کے جس جمود پر شیخ اظہار افسوس کر رہے تھے
کم و بیش وہی آج بھی موجود ہے۔ ان باریک فیتلوں سے وہی ”کمزور شعلہ“
آج بھی ٹٹا رہا ہے بلکہ چراغ تلے کا اندھیرا اب پہلے سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ ”ظلمت
کدہ و حشتناک اوہام“ میں اب بھی بہت سے یہ بزرگ بیٹھے ہوئے ہیں جس
طرح شیخ نے انہیں بیٹھے دیکھا تھا۔ ”مجہول مطلق“ اور ”معلوم مطلق“ کا بُعد
آج بھی اسی قدر ہے جس قدر پچاس سال پہلے تھا۔ مذہبی تعلیم کا طریقہ آج
بھی وہی ہے جس پر شیخ معترض تھے۔

مسلمانوں اور ان کے علما کی تنگنی نظر کا شکوہ کرتے ہوئے شیخ ایک
عالمگیر رابطہ اسلامی کی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ

”اس صاف اور ظاہر اصول میں غور و فکر کرنے کے بعد

تم کو اس کا سبب معلوم ہو جائے گا کہ مسلمان اتحاد و اتفاق
کی اس مذہبی تعلیم و تلقین کے باوجود کیوں ایک مدت سے اس
کی ضرورت محسوس نہیں کرتے یا محسوس کرتے ہیں تو اس کی

۵۲۔ ”فوائد فلسفہ“ در رسالہ معلم شفیق۔

طرف اقدام نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہو کہ ایک مدت سے ان دینی عقاید کے سوا جو عمل مشترک سے بالکل الگ ہیں اور کوئی جزو ان کے درمیان "جامع" باقی نہیں ہو جس کا نتیجہ یہ ہو کہ آج اُن میں باہمی تعارف تک نہیں اور وہ ایک دوسرے سے بہت بری طرح جدا ہیں۔ اور اُن کا تو کیا ذکر خاص علمائے کرام جن کے فرائض میں عقاید کی حفاظت اور لوگوں کی ہدایت داخل ہو آج ان کا یہ حال ہو کہ ان میں کوئی باہمی مواصلت و مراسلت نہیں۔ ترکی عالم حجازی عالم کے حالات سے بالکل بے خبر ہو مہندی عالم افغانی عالم سے قطعاً غافل ہو۔ بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ایک ہی ملک کے علما بھی باہم کوئی ارتباط و مواصلت نہیں رکھتے۔ پھر جس طرح یہ بیگانگی و جدائی طبقہ علما میں ہو ٹھیک اسی طرح اسلامی سلاطین و امرا میں بھی ہو۔ کیا یہ تعجب انگیز امر نہیں کہ عثمانی حکومت کی سفارت مراقب میں اور مراقبی حکومت کی سفارت عثمانی حکومت میں نہیں ہو۔ کیا یہ نادر واقعہ نہیں ہو کہ دولت عثمانیہ کا کوئی صحیح رابطہ افغانی امارت کے ساتھ نہیں پایا جاتا۔ یہی تفریق اور پراگندہ حالی ہو جس کی بنا پر آج یہ کہنا بالکل صحیح ہو کہ مسلمانوں کی ایک جماعت کو دوسری جماعت اور ایک شہر کے باشندوں کو دوسرے شہر کے باشندوں کے ساتھ کوئی علاقہ اور تعلق نہیں ہو آج ان میں ایک ہلکی قسم کا صرف یہ احساس باقی رہ گیا ہو کہ ہاں فلاں ملک اور فلاں شہر میں بھی کچھ لوگ اُن

کے ہم عقیدہ اور ہم مذہب رہتے ہیں۔

..... جب تم قرآن مجید کی اُن آیتوں کو غور سے دیکھو گے جن میں بہترین فضائلِ اخلاق کی تعلیم دی گئی ہو اور پھر مسلمانوں کی اس حرص اور دل بستگی پر غور کرو گے جو ان کو کتاب اللہ پر عمل، سنتِ رسول اللہ کی تقلید اور اپنے دین اور مذہب کے احترام اور رسول و اصحاب رسول کی تعظیم کے ساتھ ہو تو تم خود بخود یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جاؤ گے کہ اگر علمائے دین اپنے ان وظائف و فرائض کے ادا کرنے پر جو ان پر صاحبِ شرع کے وارث ہونے کی حیثیت سے غاید ہوتے ہیں آمادہ ہو جائیں تو کوئی قوت نہیں جو اُمتِ اسلامیہ کے احیا اور اس کی فضیلت کے اعادہ کی راہ میں روک بن سکے۔ بے شبہ علمائے راسخین فی العلم اور بانغِ نظر مسلمان یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں جو کچھ مصیبتیں مسلمانوں پر آئی ہیں وہ اللہ کی طرف سے ان بے اعتدالیوں کی سزا ہیں جو انھوں نے پچھلے دنوں میں کی تھیں۔ پس علمائے کرام کی ہمت، ان کی غیرتِ دینی اور حمیتِ ملی سے امید ہو کہ وہ شگاف کے پھیلنے سے پہلے اس کے جوڑنے اور مرض کے مستحکم ہونے سے پہلے اس کے علاج و مداوا کی طرف کافی توجہ کریں گے۔ ان کو چاہیے کہ وہ عام مسلمین کو احکام اللہ اور سنتِ نبوی کی پیروی پر ابھاریں اور اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے مطابق ان کے باہمی رشتہ اخوت و الفت کو مضبوط و مستحکم

کرنے کی کوشش کریں۔ نیز یہ کہ لوگوں کے قلوب پر جو یاس اور ناامیدی چھا گئی ہو اس کو محو و فنا کرنے کے لیے اپنی تمام جدوجہد کام میں لائیں اور لوگوں کو یہ بتائیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید ہونا انسانی قلب کی ایک بیماری ہے اور اس کے عقاید کی کبھی ہے جس سے مسلمان یقیناً ہر طرح پاک اور بے عیب ہیں۔

مگر شیخ کے خیالات ایک طرف تو مذہبی تعلیم کے رائج الوقت طریقہ کے خلاف اور علمائے وقت سے برگشتہ تھے اور دوسری طرف علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کے بھی موافق نہ تھے۔ وہ مغربی علوم کی تعلیم کو مسلمانوں کے لیے ضروری سمجھتے تھے مگر نہ اس طریقہ سے جو سرسید نے تجویز کیا تھا۔ سرسید احمد خاں اور ان کی تعلیمی تحریک کے متعلق بھی شیخ نے دورانِ قیام ہندوستان میں جو خیالات وقتاً فوقتاً ظاہر کیے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نہ صرف سرسید کی تعلیمی تحریک پر معترض تھے بلکہ ان کے قومی اور سیاسی اصولوں کے بھی خلاف تھے۔ اور اس قدر خلاف تھے کہ قلم کی انتہائی شدت اور سختی کے ساتھ ان پر تبصرہ کرتے تھے۔ چند اقتباسات درج کیے جاتے ہیں :-

(۱) سرسید اور ان کی قومی تحریک - عجب ترین

ہمہ امور و غریب تر ہمہ چیز ہاں است کہ جاہلے خود را را دانا
شمارد و کورے خود را مینا انگارد و خبیث الفتنے خویش را مطہر
و مقدس پندارد این اکہاں را اگر گوش شنوا بودے می باشد کہ
بقوت بیان و بفصاحت لسان و بعبارات واضحہ و بتقریرات
صریحہ و بضروب امثال و بحکایات گزشتہ و حال و بہ انواع کنایات

و بہ اضافہ اشاراتِ حقیقت روشن و ماہیت گنہش ایشاں را بر ایشاں فہمائند و از فساد طویت و تباہی نیتِ اناں را خبردار کرد بلکہ می شد ایشاں را بریں داشت کہ اقرار کنند کہ جمیع حرکات و سکناات و ہمہ افکار و نیاات ایشاں ناستودہ است و ہمہ افعال و اعمالِ اناں موجب تباہی و خرابی است۔ و این کورانِ مادر زاد اگر چشم بودے ممکن بود کہ نقاشانِ بینا و رسامانِ دانا و پیکر تراشانِ توانا بدست یاری و ضاعتِ نیروی و فطانتِ قبیح و سیرت و شاعتِ سریرت ذرشتی خصایل و نادرتی خیال و جہالت و ضلالت و حماقت و دنایت ایشاں را بصورتِ مصور نمودہ و بہ ہیکلِ مجسم گردانندہ بر ایشاں نشان بدہند تا آنکہ ہر حال و قال خود ہا واقف گردند و لے بسیار افسوس بسیار افسوس کہ این کورانِ مادر زاد را نہ گوش است نہ این کیرِ این مادر زاد را چشم، اگر این کوراں دایں کراں را حاسہ لمس می شد البتہ حوادث و آفاتِ دہر و مصائب و بلیات روزگار و دشواری ہا و شکنجہ ہائے زمانہ ایشاں را بہ غیادت و نئے عقلے و خباثت و بے ادراکی و شرارت و کج اندیشی خود ہا آگاہ می گردانند۔ لیکن صد اسف کہ این کوراں و کراں چوں عضو مشلول قوت لاسہ ہم نہ دارند۔۔۔۔۔ و این بوزنہ ہا دعوی انسانیت می کنند۔۔۔۔۔ فساد کار این اگہوریاں بخوبی ظاہر نہ شدہ است چوں ظاہر انشِ مزوق است اندکے صبر باید شراب زہر آلود اولاًستی می بخشد پس ازاں جگر را پارہ پارہ می کند۔ اگہوریاں

رایار و صدیقی نیست و طریقت و مذہب ہم ندارند
 بریں حال باید گریست و لے خذہ مجال نمی دہد و قامت تاچہ
 بے شرمی تا کجا“ ۵۹۲

(۲) سرسید کی تفسیر قرآن ”..... شنیدم کہ شیخے
 از ایشان در حالت کبریا و کثرتِ تجربات سیاحت ممالک
 فرنگ را نموده و پس از کد و جد بجهت اصلاح مسلمانان تفسیرے
 بر قرآن نوشته است ظاہر شد کہ مقصود ایں مفسر
 اذیں سعی در ازالہ اعتقادات مسلمانان خدمت دیگران و تولید
 و طرق و خول در کیش ایشان است۔ لاجول ولا“ ۵۹۳

(۳) سرسید کا اصول تعلیم ”..... اگر یک بچہ زفرانہ
 گرفتہ و بلاد جرمن فرستادہ شود و در اں بلاد آں بچہ تربیت استاد
 قوی عادت جرمن ہارا فرا گیر و محبت ایشان در دل او ممکن
 شود و قوم و ملت او را در نظرش منفور و حقیر گردد و ایامی
 تو اں چنان گمان کرد کہ آں بچہ خادم و جملہ نفشان امت
 فرانسویہ است و آیا آں شیخے کہ آں بچہ را بدیں نوع تربیت
 کرد متیوان آں را محب فرانہ نامید“ ۵۹۴

اس عبارت میں اگر فرانس کی جگہ ہندوستان اور جرمن کی جگہ انگلستان
 اور ان شیخے کی جگہ سرسید احمد خاں لکھ دیا جائے تو شیخ کا مفہوم صاف

۵۹۲۔ ”شرح حال اگہوریان“ رسالہ معلم شفیق

۵۹۳۔ ”تفسیر و مفسر“ اخبار دار السلطنت کلکتہ

۵۹۴۔ ”شرح حال اگہوریان“ رسالہ معلم شفیق

اور واضح ہو جاتا ہے۔

آگے لکھتے ہیں۔

(۳) ”سرسید اور انگریزی مفاد“..... اللہ۔ اللہ۔ کدام عقل این چنین امرے را تصور می کند کہ بیگانہ جنیت و قومیت دیگران را قوت و پاسداری بہ دہد کہ می پندارد کہ شخصے خانہ خود را خراب کردہ باوجود آن خانہ دیگرے را تعمیر کند۔ اگر بیگانگان چہرہ دست آگاہ شوند کہ خانہ از برائے تاسیس جنیت و تقویت قومیت دیگرے برپا شدہ است آیا آن خانہ را از بیخ دُبُن کندہ بہ باد فنا خوانند داد و یا آنکہ بنارا محکم و مشید خوانند نمود و معمار آن را غلبتِ فاخرہ دادہ بہ رتبہٴ عالیت سرفراز خوانند کرد۔

..... و از برائے اشتباہ کاری و پردہ پوشی در مجمع ہا و محفلہا مقالہ ہائے القامی کردند تا آنکہ دریں روز ہا زانستودہ مرگ خاں، صبر نمودہ خیر خواہی را تفسیر کرد و مقصد حقیقی ہم قطار آپ خود تصریح نمود و پردہ از روئے کار برداشت و حل معنی نمود حقیقتہٴ حقیقتہٴ ہماں یادگار کہ یونانیان از برائے دیو جانس ساختہ بودند باید از برائے ہیں خیر خواہ نیز ساختہ شود۔ چہ معنی دارد سگ از برائے استحصال استخوانے تملق می کند و دُے حرکت می دہد و سر بر پائے معطی نہادہ چہ خودے باشد چہ بیگانہ بجمتِ اظہار خلوص نیت روز ہا در می دہد۔ انسان از سگ ہم کمتر است، لا حول و لا۔ انسان را چنان می زبید کہ در تملق و خضوع ہزار مرحلہ بہ سگ ہا

میٹھی گird واگردُم ندارد ریش ہم کم ازاں نیست - ناستودہ مرگ
خاں ہمیں نکتہ را فہیدہ ازاں بود کہ آواز بر آورد ریش حرکت دار
ونان ہائے خوردہ را حلال کرد - خدا کند کہ ایں شکر سبب مزید
نعمت گردد۔

یہ اقتباسات شیخ کی شعلہ بیانی اور طرزِ استہزا کا ایک ادنیٰ نمونہ ہیں
"ستودہ مرگ خاں" کے پردہ میں شیخ کے ہدفِ ملامت جو صاحب ہیں وہ
سرسید کے خاص اجاب اور شرکارِ کار میں سے ایک تھے۔ ان صاحب کے
خلاف شیخ نے عروۃ الوثقیٰ میں بھی بہت کچھ لکھا ہے لیکن چونکہ خود شیخ نے
ان کا اصلی نام پوشیدہ رکھا ہے اس لیے ضرور نہیں کہ ہم اُس کو بے
نقاب کریں۔ بہر حال جو کچھ شیخ نے ان صاحب کے متعلق لکھا وہ نمونہ
ہے اُن خیالات کا جو اس جماعت کے متعلق شیخ رکھتے تھے مثلاً تفتیک و
استہزا کا ایک اور نمونہ دیکھیے: جمع مرد ہا

ہزار سالہ و دو ہزار سالہ وہمہ استخوان ہا بوسیدہ دریں روز ہا سر
از قبر ہا و دغما بر آوردہ و آواز ہا بسیار بلند ندائے الحیات ،
البعث ، البعث ، النشور ، النشور ، می زنند - اما اگہوریانِ خیر
خواہ بقوتِ تمام الموت ، الموت ، الہلاک ، الہلاک ، الفناء ، الفناء ،
دوامہ می نمایند - بر حال آن قومے کہ خیر خواہ آں اگہوری است
بباید گریست

ہندوستان میں دو سال کے قریب قیام کر کے شیخ اہل ہند کے حالات
سے بخوبی واقف ہو گئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کا شیرازہ قومی کیوں سمجھا
۹۱ "شرح حال اگہوریاں" رسالہ معلم شفیق

ہوا ہے۔ کمزوریاں کیا کیا ہیں۔ اور ان کو کس طرح رفع کیا جاسکتا ہے۔ ذاتی طور پر اُن کا عقیدہ تھا کہ کسی قوم کو بیدار کرنے اور اُس کے اندر قومیت کا احساس پیدا کرانے کے لیے جراید اور اخبار کا اجرا بہت ضروری ہے۔ مصر میں وہ اس تدبیر کے کامیاب نتائج دیکھ چکے تھے اور ہندوستان کے موجودہ اخبارات کی زبانوں عالی کو بھی اچھی طرح دیکھ رہے تھے۔ اس لیے وقتاً فوقتاً مضامین لکھ کر ہندیوں کو اس طرف توجہ دلاتے رہتے تھے۔ چنانچہ ایسے مضامین کے بعض اقتباسات ہم گزشتہ صفحات میں درج کر چکے ہیں۔

ایک موقع پر ہندی نوجوانوں کو اس طرح مخاطب فرماتے ہیں:-

..... تم اس سرزمین کے ہونہار ہو جو ایک زمانہ میں قوانین اور آداب کے لیے شہرہ آفاق تھی۔ اور دنیا ان امور میں اس کی خوشہ چینی کرتی تھی۔ مثلاً قوانین ملتِ روما کو ڈروما، کو دیکھو جو تمام فرنگی کوڑوں کی ماں کہلاتی ہے اس کے اکثر اقوال تمہارے چاروں ویدوں اور شاستر سے لیے گئے ہیں اسی طرح شعرو سخن اور فلسفہ میں تمہارے اسلاف کا وہ درجہ تھا کہ یونانیوں نے اُن کی شاگردی کی۔ مثلاً ایک نامی گرامی شاگرد فیثاغورس گزرا ہے جس نے یونان میں علم و معارف کے وہ سب پھول بکھرے جو اس نے ہند کے گلشنِ علوم سے چنے تھے۔ خاکِ ہند وہی ہے اور تم نوجوان جو اب موجود ہو اسی مٹی اور پانی کے بنے ہوئے ہو۔ میرے لیے یہ باعثِ مسرت ہے کہ تم خوابِ گراں سے بیدار ہو کر اپنے آباءِ اجداد کے ورثہ کی جانب رجوع اور ان کے بوئے ہوئے درختوں کے پھل چُسنے

کے لئے کمر بستہ ہو گئے ہو“ ۵

یہ آخری اقتباس نہ صرف ہندی نوجوانوں کے متعلق شیخ کے خیالات کو واضح کرتا ہے بلکہ ایک بات اور بھی ان الفاظ سے مترشح ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ گو شیخ زیادہ تر اسلام کی خدمت میں مشغول رہے لیکن جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے وہ ہندو اور مسلمان کے درمیان کوئی امتیاز قائم نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اپنا پیغام ”یکساں دونوں قوموں کے سامنے پیش کرتے تھے اور ازراہ تعصب مذہبی ہندو قوم کی قدیم تہذیب اور روایات کو نظر انداز نہ کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ہندوستان کی قسمت ہندو اور مسلمانوں دونوں کی بیداری اور ترقی سے وابستہ ہے۔ اس نکتہ کو انھوں نے عروۃ الوثقی کے بعض مضامین میں بھی اچھی طرح واضح کیا ہے

ہندوستان میں شیخ کی اقامت کے یہ دو سال اسی قسم کی مصروفیت میں گزرے اور حتی الامکان شیخ سیاسی جدوجہد سے بالکل الگ رہے یا کم از کم بہت اعتدال کے ساتھ تھوڑا بہت کام کرتے رہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مصر سے خارج البلد ہو جانے کے بعد ہی اس ملک کی سیاسیات سے شیخ کے تعلقات خطرناک سمجھے جا رہے تھے۔ چنانچہ ۱۸۸۵ء میں جب مصر میں قومی تحریک نے ایک انقلابی صورت پیدا کی اور فلاصین کے اندر ایک عام بیچینی رونما ہوئی جس کے رہنما اور نمائندے اعرابی پاشا تھے تو ہندوستان میں برطانوی حکومت کی نظریں شیخ پر پڑنے لگیں۔ اعرابی پاشا خود فلاصین میں سے تھے اور بہت ادنیٰ حیثیت سے ترقی کر کے وہ بالآخر وزارت جنگ کے اعلیٰ عہدہ تک پہنچے تھے۔ اس زمانہ میں اعرابی سے زیادہ کوئی شخص مصری

۵ اقتباس از تقریر در مکتبہ - (اخبار دار السلطنت)

۱۸۸۱-۸۲ء میں جب بلنٹ مصزگئے تو انھوں نے اعرابی کی تحریک کو بہت تقویت پہنچائی لارڈ کرومر نے لکھا ہے کہ:-

”انھوں نے (بلنٹ نے) اپنی شاعرانہ فطرت کی وجہ سے اپنے کو پورے
جوش و خروش سے اعرابی کی تحریک میں ڈال دیا۔ اور وہ اعرابی کے دوست
مشیر۔ رہنما۔ فلاسفر اور شریک کار بن گئے۔ مسٹر بلنٹ نے دیکھا کہ جس
تحریک سے اُن کا واسطہ پڑا ہے وہ کسی حد تک بلاشبہ ایک قومی تحریک
ہے۔“

اغرابی چونکہ خود ایک فوجی آدمی تھا اس لیے اس کی تحریک فوج میں سب سے زیادہ کارگر ہوئی اور انگریزی "دغل" کے لیے فوجی اثرات کا مصری معاملات پر حاوی ہونا بہت ہی دشتناک تھا۔ اعرابی اور ان کی جماعت کی وجہ سے فوج میں بچینی پیدا ہو چکی تھی اور ہر طرف سے یہ مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ سرکاری محکموں اور خصوصاً فوج میں سے یورپین عنصر کو خارج کیا جائے۔ دول اور خصوصاً برطانیہ اور فرانس کے درمیان اس صورت حالات پر قابو پانے کے متعلق مشورے ہو رہے تھے اور آخر کار جنوری ۱۸۸۲ء میں ان دونوں حکومتوں کی طرف سے وہ متفقہ یادداشت مصری حکومت کو بھیجی گئی جو اسکندریہ کے بیوہ اور طلل الکبر کے ہنگامہ کی اصلی بنیاد تھی۔ اس یادداشت میں برطانوی اور فرانسیسی "دغل" کو زیادہ موثر اور قوی کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ فوج اور پولیس اور ایٹا

س۔ - مصر جدید۔

کو کلیتاً برطانوی اور فرانسیسی نگرانی میں لینے کی تجویز ایسی نہ تھی جس کو مصری قوم پرست ایک لمحہ کے لیے بھی قبول کر سکتے۔ دارالامرا میں زیادہ تر ایسے لوگ موجود تھے جو فوج کے زیر اثر تھے اور خود اعرابی وزیر فوج تھا۔ خدیو توفیق اس وقت قوم پرستوں کے اثر سے باہر اور دوسری طرف ملا ہوا تھا لیکن علانیہ اعرابی کی مخالفت کرتے ڈرتا تھا۔ اُسی زمانہ میں اعرابی کو پتہ چلا کہ اس کے قتل کرنے کی سازش کی گئی ہو اور اُس سازش میں فوج کے کچھ افسران بھی شامل ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ گرفتار کر لیے گئے۔ فوجی عدالت نے ان لوگوں کو خارج البلد کئے جانے کا حکم دیا لیکن خدیو نے برطانوی اور فرانسیسی حکومت کے مشورہ کے مطابق ان افسران کی سزائیں تخفیف کر دی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وزارت اور خدیو کے درمیان تعلقات منقطع ہو گئے۔ فوجی جماعت میں اس وقت ایک گروہ ایسا موجود تھا جو خدیو کو معزول کر کے مصر میں ایک جمہوریہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ اسی لیے اعرابی پاشا کے متعلق فرانس اور برطانیہ نے یہ طو کر لیا کہ ان کو جس طرح ہو سکے مصر سے نکال دیا جائے۔ چنانچہ مئی ۱۸۸۲ء میں سرکاری طور پر یہ مطالبہ مصری گورنمنٹ سے کیا گیا کہ اعرابی فوراً مصر سے چلے جائیں۔ اور وزارت استعفیٰ دیدے۔ وزارت نے استعفیٰ دیدی لیکن خدیو کو ایک تحریر بھیجی جس میں اُس پر صاف صاف یہ الزام لگایا گیا کہ اس نے دول کے مطابق قبول کر کے اپنے وعدوں کے خلاف اجنبی قوم کی مداخلت کو منظور کر لیا ہے۔ اب تمام ملک میں ایک آگ لگ چکی تھی اور ہر طرف سے مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ اعرابی کو وزارت جنگ کے عہدہ پر سجال کیا جائے۔ حتیٰ کہ ۲۸ مئی کو تمام مذاہب کے پیشوا اور علما کا ایک وفد خدیو کے پاس گیا

اور مطالبہ کیا کہ اعرابی کا وزارتِ جنگ کے عہدہ پر دوبارہ تقرر کیا جائے۔
 بشکلِ خدیو نے اس مطالبہ کو منظور کیا۔ لیکن خدیو کا فیصلہ فرانس اور انگلستان
 کے نشا کے خلاف تھا۔ اس لیے اب اعرابی کی قوت کو بزورِ شمشیر توڑنے
 کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ لارڈ کرومر اعرابی کے دوبارہ تقرر کا ذکر کرتے ہوئے
 لکھتا ہے کہ :-

”تاہم انجام اب دور نہ تھا اور ہر روز یہ امر زیادہ واضح ہوتا جاتا تھا
 کہ سوائے فوجی قوت کے اور کسی طرح اعرابی کو دبایا نہ جاسکیگا۔ اور یہ کہ اگر
 کوئی دوسرا فوجی قوت استعمال کرنے پر راضی نہ ہوگا تو پھر انگلینڈ ہی کو یہ
 کام کرنا پڑے گا۔“.....“

دو تین مہینہ کے اندر مصر کے حالات میں عجیب انقلاب پیدا ہوا۔ ملکی
 اور غیر ملکیوں کے درمیان سخت کشمکش پیدا ہو گئی اور وسط جون تک ۱۴ ہزار
 عیسائی مصر سے ترکِ اقامت کر کے جا چکے تھے اور چھ ہزار اور جہازوں کے
 انتظار میں تیار تھے۔ بعض مقامات پر ملکی اور غیر ملکی عناصر کا تصادم بھی
 ہو چکا تھا۔ جولائی میں انگلستان نے فیصلہ کیا کہ اپنی بحری اور فوجی طاقت
 اعرابی کے خلاف استعمال کرے۔ چنانچہ اسکندریہ پر برطانوی جہازوں نے
 گولہ باری کر کے اس کے استحکامات کو منہدم کر دیا اور مصری فوج کو شہر
 خالی کر دینا پڑا۔ لیکن تمام شہر میں بلوہ ہو گیا اور کئی دن تک شہر کے مختلف
 حصوں میں آگ لگی رہی۔ بالآخر برطانوی فوج نے اسکندریہ پر قبضہ کر لیا
 اور یہ سب کچھ جس وقت ہو رہا تھا اس وقت قسطنطنیہ میں سلطان ترکی
 جن کی سیادت مصر پر ابھی برائے نام قائم تھی اور قاہرہ میں خدیو جو مصر کے

حاکم کہے جاتے تھے عضوِ معطل ہو گئے تھے۔ اسکندریہ پر گولہ باری کرنے کے بعد برطانوی فوج نے اعرابی پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اعرابی نے اپنے اہل ملک کے نام ایک اعلان شائع کیا جس میں اُس نے لکھا کہ۔

”مصریوں اور انگریزوں کے درمیان ایک ناقابلِ صلح جنگ جاری ہو اور وہ تمام لوگ جو اس وقت اپنے ملک کے ساتھ دغا بازی کریں گے نہ صرف فوجی قانون کے مطابق سخت ترین سزا کے متوجہ ہوں گے بلکہ دنیا میں آئندہ ہمیشہ کے لیے ملعون ہو جائیں گے.....“

القصد ۱۳ ستمبر کو طل الکبر پر وہ آخری معرکہ پیش آیا جس نے اعرابی اور مصر کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ اعرابی کو شکست ہوئی اور وہ گرفتار کر لیا گیا۔ اور بقول لارڈ کرومر کے یہ ثابت ہو گیا کہ۔

”مصریوں کے لیے جو پالیسی اعرابی نے سمسہ میں اختیار کی وہ ایسی تھی کہ نہ وہ اُس وقت قابلِ عمل تھی نہ اب ہو“

اعرابی کی گرفتاری اور جلا وطنی کے ساتھ ہی مصر کی یہ ملکی پالیسی ختم ہو گئی اور اس طرح انگلستان کو مصر میں نہ صرف ایک فوجی بلکہ ایک سیاسی فتح حاصل ہوئی۔ جس وقت مصر میں یہ واقعات پیش آرہے تھے شیخ کو دھنّا حیدر آباد سے انگریزی نگرانی میں کلکتہ پہنچا دیا گیا۔ اور وہ وہاں نظر بندی کی حالت میں رکھے گئے۔ بلٹ اپنے روزنامچہ میں شیخ کی نظر بندی کا بڑا سبب یہ بتاتا ہو کہ۔

”۱۱ ستمبر کو قصر عابدین کے سامنے جو قومی مظاہرہ ہوا تھا اس کے سلسلہ میں اعرابی نے فخریہ یہ کہہ دیا تھا کہ وہ ہندوستان میں بھی انگریزوں

کے خلاف بغاوت کرا سکتا ہو۔“

اعرابی کے اس قول کے معنی غالباً یہ سمجھے گئے کہ شیخ کے ذریعہ سے مصری قوم پرست ہندوستان میں بھی انگریزوں کے خلاف بغاوت کرانے کی فکر میں ہیں۔ اسی اندیشہ کی بنا پر شیخ کلکتہ میں اُس وقت تک نظر بند رکھے گئے جب تک کہ مصر میں شورش ختم نہ ہو گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کی نظر بندی محض سرکاری نگرانی سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ وہ نہ کسی جیل میں رکھے گئے نہ سرکاری مہان تھے بلکہ حاجی مرزا عبدالکریم شیرازی کے پاس ٹہرے ہوئے تھے اور یہ ظاہر آزادی کے ساتھ لوگوں سے ملتے جلتے رہتے تھے۔ صحیح طور پر یہ معلوم نہیں کہ وہ کس قدر عرصہ تک کلکتہ میں مقیم رہے بہر حال مصر میں شورش ختم ہو جانے کے بعد شیخ کو کلکتہ سے روانگی کی اجازت مل گئی۔

اغلباً آخر ۱۸۵۳ء میں شیخ کلکتہ سے روانہ ہوئے لیکن اس وقت سے ۱۸۵۴ء کے موسم بہار تک جب وہ لندن پہنچے اُن کی نقل و حرکت کا صحیح پتہ نہیں چلتا۔ بلٹ لکھتا ہے کہ مفتی عبدہ نے بیان کیا کہ ہندوستان سے شیخ پہلے امریکہ گئے اور وہاں سے لندن۔ بعض دوسرے سوانح نگاروں نے بھی یہی قیاس کیا ہے کہ وہ پہلے امریکہ گئے جہاں انھوں نے امریکن قومیت حاصل کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئے۔ مرزا الطف اللہ خاں کا بیان بھی مبہم ہے۔

”از ہند بہ امریکہ رفت یا ابتدا بہ لندن می رود“

ایک دوسرا سوانح نگار لکھتا ہے کہ۔

”وہیں از اقامت یک چند روز بہ نیت رفتن امریکہ از ہندوستان

جدا شدہ اما بعد ہا از رفتن امریکہ ہم صرف نظر کردہ بہ لندن رفت۔
لیکن ایک زیادہ تفصیلی بیان "تاریخ افغانستان" کے مترجم
کا ہر جو اپنے والد کے حوالہ سے (جو شیخ کے شاگرد تھے) لکھتے ہیں کہ:-
"نظر بندی سے آزاد ہو کر سید صاحب ۱۲۹۹ھ ہجری میں کابل
روانہ ہوئے اور تقریباً چار ماہ وہاں رہے۔

امیر عبدالرحمن خاں نے آپ کی بڑی قدر کی کیونکہ سید صاحب نے
گذشتہ جنگوں میں ان کے بھائی محمد اعظم خاں کی مدد کی تھی۔ سید صاحب
چاہتے تھے کہ افغانی حکومت دستوری اصول پر قائم کی جائے لیکن امیر صاحب
چونکہ دستوری حکومت کا قیام پسند نہ کرتے تھے اس لیے انھوں نے سید صاحب
سے کہا کہ افغانستان ایک چھوٹا ملک ہے مناسب ہے کہ کسی بڑی اسلامی سلطنت
میں دستوریت کی بنیاد ڈالی جائے۔ جب سید صاحب کو افغانستان میں کامیابی
نہیں ہوئی تو وہ ہندوستان کے راستہ سے یورپ روانہ ہوئے۔ قیام
کابل کے زمانہ میں میرے والد محترم پہلی بار ان سے ملے اور چار ماہ تک
ایک شاگرد کی حیثیت سے ان کے ساتھ رہے۔ پھر والد صاحب ہندوستان
آئے اور سید صاحب سے دوبارہ بمقام گوالیار ملاقات ہوئی۔ پانچ
چھ روز گوالیار میں ٹھہرنے کے بعد سید صاحب گئے اور وہاں سے
سیمر اور بیورہ ہوتے ہوئے سیہور آئے اور ایک روز سیہور قیام کر کے
دوسرے دن بھوپال آئے۔ اس سفر میں جمال الدین ایک پیر کی حیثیت
سے رہے۔ گوالیار میں بہت سے لوگوں کو اپنا مرید بنایا۔ بھوپال میں
قاضی عبدالحق صاحب کے مہمان رہے۔ پھر بمبئی کا قصد کیا اور وہاں سے
سلسلہ "جریہ مصورہ" مطبوعہ ثبات استانبول۔

سیدھے لندن روانہ ہوئے۔ زمانہ قیام بھوپال میں آپ کی کچھ شہرت نہیں ہوئی کیونکہ اس زمانہ میں وہاں جماعت اہل حدیث کا بہت زور تھا اور اُس عہد کے ظاہر میں اشخاص جمال الدین جیسے مدبر کے اقوال سمجھنے کی قابلیت نہ رکھتے تھے۔ لہذا سید صاحب نے خاموشی سے یہ سفر ختم کر دیا۔.....
یہ تمام واقعات ۱۲۹۹ھ ہجری کے ہیں.....“

اس بیان کی تصدیق کسی دوسرے بیان سے نہ ہو سکی۔ لیکن چونکہ دوسرے وقائع نگاروں نے شیخ کے متعلق اس زمانہ کے واقعات قلمبند نہیں کئے۔ اس لیے صرف یہی ایک بیان ہے جس سے کلکتہ اور لندن کے درمیانی زمانہ کے متعلق کچھ تفصیلات حاصل ہوتی ہیں۔ راوی غیر معتبر نہیں ہیں۔ اور جس طرح انھوں نے خود اپنے والد کے شیخ سے ملنے اور شیخ کے بھوپال آنے کا تذکرہ کیا ہے اُن کا طرز بیان قرین قیاس ضرور معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال اگر یہ بیان صحیح ہے تو شیخ نے افغانستان اور ہندوستان کا ایک آخری سفر کیا اور اس کے بعد پھر وہ مغرب سے مشرق کی طرف کبھی واپس نہ آئے۔ بلکہ زندگی کے اختتام تک ان کی آواز مغربیوں کے سیاسی مرکزوں پر بلند ہوتی رہی۔ افغانستان ہندوستان اور مصر کے حالات سے باورس ہو کر اب وہ چاہتے تھے کہ وہاں کچھ کام کریں جہاں مشرقی اقوام کی قسمت کے فیصلے کئے جاتے ہیں!

دورثالث و آخر

Tenilly, je vous prie de
l'interposer de mon respectueux
hommage ainsi qu'à celui
de l'honorable Mohamed Abdo
auprès de Madame Blunz.

Avec
جمال الدين الحسيني

لندن وپیرس

۱۸۸۳ء کے موسم بہار میں شیخ لندن پہنچے لیکن وہ وہاں کچھ زیادہ عرصہ نہ ٹھہرے بلکہ چند ہی روز ٹھہر کر دنیا کے سیاسی مہاجرین کی اُس جاتے پناہ کو چلے گئے جس کا نام پیرس ہے۔ وہ طر کر چکے تھے کہ پیرس میں بیٹھ کر اسلامی ممالک کی آزادی کے لیے پروپیگنڈہ کریں گے۔ یہ ناممکن تھا کہ شیخ کسی جگہ جاتے اور خاموش بیٹھ رہتے۔ چنانچہ پیرس کے روزناموں اور رسالوں میں شیخ کے مضامین و خیالات کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا اور بہت جلد اُن کا نام اہل علم و سیاست کی محفلوں میں لیا جانے لگا۔ عالم فرانسوی رینان نے اسی زمانہ میں اسلام کے متعلق ایک بحث چھیڑی تھی۔ شیخ کب چپ رہنے والے تھے۔ اُن کے جوابات "ژورنل دی با"

اور ریویو سائنٹفک میں شائع ہوئے۔ اس وقت فرانس کی علمی دنیا میں یہ دو پرچے چوٹی کے پرچے سمجھے جاتے تھے۔ شیخ کے مضامین کی انھوں نے بہت قدر کی۔ شیخ نے اپنے مضامین میں مغربی دنیا کے سامنے اسلام کے متعلق

گویا ایک نیا زاویہ نظر پیش کیا ہے۔

بحث کا موضوع رینان کا یہ دعویٰ تھا کہ اسلام کی تعلیمات جدید سائنس و علوم کے عمل کے مخالف ہیں۔

رینان نے ۲۹ مارچ ۱۸۷۷ء کو پیرس کی سوریون (

دار الفنون میں فرانس کی سائنٹیفک ایسوسی ایشن کے روبرو وہ لیکچر دیا تھا جو اس بحث کی بنیاد قرار پایا۔ ان کا عنوان "اسلام اور علم" تھا رینان نے اس لیکچر میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ "ابتداء میں گو کہ اسلام نے اسلامی ممالک میں سائنس کی ترقی کو نہیں روکا مگر بعد کو اس نے علوم کی تحریک کو سرسبز نہ ہونے دیا بلکہ اس کو سخت نقصان پہنچایا" شیخ نے ژورنل دی بابیں رینان کے اس بیان کی تردید کی اور ثابت کیا کہ اس باب میں اسلام سے زیادہ خود عیسائیت کا طرز عمل قابل اعتراض ہے۔ رینان نے جواب الجواب میں لکھا کہ "اگرچہ کہ دونوں مذاہب میں سائنس کے خلاف اسپرٹ موجود تھی تاہم عیسائی ممالک نے کسی حد تک اپنے تئیں اُس اسپرٹ سے آزاد کرایا مگر اسلام ایسا کرنے سے قاصر رہا۔ گو یہ امید ہے کہ روشن خیال مسلمان بالآخر اس قسم کی آزادی حاصل کر لیں گے"۔

رینان کا وہ لیکچر اور بعض دوسرے علما کا جواب اور جواب الجواب اردو زبان میں بھی شائع ہو چکا ہے لیکن اس رسالہ کے مؤلف کو بھی شیخ کا وہ جواب دستیاب نہ ہو سکا جس میں رینان کے خیالات پر تنقید کی گئی تھی اور جس کے سے "اسلام اور علم" کے عنوان سے شیخ کے یہ مضامین کا لمان یسوی نے تصانیف رینان کے مجموعہ میں شائع کئے ہیں۔ نیز رینان کا لیکچر اور شیخ کے جوابات حسن آفندی عاصم نے بزبان عربی مصر میں شائع کئے۔

جواب میں رینان نے شیخ کے منصفانہ اور عالمانہ طرز استدلال کا اعتراف کیا تھا۔
بہر حال رینان کے آخری جواب کا ایک اقتباس اس بحث کے بعض اہم اجزا کو واضح کر دیتا ہے۔ رینان لکھتا ہے کہ۔

”ایک حیرت انگیز ذہانت کے افغانی شیخ نے اپنے اثنائے
قیام پیرس میں میرے خطبہ پر رسالہ دیبا کی اشاعت مئی ۱۸۸۷ء
میں بعض اعتراضات کئے ہیں جن کا جواب دوسرے ہی دن
اسی رسالہ میں میں نے دیا تھا جو حسب ذیل ہے۔“

”سوہلون میں میری پچھلی تقریر پر شیخ جمال الدین نے نہایت
منصفانہ اعتراضات کئے ہیں جو اُس دل چسپی کے ساتھ جس کے
یہ مستحق ہیں پڑھے گئے۔ اس روشن خیال ایشیائی کے ضمیر کو اس
کے اصلی اور مخلصانہ مظاہر میں مطالعہ کرنے کے لیے اس سے
زیادہ سبق آموز طریقہ اور کوئی نہیں ہے۔ چاروں طرف سے عقلیت
کی تائید میں بالکل مختلف صداؤں کو سننے سے آدمی اس نتیجہ پر
پہنچتا ہے کہ اگر مذہب انسانوں کو متفرق کر سکتا ہے تو عقل ان کو
متحد کرنے والی ہے۔ نفس انسانی کا اتحاد ایک زبردست اور
اطمینان بخش نتیجہ ہے جو ٹھنڈے دل سے غور و فکر کرنے سے
حاصل ہوتا ہے۔ جب کہ ان نام نہاد مافوق الفطرت الہامات کے
معاندانہ دعوے تہ کر کے ایک کونے میں رکھ دیے جائیں۔
مذہبی جوش اور توہمات کے خلاف تمام دنیا کے متدین فلاسفہ
اور عقلاء کی جماعت دراصل ایک ناقابلِ درک اقلیت ہے۔ لیکن
یہی جماعت ہمیشہ قائم رہنے والی ہے۔ کیونکہ یہ صداقت پر مبنی ہے

اور اس کا انجام آخر میں کامیابی اور فتح و نصرت ہو گا جب کہ اُن کے مخالفین کے اساطیر ایک طویل حالت تشنج میں ختم ہو کر رہ جائیں گے۔ تقریباً دو مہینے پیشتر شیخ جمال الدین سے میری ملاقات ہوئی جس کے لیے میں اپنے رفیق ایم۔ غاتم کا ممنون ہوں اور زیادہ تر اُن ہی کے ساتھ میری گفتگو نے مجھے اپنے لکچر کے لیے علمی روح اور مذہب اسلام کے باہمی تعلق کا موضوع انتخاب کرنے پر آمادہ کیا۔ شیخ جمال الدین ایک افغانی ہیں جو اسلام کے تعصب سے یکسر خالی اور تامل مبرا ہیں۔ وہ ہندوستان کی سرحد بالائی ایران کی اُن طاقتور نسلوں میں سے ہیں جن میں اسلام کے سطحی لباس کے اندر آئین روح اب تک پوری قوت کے ساتھ جھلک رہی ہے۔ یہ اس صداقت کا زبردست ثبوت ہے جس کا ہم نے کئی بار اظہار کیا ہے کہ مذاہب کی قدر و قیمت کا اندازہ اُن نسلوں کی قدر و قیمت سے کرنا چاہیے جو ان مذاہب کو اختیار کیے ہوئے ہوں۔ ان (شیخ) کی آزاد خیالی اُن کی شریفانہ اور وفادارانہ خصلت نے ان کی موجودگی میں مجھے یقین دلایا کہ میرے پرانے ملاقاتیوں میں سے ایک ابن سینا ایک ابن رشد یا ان زبردست ملحدین میں سے جو پانچ صدیوں تک نفس انسانی کی ناپیدگی کرتے رہے ہیں کوئی ایک دوبارہ زندہ ہو کر میرے سامنے آ گیا ہے۔ یہ تضاد مجھے خاص طور پر اُس وقت نظر آیا جب کہ میں نے ایران کے علاوہ دوسرے اسلامی ممالک کے مشاہدہ سے اس حیرت انگیز مشابہت کا مقابلہ کیا۔ ان ممالک کی (جہاں علمی (سائینٹفک) اور فلسفیانہ شوق اس

قدر نایاب شہر، مذہبی فتوحات کے خلاف نسلی احتجاج کی ایک بہترین مثال شیخ جمال الدین ہے جو ایسے موقع پر پیش کی جاسکتی ہے۔ وہ ان باتوں کی تصدیق کرتے ہیں جو یورپ کے مستشرقین نے بار بار کہی ہیں۔ یعنی یہ کہ جاپان کو چھوڑ کر صرف افغانستان ہی تمام ایشیا میں ایک ایسا ملک ہے جو اکثر ان ترکیبی عناصر کا حامل ہے جس کو ہم ایک قوم کہتے ہیں۔

شیخ کے فاضلانہ مضمون میں مجھے صرف ایک نقطہ نظر آتا ہے جس پر ہمیں صحیح طور پر اختلاف ہے۔ یعنی ان عظیم الشان مجموعہ واقعات میں جن کو فتوحات اور سلطنتیں کہتے ہیں تاریخی تنقید کی بنا پر ہم جو امتیازات کرتے ہیں ان کو شیخ تسلیم نہیں کرتے۔ سلطنت روم نے جو کئی باتوں میں عربی فتوحات کے ساتھ مشترک تھی لاطینی زبان کو سو لھویں صدی تک تمام مغربی دنیا میں نفس انسانی کا آلہ بنا دیا۔ البرٹس اعظم راجر بکن اور اسپینوزا نے جو کچھ لکھا ہے وہ لاطینی زبان میں ہے یا اس ہمہ وہ ہمارے نزدیک لاطینی نہیں۔ انگریزی ادبیات کی تاریخ میں بیڈ اور آلکون کا جو درجہ ہے وہی درجہ فرانسیسی

ادب میں گریگوری آف تورس اور ابلارڈ کو حاصل ہے۔ یہ بات بھی نہیں ہے کہ ہم تاریخ تمدن میں روم کے کارنامہ کو بہ نسبت عربوں کے کچھ کم سمجھتے ہیں۔ مگر ضرورت اس بات کی مقتضی ہے کہ انسانیت کے ان مآخذ کا تجزیہ کیا جائے۔ جو کچھ لاطینی زبان میں لکھا گیا ہے اس میں روم کی عظمت نہیں ہے اور جو کچھ یونانی زبان میں قلمبند

کیا گیا ہو وہ ہیلانی کا کارنامہ نہیں کہا جاسکتا۔ اسی طرح جو کچھ کہ عربی میں تحریر کیا گیا ہو وہ عربوں کی پیداوار نہیں ہو جو کچھ کہ عیسائیت نے ملک و وطن کے لیے کیا ہو وہ عیسائیت کا نتیجہ نہیں ہو۔ اسی طرح جو کچھ اسلامی ممالک میں کیا گیا ہو وہ اسلام کا ثمرہ نہیں ہو۔ یہ ایک اصول ہو جس کو اسلامی اندلس کے مورخ کامل موسیو رینہارڈ ڈوزی نے جس کے ماتم میں اس وقت یورپ کا علمی طبقہ سوگوار ہو نہایت عقلندی سے چپاں کیا ہو۔ امتیازات کے یہ طریقے نہایت ضروری ہیں اگر ہم تاریخ کو غلط فہمی اور عدم صحت کی ایک گتھی نہ بنانا چاہتے ہوں۔

میری ایک بات جو شیخ کو غیر متصفانہ معلوم ہوئی ہو وہ یہ ہو کہ میں نے اس خیال کو مکمل صورت میں پیش نہیں کیا یعنی یہ کہ تمام الہامی مذاہب علوم ثابتہ (سائنس) کی مخالفت پر مجبور ہیں اور اس لحاظ سے عیسائیت کو اسلام کے مقابلہ میں زیادہ مغترز ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ گلیلو کے ساتھ کیتھولک مذہب نے ایسا مشفقانہ برتاؤ نہیں کیا جیسا کہ اسلام نے ابن رشد کے ساتھ کیا۔ گلیلو نے ایک کیتھولک ملک میں اس مذہب کی موجودگی میں صداقت کو پالیا جیسا کہ ابن رشد نے ایک اسلامی ملک میں اسلام کی موجودگی میں عداوت سے فلسفیانہ غور و خوض کیا۔ اگر میں نے اس نقطہ پر زیادہ زور نہیں دیا تو سچ پوچھیے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے خیالات اس معاملہ میں اس قدر آشکارا ہو چکے ہیں کہ مجھے ایسے لوگوں کے سامنے جو

میری آراء سے بخوبی واقف ہیں اس کو دہرانے کی ضرورت نہ تھی۔ میرا قول جس کے اعادہ کی بار بار ضرورت نہیں ہے یہ کہ نفس انسانی کو اگر اپنے ہی لازمی عمل کے لیے جدوجہد کرنا ہو تو اس کو مافوق الفطرۃ عقاید سے دور رہنا چاہیے۔ جو علوم ثابتہ کی تعمیر و ترکیب ہے۔ اس سے مراد کوئی شدید تخریب یا متعجلانہ شکست و ریخت نہیں ہے نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ ایک عیسائی عیسائیت اور ایک مسلمان اسلام کو خیر باد کہ دے۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ عیسائیت اور اسلام کے روشن خیال طبقے ایک ایسی روادارانہ اختلاف کی حالت پر آجائیں کہ جس سے مذہبی عقاید میں کوئی ہرج واقع نہیں ہوتا۔ تمام عیسائی ممالک میں تو یہ مقصد نصف کے قریب حاصل ہو چکا ہے۔ اور ہمیں امید کرنی چاہیے کہ اسلام میں بھی یہی حالت رونما ہو جائے گی۔ اور اس روز میں اور شیخ متحد النیال ہو کر ایک دوسرے کو مبارک باد دیں گے۔

میں نے یہ نہیں کہا کہ تمام مسلمان بلا امتیاز نسل سب کے سب جاہل ہیں اور ہمیشہ جہالت میں غرق رہیں گے۔ البتہ میں نے یہ کہا ہے کہ اسلام سائنس کے راستہ میں بڑی مشکلات پیدا کر دیتا ہے اور بد قسمتی سے وہ پانچ چھ صدیوں تک اپنے زیر اقتدار ممالک میں اس کو دبا دینے میں کامیاب بھی رہ چکا ہے۔ نیز یہ کہ ان ممالک کے لیے یہی سبب انتہائی حتمزل کا ہے۔ میں یقیناً اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ اسلامی ممالک میں احیاء علوم اسلام کی وجہ سے نہ ہوگا بلکہ یہ اسلام کی کمزوری ہی ہے ظہور

پذیر ہوگا جیسا کہ بالتحقیق عیسائی ممالک میں ازمنہ وسطیٰ کے جابرانہ کلیسا عیسوی کی بربادی ہی زبردست ترقی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی یعنی لوگوں کو میرے خطبہ میں یہ خیال مذہب اسلام کے حلقہ بگوش افراد کے خلاف نظر آیا ہے لیکن یہ کسی طرح سے صحیح نہیں ہے۔ دراصل خود مسلمان پہلے پہل مذہب اسلام ہی کے زخم خوردہ ہیں۔ میں نے ایک سے زائد مرتبہ اپنی سیاحت کے دوران میں ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو عوام الناس کو جابرانہ اقتدار کے ساتھ مذہبی تحکم میں رکھتے ہیں۔ لہذا مسلمان کو اس کے مذہب سے علیحدہ کرنا اس کی ایک بہت بڑی خدمت ہوگی۔ ان اسلامی آبادیوں کو جن میں کئی عمدہ عنصر موجود ہیں اسلام کے جوئے سے سبکدوش کرنے کی خواہش رکھنے سے میں نہیں مانتا کہ مجھے ان کی جانب کوئی معاذانہ خیال ہے اور چونکہ شیخ جمال الدین چاہتے ہیں کہ میں مختلف مذاہب کا آپس میں توازن بھی قائم رکھوں تو میں ہرگز تسلیم نہیں کر سکتا کہ میں یورپین ممالک کا بدخواہ ہوں اگر میں یہ خواہش ظاہر کروں کہ عیسائیت کا اقتدار ان پر سے کم ہو جائے۔

ان مختلف نقاط پر آزاد خیالوں میں کوئی شدید اختلاف نہیں ہے۔ کیونکہ خواہ اسلام کے موافق ہو یا نہ ہو لیکن سب کے سب اسی علمی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مسلمانوں میں اشاعت تعلیم کی ضرورت ہے اور یہ بالکل صحیح ہے۔ اگر تعلیم سے سیرۃ کی وہ سنجیدہ تعلیم مراد لی جائے۔ جس سے عقل کی تربیت ہوتی ہے اگر اسلام کے مذہبی مقصد اس بہترین کام میں حصہ لیں گے تو مجھے بڑی مسرت ہوگی۔

لیکن صاف صاف کہوں تو مجھے شبہ ہے کہ وہ ایسا نہ کریں گے۔ ممتاز شخصیتیں جن میں شیخ جمال الدین عیسیٰ نامور مہتیاں بہت تھوڑی ہوں گی ایسی نکلیں گی جو اسلام سے اپنا تعلق ترک کر دیں گی جیسا کہ ہم نے اپنے تئیں مذہب کیتھولک سے علیحدہ کر لیا ہے۔ وقت آنے پر بعض ممالک مذہب قرآنی کے ساتھ ہاتھ سے نکل جائیں گے لیکن مجھے شک ہے کہ احيائے علوم کی تحریک سرکاری طور پر اسلامی امداد کے بغیر حاصل ہو سکے۔ یورپ کی احيائے علمہ کسی کیتھولک مذہب کی امداد سے نہیں ہوئی اور اس وقت بھی — اور ہمیں تعجب کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے — کیتھولک مذہب بنی نوع انسان کی عقلیت کے مکمل حصول کے خلاف یعنی نام نہاد الہامی عقاید سے علیحدہ ایک غیر جانبدارانہ حالت کے خلاف جدوجہد کر رہا ہے۔

ایک اعلیٰ قانون کے طور پر انسانوں کے لیے آزادی اور عزت کو سب پر مقدم رکھنا مذاہب کو نہ مٹانا بلکہ فطرت انسانی کے آزادانہ مظاہر کے طور پر ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنا۔ ان کی تصدیق نہ کرنا اور زیادہ تر یہ کہ ان کے معتقدین کے خلاف جو ان مذاہب کو ترک کرنے پر آمادہ ہوں ان کی مدافعت نہ کرنا یہ سب باتیں متمدن سوسائٹی کے فرائض میں داخل ہیں۔ اسی طرح ادبیات یا ذوق طبیعت کی مانند مذاہب کو آزادانہ مطالعہ کے لیے پیش کرنے سے ان کی تبدیل ہوتی ہو جائے گی اور اس طرح وہ سرکاری اور مادی قیود سے آزاد ہو جانے کے بعد بالکل علیحدہ ہو کر اپنی خامیوں کا بہت سا حصہ کم کر دیں گے۔ بالفعل اگرچہ یہ سب

پذیر ہوگا جیسا کہ بالتحقیق عیسائی ممالک میں ازمنہ وسطیٰ کے جابرانہ کلیسا عیسوی کی بربادی ہی زبردست ترقی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی بعض لوگوں کو میرے خطبہ میں یہ خیال مذہب اسلام کے حلقہ بگوش افراد کے خلاف نظر آیا ہے لیکن یہ کسی طرح سے صحیح نہیں ہے۔ دراصل خود مسلمان پہلے پہل مذہب اسلام ہی کے زخم خوردہ ہیں۔ میں نے ایک سے زائد مرتبہ اپنی سیاحت کے دوران میں ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو عوام الناس کو جابرانہ اقتدار کے ساتھ مذہبی تحکم میں رکھتے ہیں۔ لہذا مسلمان کو اس کے مذہب سے علیحدہ کرنا اس کی ایک بہت بڑی خدمت ہوگی۔ ان اسلامی آبادیوں کو جن میں کئی عمدہ عنصر موجود ہیں اسلام کے جوئے سے سبکدوش کرنے کی خواہش رکھنے سے میں نہیں مانتا کہ مجھے ان کی جانب کوئی معاذانہ خیال ہے اور چونکہ شیخ جمال الدین چاہتے ہیں کہ میں مختلف مذاہب کا آپس میں توازن بھی قائم رکھوں تو میں ہرگز تسلیم نہیں کر سکتا کہ میں یورپین ممالک کا بدخواہ ہوں اگر میں یہ خواہش ظاہر کروں کہ عیسائیت کا اقتدار ان پر سے کم ہو جائے۔

ان مختلف نقاط پر آزاد خیالوں میں کوئی شدید اختلاف نہیں ہے۔ کیونکہ خواہ اسلام کے موافق ہو یا نہ ہو لیکن سب کے سب اسی علمی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مسلمانوں میں اشاعت تعلیم کی ضرورت ہے اور یہ بالکل صحیح ہے۔ اگر تعلیم سے سیرۃ کی وہ سنجیدہ تعلیم مراد لی جائے۔ جس سے عقل کی تربیت ہوتی ہے اگر اسلام کے مذہبی مقتدا اس بہترین کام میں حصہ لیں گے تو مجھے بڑی مسرت ہوگی۔

لیکن صاف صاف کہوں تو مجھے شبہ ہے کہ وہ ایسا نہ کریں گے۔ ممتاز شخصیتیں جن میں شیخ جمال الدین عیسیٰ نامور ہستیاں بہت تھوڑی ہوں گی ایسی نکلیں گی جو اسلام سے اپنا تعلق ترک کر دیں گی جیسا کہ ہم نے اپنے تئیں مذہب کیتھولک سے علیحدہ کر لیا ہے۔ وقت آنے پر بعض ممالک مذہب قرآنی کے ساتھ ہاتھ سے نکل جائیں گے لیکن مجھے شک ہے کہ احیائے علیم کی تحریک سرکاری طور پر اسلامی امداد کے بغیر حاصل ہو سکے۔ یورپ کی احیائے علیہ کبھی کیتھولک مذہب کی امداد سے نہیں ہوتی اور اس وقت بھی — اور ہمیں تعجب کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے — کیتھولک مذہب بنی نوع انسان کی عقلیت کے مکمل حصول کے خلاف یعنی نام نہاد الہامی عقاید سے علیحدہ ایک غیر جانبدارانہ حالت کے خلاف جدوجہد کر رہا ہے۔

ایک اعلیٰ قانون کے طور پر انسانوں کے لیے آزادی اور عزت کو سب پر مقدم رکھنا مذاہب کو نہ مٹانا بلکہ فطرت انسانی کے آزادانہ مظاہر کے طور پر ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنا۔ ان کی تصدیق نہ کرنا اور زیادہ تر یہ کہ ان کے معتقدین کے خلاف جو ان مذاہب کو ترک کرنے پر آمادہ ہوں ان کی مدافعت نہ کرنا یہ سب باتیں متمدن سوسائٹی کے فرائض میں داخل ہیں۔ اسی طرح ادبیات یا ذوق طبیعت کی مانند مذاہب کو آزادانہ مطالعہ کے لیے پیش کرنے سے ان کی تبدیل ہیئت ہو جائے گی اور اس طرح وہ سرکاری اور مادی قیود سے آزاد ہو جانے کے بعد بالکل علیحدہ ہو کر اپنی خامیوں کا بہت سا حصہ کم کر دیں گے۔ بالفعل اگرچہ یہ سب

خیالی باتیں معلوم ہوتی ہیں لیکن مستقبل میں یہ سب سچی ثابت ہوں گی۔ آزادی کے دور میں ہر مذہب جو بہت سے عمل اور رد عمل کے بعد انسانی سوسائٹیوں پر اپنا تسلط چمانے والا ہوگا وہ کیونکہ اسی طرح مرکب حالت میں رہ سکے گا۔ اس مسئلہ پر چند سطروں میں بحث نہیں ہو سکتی۔ میں نے اپنے خطبہ میں صرف ایک تاریخی مسئلہ کو چھیڑنا چاہا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ جمال الدین نے متعدد دلائل پیش کئے ہیں۔ میرے ان دو اصولی نظریوں کی تائید میں کہ۔

- ۱۔ اپنی پچھلی نصف زندگی میں اسلام نے علمی تحریکات کو اسلامی سرزمین میں پیدا ہونے سے نہیں روکا۔
- ۲۔ بعد کی نصف زندگی میں اس نے اپنی بدقسمتی سے اپنی ملکی حدود میں علمی تحریک کا گلا گھونٹ دیا۔۔۔۔۔“

رینان کے جواب الجواب کے اس قدر طویل اقتباس کو پیش کرنا اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ اول تو اس بحث کی تنقیحات کسی قدر واضح ہو جائیں جن کے متعلق یورپ کے ایک بہت بڑے عالم اور فیلسوف کے نظریات کی شیخ نے تردید کی تھی اور نیز اس لیے بھی کہ شیخ کے علم و فضل کے متعلق یورپ کے ایک بہت بڑے عالم کے خیالات کا ایک عکس ناظرین دیکھ لیں۔ شیخ کے علم و فضل کی یہ اقبال مندی ناقابل انکار ہے کہ یورپ میں قدم رکھتے ہی شیخ کا پہلا مقابلہ رینان جیسے صاحب علم و فضل سے ہوا۔ اور اُس مقابلہ میں حریف کو شیخ کی فضیلت کا اقرار کرنا پڑا۔

اس بحث کے سلسلہ میں اخبار السیاسہ (مصر) کی اشاعت مورخہ

۲۲/ مایچ ۱۸۲۳ء کا ایک مضمون بھی ہماری معلومات میں کسی قدر اضافہ کرتا ہے۔ جریدہ مذکور نے رینان اور جمال الدین افغانی کے عنوان سے اُن مطالب پر بحث کی ہے جو مشرق و مغرب کے اُن دو فیلسوف علما کے درمیان زیر تنقید رہے۔ لیکن مندرجہ بالا اقتباس کو پیش کر دینے کے بعد اب اس مضمون کے مزید اقتباسات کو نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔

القصد اس میں شک نہیں کہ فرانس کے سب سے بڑے عالم اور فلسفی سے شیخ کے اس مباحثہ نے ان کی شخصیت پیرس کے علمی حلقوں میں بہت جلد نمایاں کر دی۔

لیکن جو خیال شیخ کو پیرس لایا تھا اس کی تکمیل ایک سال کی کوششوں کے بعد ہو سکی۔ بعض شہادتیں اس امر کی موجود ہیں کہ شیخ کو اپنے کام کے لیے مصر اور ہندوستان سے مالی امداد مل رہی تھی لیکن یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ کون لوگ امداد دے رہے تھے۔ تاہم ہندوستان کے متعلق تو یہ قیاس بیجا نہیں کہ زیادہ روپیہ ان کو حیدر آباد سے ملتا ہوگا۔ شیخ خود جس بے سرو سامانی کی حالت میں تھے وہ ظاہر ہے۔ یورپ میں یا ترکی و ایران میں اس وقت تک ان کے اثرات ایسے نہ تھے کہ وہاں سے کوئی معقول امداد مل سکتی اُن کی نظر کے سامنے ایک وسیع میدان عمل تھا۔ اور یقیناً اس کام کے لیے انھوں نے اپنے تمام ممکن ذرائع سے روپیہ فراہم کیا ہوگا۔

شیخ کے پیرس پہنچنے کے چند ہی روز بعد اُن کے رفیق اور شاگرد مفتی عبدہ بھی وہاں پہنچ گئے نیز نوجوان سعد زاغلول بھی اُسی زمانہ میں پیرس آگئے تھے، اور پھر شیخ کے ایک خاص معاون اور شریک کار مرزا باقر ایرانی لندن سے شیخ کے پاس چلے آئے۔ اس طرح پیرس میں شیخ کے گرد و پیش ایک

معتقل جماعت جمع ہو گئی۔ اس جماعت میں زیادہ تر اسلامی ممالک کے وہ قوم پرست مہاجرین تھے جو اپنے ممالک سے نکالے گئے تھے یا بھاگ آئے تھے۔ شیخ نے اب عروۃ الوثقیٰ کے نام سے ایک انجمن قائم کی جس کے ماتحت انھوں نے اپنا ہفتہ وار جریدہ عروۃ الوثقیٰ جاری کیا۔ پروفیسر براؤن نے لکھا ہے کہ عروۃ الوثقیٰ کا پہلا پرچہ مئی ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔ مگر میرے پاس اُس کا پہلا پرچہ اور آٹھ اور اصل پرچے موجود ہیں جو مجھے اتفاقاً بلنٹ کے کتب خانہ میں مل گئے تھے۔ ان پرچوں سے ثابت ہوتا ہے کہ عروۃ الوثقیٰ کا پہلا پرچہ ۱۳ مارچ ۱۹۷۷ء کو شائع ہوا۔ اس جریدہ کے اصلی پرچے اب تقریباً ناپید ہیں۔ اکتوبر ۱۹۷۷ء میں اٹھارہ پرچوں کی اشاعت کے بعد ہی یہ اخبار بند ہو گیا۔ لیکن ان اٹھارہ پرچوں نے بھی یورپ اور ایشیا کے بہت سے دفاتر خارجہ اور قنصل خانوں کی نیندیں خراب کر دیں۔

جن اغراض و مقاصد کو بیشِ نظر رکھ کر عروۃ الوثقی جاری کیا گیا تھا اُن کی تشریح خود شیخ ہی کے الفاظ میں دیکھنی چاہیے:-

”جب کسی قوم میں ضعف اور غفلت کا غلبہ ہوتا ہو تو کوئی اجنبی قوم اُس پر برسرِ اقتدار ہو جاتی ہے۔ تاکہ اُس کا ظلم بے پناہ اس قوم کے اندر ایک روحِ تازہ پیدا کر دیتا ہے۔ اور وہ محسوس کرتی ہے کہ اس کی گئی ہوئی قوت پھر حاصل کی جاسکتی ہے۔“

۵ جو پرچے میرے پاس ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔ ۱۳ مارچ ۲۰ مارچ ۲۰ مارچ ۲۳ مارچ ۲۵ مارچ ۲۹ مارچ ۱۰ جولائی۔

۴۔ عروۃ الوثقیٰ کے مضامین کتابی شکل میں حسین محی الدین الجبال ایڈیٹر ابابیل نے ۱۹۱۰ء میں مصر سے شائع کئے۔

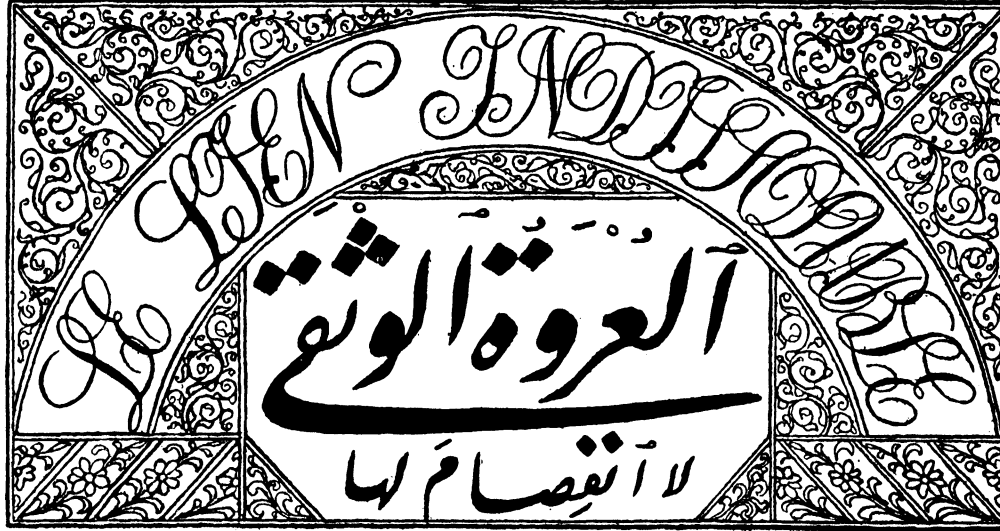
الحرر الاول

الشيخ محمد مبد

REDACTEUR EN CHEF

CHEICK MOHAMED ABDO

من شاء ان يبعث الينا بتجارير اورسانل
في اي موضوع كان رغبة نشرها في
الجريدة او التنبيه على امر مهم فليرسلها الى
ادارة الجريدة بهذا العنوان
6, rue Martel, à Paris



جريدة سياسية ادبية

تصدر يوم الخميس

مدير السياسة

جال الدين الحسني الافغاني

DIRECTEUR POLITIQUE

GEMAL-ED-DIN EL-AFGHAN

ترسل الجريدة الى جميع الجهات الشرقية مجاناً

قد ميّزت اجرة للريدخمستفر نكات في السنة
ان تسمح بهانفسه



١٣ مارس سنة ١٨٨٤

يوم الخميس في ١٥ جمادى الاول سنة ١٣٠١

عقولها وشدوا عليها بما لا تألفه فحارت البايها والزموها بما ليس
في قدرتها فاستعصت عليه قواها وخصدوا من شوكة السوازع
تحت اسم العدالة ليهيئوا بكل ذلك وسيلة لنيل المظم فكانت
الحركة العرابية العشواء فاتخذوها ذريعة لما كانوا له طالبيين
فاندفع بهم سيل المصاعب بل طوفان المصائب على تلك
البلاد وظنوا بلوغ الارب ولكن اخطاء الظن وهما بالم ينالوا
لم تكذب تخمد تلك الحركة في بادى النظر حتى خلفتها
حركة اخرى وفتح باب كان مسدودا وقام قائم بدموة لها المكانة
الاولى في نفوس المسلمين بل هي بقية آمالهم ولا ندري لان
ماذا استعقبه هذه الحركة الجديدة وربما يوجد من يدري ان

التي تنبعث لدفع ما لا يطاق اذا قام بتدبيرها قيم عليها ومدبر
لسيرها لا يكفي في توقيف سريانها او سحقاها قهر ذات
القيم واهلاك ذلك المدبر فان العلة ما دامت موجودة لا تزال
آثارها تصد رعتها فان ذهب قيم خلفه آخر اوسع منه خبرة
وانفذ بصيرة . نعم يمكن تخفيف الاثر او ازالته بازالة علته
ورفع اسبابه

جرت عادة الامم ان تائف من الخسوع لمن يباينها في
الاخلاق والعادات والمشارب وان لم يكلفها بزانة عما كانت
تدين به لمن هو على شانها فكيف بها اذا حملها ما لا طاقة
لها به . لا ريب انها تستنكره وان كانت تسكبه وكلما

بسم الله الرحمن الرحيم . ربنا عليك توكلنا واليك انبنا
واليك المصير . هذا بما تمده العناية الالهية من قول الحق
متعلقا باحوال الشرق وعلى الله المتكل في نجاح العمل .
خفيت مذاهب الطامعين ازمانا ثم ظهرت . بدات
على طرق ربما لا تنكرها الانفس ثم التوت . اوغل لاقوياء .
من الامم في سيرهم بالضعفاء حتى تجاوزوا بيداء الفكر
وسحروا البايهم حتى اذهلهم من انفسهم وخرجوا بهم عن
محيط النظر وبلغوا بهم من الصميم حدا لا تحتمله النفوس
البشرية .
ذهب اقوام الى ما يسوله الوهم ويفري به شيطان الخيال

اگر اتحاد و اتفاق سے کام لیا جائے اور یہ کوئی ایسی چیز نہیں جو بظاہر عیسر الحصول ہو۔

نفوس انسانی کی خاصیت کچھ ایسی ہے کہ پہلے تو وہ ظلم و قہریت کو برداشت کرتے ہیں لیکن جب یہ چیز حد سے تجاوز کر جاتی ہے تو بالآخر کوئی نہ کوئی راہ خلاص کی نکال ہی لیتے ہیں۔ یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں کہ آج ہم تمام مشرق میں بیداری کی ایک لہر پاتے ہیں۔ عہدِ حاضر میں ہر قوم آزادی چاہتی ہے ہر شخص غلامی کی گرفت سے نجات چاہتا ہے۔ چنانچہ ہر عقلمند آدمی کامرکز توجہ اس وقت یہی ہے کہ وہ جلد از جلد کسی صورت سے ساری قوم کو ایک شیرازہ میں منسلک کر دے۔ مشرقی اقوام پر اس وقت ظلم و عدوان کی انتہا ہو چکی ہے ہر مظلوم قوم پیکرِ غربت بنی ہوئی ہے۔ بالخصوص مسلمانوں کی حالت تو اور زیادہ ناگفتہ بہ ہے کہ اُن کے سلاطین باعظمت تختِ حکومت سے محروم کر دیے گئے ہیں۔ اور اُن کے باعزت لوگ ذلیل کرائے گئے ہیں۔ اُن کی شان و شوکت والے ارباب علم و دانش کی تحقیر کی جاتی ہے۔ اُن کے غنی فقیر کر دیے گئے ہیں۔ تندرست و توانا لوگ لنگڑے بولے اور اپاہج کر دیے گئے ہیں۔ ان کے شیر نیتاں چو پاویں سے بدتر ہو گئے ہیں۔ خصوصاً اس پانچ سال کے عرصہ میں بہ سلسلہ حوادثِ بالا جو تخمِ پاشی ہوئی ہے وہ تو خوب ہی ہے۔ لیکن انشاء اللہ وہ جنہوں نے یہ تخمِ پاشی کی ہے پھل ایسا پائیں گے جو اُن کے طرزِ عمل کی مکافات ہوگا یعنی اس نخل بے ثمر سے اگر وہ پائیں گے تو اندر این۔

مصر اس وقت جس دور سے گزر رہا ہے مسلمانانِ عالم اُسے بہ آسانی برداشت نہیں کر سکتے۔ مصر مسلمانوں کے نزدیک ایک مقدس مقام ہے ان کے دلوں میں اس کی خاص وقعت اور عزت ہو اُسے بجا طور پر حرمین شریفین کا دروازہ کہا جاسکتا ہے۔ تو اگر یہ دروازہ محفوظ ہو تو ظاہر ہے کہ مسلمان مطمئن رہیں گے اور اگر ایسا نہ ہو تو ان کے افکار میں اضطراب پیدا ہوگا اور انھیں شبہ ہوگا کہ آیا مسلمانوں کے اس رکنِ عظیم کی سلامتی خطرہ میں تو نہیں ہے..... یہ حرص و ہوا کے ٹھیکہ دار یہ قومیں جہاں جاتی ہیں رفق اور محبت کے لہجہ میں باتیں کرتی ہیں۔ رفتہ رفتہ ان میں حاکمانہ اسپرٹ کا اظہار ہوتا ہے کہیں وہ تختِ حکومت کے حفاظت کے لیے جاتی ہیں کسی ملک کو اغیار و اجانب کی دست برد سے آزاد کرانے کے لیے، کہیں کسی ملک کو اور زیادہ مضبوط اور مستحکم کرنے کے لیے، کہیں بغاوت کے جرائم پر حملہ کرنے جاتی ہیں۔ غرضیکہ جب کہیں جاتی ہیں تو طرز ان کا یہی ہوتا ہے اور پھر وہ اس طرح چھا جاتی ہیں..... لیکن ان بندگانِ حرص کی آنکھیں حرص نے بند کر رکھی ہیں۔ انھوں نے کانوں میں روٹی ٹھونس رکھی ہے کہ آہستہ آہستہ ہندوستان و مکہ سے آزادی کی جو آواز آرہی ہے اس کو نہیں سن سکتے۔ ان آخری ایام میں مشرقی ممالک کے اہم مقامات پر جو یکساں مصیبتیں نازل ہوئی ہیں اُن کی وجہ سے ان ممالک کے تمام باشندوں میں باہمی ربط و اتحاد کی تجدید ہوگئی ہے اور اس وقت مشرقی ممالک کے متفرق و مختلف اور دور دراز مقامات کے رہنے والے ایک دوسرے سے زیادہ

قریب اور متحد ہو گئے ہیں۔ ہر جگہ اربابِ فہم بیدار ہو چکے ہیں جنہوں نے ان کو موجودہ حالت تک پہنچا دیا ہے اور بقدر امکان اُن کے رفع اور ازالہ کی فکر بھی ان کو دامن گیر ہے۔ وہ اپنے ربط و اتحاد سعی و کوشش کی بنا پر اس کے امیدوار ہیں کہ شاید کھوئی ہوئی قوت و شوکت کو ایک دفعہ پھر پالیں اور موجودہ حوادث میں اُن کو اپنے دین و مذہب شرف و قار اور ننگ و ناموس کی حفاظت کا کوئی موقعہ ہاتھ آئے وہ موجودہ وقت کو ایک مفتحم فرصت سمجھتے ہیں اور اسی سے ان کی امیدیں قائم ہیں۔ ان کے دلوں میں ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال نہیں کھٹکتا کہ بغیر کسی عمدہ نتیجہ کے یہ وقت اور موقعہ ہاتھ سے جاتا بھی رہے تو پھر غیب سے اس قسم کے بیسیوں اور مواقع پیدا ہو جائیں گے۔ اس وقت مختلف مشرقی ممالک بالخصوص بلاد ہند و مصر میں اس مقصد جلیل کے حصول کے لیے متعدد جماعتیں قائم ہو چکی ہیں۔ جو ہر ممکن طریقہ سے ذرائع کامیابی کی تلاش اور جستجو میں سرگرم و مصروف ہیں۔ نہ وہ سعی و عمل سے تھکتی ہیں اور نہ اپنی کوششوں میں کوئی کمی کرتی ہیں اگرچہ اس راہ میں اُن کو اُن تمام انتہائی خطرات سے دوچار ہونا پڑے جو انسانی زندگی کو پیش آ سکتے ہیں۔ . . .

اس تمہید کے ساتھ وہ اپنے اغراض و مقاصد اور لائحہ عمل کو یوں بیان کرتے ہیں۔

”یہ رسالہ بقدر امکان مشرقی قوموں کے لیے ان ضروری کاموں کو صاف صاف بیان کرے گا جن میں کسی طرح بھی کمی کرنا

اُن کی بربادی اور کمزوری اور تباہی کا سبب ہو اور اُن راستوں کی طرف علانیہ رہنمائی کر لگیا جن پر چلنا تلافی مافات کے لیے از حد ضروری ہو نیز آئندہ مشکلات سے عہد برآ ہونے کی صورتیں پیش کر لگا۔ یہ رسالہ مشرق کے اعلیٰ طبقوں کی نگاہوں پر سے پردہ اٹھانے کی کوشش کرے گا اور اُن شبہات اور وہموں کو دور کرے گا جن کی وجہ سے ہدایت اور کامیابی کا راستہ ان پر ملتبس ہو گیا ہو اُن کے اُن دوسو سوں کو رفع کرے گا جن کی بنا پر وہ مرض کے علاج و شفا کی طرف سے مایوس ہو چکے ہیں اور عام طور پر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ مصیبت اپنی انتہا کو پہنچ گئی اور تدارک اور تلافی کا زمانہ گزر گیا۔

یہ رسالہ سمجھائے گا کہ تمام مشرقی قوموں کے لیے باہمی امداد اور اعانت کا طریقہ نہایت ضروری ہو اور یہی اُن کے سیاسی روابط اور وطنی تعلقات کا محافظ ہو سکتا ہو اس لیے کہ اسی طریقہ کے فقدان کا یہ نتیجہ ہو کہ آج قومی نے ضعیف کو دبا لیا ہو۔ یہ رسالہ اعداء مشرق کی محبت اور خیر خواہی کی اس منقش چادر کو جو رنگا رنگ ملاطفت اور نرم خوئی سے رنگین ہو چاک کر کے جو کچھ پس پردہ ہو اس کو علانیہ دکھا دے گا اور حریص و طماع مغرب مشرق کی تاریکی غفلت میں آہستہ آہستہ جس مخفی راہ سے چل رہا ہو اس پر کافی روشنی ڈالے گا۔

یہ رسالہ اس کی خاص کوشش کرے گا کہ مشرقی قوموں پر جو غلط الزام لگائے جاتے ہیں اور خاص کر مسلمانوں پر جو جھوٹی

تہمتیں لگا کر ان کو بد نام کیا جاتا ہے ان کی اچھی طرح پردہ دہی کرے۔ اور اصلی حقیقت کو سمجھائے۔ نیز بعض نادانوں کے اس خیال کی تردید کرے گا جو یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان کبھی ترقی و تمدن کے برکات سے اس وقت تک مستفید نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ انھیں اصولوں پر کار بند رہیں گے جن پر آج سے سینکڑوں برس پہلے کار بند ہو کر ان کے اسلاف نے فائدہ اٹھایا تھا۔

یہ رسالہ تمام مشرقی اقوام کو سیاسی حوادثِ عامہ سے باخبر کرنے کی ہر وقت کوشش کرے گا اور اُن کے متعلق سیاسی جماعتیں جو طرزِ عمل اختیار کرتی رہیں گی اُن کے انکشاف اور پردہ درسی سے غافل نہ ہو گا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام مشرقی قوموں کے باہمی تعلقات کی تقویت اور استحکام اور ان کے افراد میں باہمی محبت و الفت کی تلقین کی خاص طور پر رعایت رکھے گا اور اُن کے منافع مشترکہ کی تائید و حفاظت کو اپنا سب سے بڑا فرض سمجھے گا۔

یہ خیالات اور منصوبے تھے جو عروۃ الوثقیٰ کی اشاعت کا باعث ہوئے۔ اس زمانہ میں شیخ بہت عسرت کی حالت میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور Rue de Seize میں ایک اوپر کی منزل کے کمرے میں جس کا عرض و چار پانچ گز سے زیادہ نہ تھا محمد عبدہ کے ساتھ رہتے تھے۔ اس خلوت میں اسٹا و شاگرد اپنے مقاصد کے متعلق کیا کیا مشورے نہ کیا کرتے ہونگے! چند مصری مہاجرین شیخ کے گرد و پیش رہتے تھے۔ انگلستان میں تنہا ایک بلٹ اُن کا سے۔ عروۃ الوثقیٰ کی پانچ اشاعتوں کے بعد محلِ ادرات تبدیل کر دیا گیا اور غالباً شیخ بھی کچھ دیر کے مکان میں منتقل ہو گئے۔

دوست ہم خیال اور مشیر تھا۔ پیرس میں ایسا بھی کوئی دوست نہ تھا۔
 عروۃ الوثقیٰ کے مضامین نے پہلے ہی دن سے ایک ہل چل مجادی۔ بدب
 کے مدیرین اس کے عادی نہ تھے۔ کہ خود انھیں کے دروازے پر بیٹھ کر کوئی
 شخص ان سے احتساب کرے۔ غیر ملکوں میں وہ اس قسم کی شورش کو
 بہ آسانی دبا سکتے تھے لیکن اپنے آزاد ملک میں اس قسم کی نکتہ بینی کو بند کرنا
 ان کے لیے آسان نہ تھا۔ نہ صرف لندن وپرس میں بلکہ مصر اور دیگر اسلامی
 ممالک میں بھی یہ آواز سنی گئی اور خود یورپ کے اخبارات میں عروۃ الوثقیٰ کے
 مضامین نقل کئے جانے لگے۔

عروۃ الوثقیٰ کی پیشانی پر ایک طرف شیخ کا نام اور دوسری طرف مفتی
 عبدہ کا نام شائع ہوتا تھا۔ اور اس طرح دونوں کی شخصیت شانہ بہ شانہ میدلا
 عمل میں آئی تھی اور مصریوں کے لیے ان دونوں ناموں کا یکجا ہونا ایک اہم
 سیاسی معنی رکھتا تھا شیخ کی جماعت کے جو لوگ ابھی مصر میں موجود تھے
 انھوں نے عروۃ الوثقیٰ کے مضامین کی تہنیر کرنی شروع کی اور چند ہی روز
 میں وہاں عام احساسات کی یہ حالت ہو گئی کہ گویا مفتی عبدہ اور شیخ
 خود مصر میں موجود ہیں۔ چنانچہ بہت جلد مصر میں عروۃ الوثقیٰ کا داخلہ بند
 کر دیا گیا۔ اس واقعہ کے متعلق خود شیخ نے جو خیالات عروۃ الوثقیٰ کے صفحات
 پر ظاہر کیے ان کا مختصر اقتباس اس موقع پر نقل کر دینے کے قابل ہے۔

”مجلس نے مصر میں عروۃ الوثقیٰ کے داخلہ کو ممنوع قرار

دیا اور اسی فیصلہ کے مطابق سرکاری اعلان میں یہ ظاہر کیا گیا

ہے کہ جس شخص کے پاس اس رسالہ کا کوئی پرچہ پایا جائے گا اس

پر ۲۵ گنی تک جرمانہ کیا جائے گا۔ ہم ایک لمحہ کے لیے

بھی یہ خیال نہیں کر سکتے کہ کسی مصری رکن کی با اختیار آزاد رائے نے یہ فیصلہ کیا ہو بلکہ ہم خدیو مصر کی ذات سے بھی ایسی امید نہیں رکھتے اور ہمارے وہم میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ کوئی مصری خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلمان بلکہ کوئی مشرقی جو مصر میں قیام پذیر ہو اس حکم میں عدل و انصاف کا شائبہ تک پاتا ہو۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کیونکہ اس رسالہ نے مصری حقوق کی محافظت اور مدافعت کا حق ادا کیا ہے۔ ہر معاملہ میں مصریوں کی امداد و اعانت کی ہے اور مصر کے دشمنوں کی امیدوں کو ناکام کرنے کی سعی اور کوشش کی ہے۔ اس رسالہ کا مشرب زید کی مدح اور عمر کی عیب جوئی نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد نہایت ارفع اور اعلیٰ ہے۔ اس کی کوششیں اس پر صرف ہوتی ہیں کہ مشرقی قوموں کے سینوں میں باہمی بغض اور عداوت کے جو شعلے بھڑک رہے ہیں ان پر نصیحت اور مصالحت کا پانی ڈال کر ان کو اخلاص اور محبت سے بھر دے۔ وہ ابنائے مشرق سے یہ التماس کرتا ہے کہ باہمی نزاع اور اختلاف کے ہتھیار ڈال دیں اور اس عام مصیبت کے مقابلہ میں جو سب کے لیے یکساں تباہ کن ہوگی اتحاد اور اتفاق کے اسلحہ سے مسلح ہو کر صف بستہ ہو جائیں۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ گھر کے آئندہ اندرونی انتظامات کی فکر سے پہلے خود گھر کی حفاظت کرنا چاہیے۔ ابتدا سے عروۃ الوثقی کا یہی عمل ہے۔ پھر کیونکہ ایک لمحہ کے لیے عاقل انسان یہ تصور کر سکتا ہے کہ مشرق کا کوئی فرد خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم ایک ایسے مفید رسالہ کو اپنے

ملک میں داخل ہونے سے روک دے گا۔ ہم یقینی طور پر یہ جانتے ہیں کہ یہ سب اسی قوت کا کرشمہ ہے جو اس وقت مصر پر مسلط ہے اور وزارتِ مصر نے جو کچھ کیا ہے وہ انگریزی عمالِ حکومت کے جبر و دباؤ سے کیا ہے.....“

عودۃ الوثقی کے صفحات پر یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ شیخ جو ”پیام“ مشرق کو دے رہے تھے اُس کے مخاطب تنہا مسلمان ہی نہ تھے۔ بلکہ وہ نہ صرف اسلامی ممالک بلکہ تمام ایشیائی ممالک کو اور نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ مشرق کے تمام غیر مسلموں کو بھی یکساں دعوت دے رہے تھے اور شیخ کے پیام کی یہ وسعت درحقیقت کسی خاص مغربی قوم کی مخالفت پر مبنی نہ تھی۔ رنگ و نسل کا کوئی تعصب ان کے اندر نہ تھا۔ بلکہ وہ ہمدردی بنی نوع انسان کے ایک مشترک مرکز پر کھڑے ہو کر ساری دنیا کو آزادی امن اور صلح کا پیام دے رہے تھے۔ ان کا زاویہٴ نظریہ نہ تھا کہ اتحادِ اسلامی کے ذریعہ سے مغرب کے خلاف کوئی جارحانہ تحریک پیدا کی جائے بلکہ ان کی تحریک ایک تحریکِ دفاع تھی اور ان کا اتحادِ اسلامی صرف اتحادِ اسلامی نہ تھا بلکہ یورپین ملوکیت کے خلاف ایک مستحکم اتحادِ مشرق تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ مشرق اور مغرب کے درمیان نسل و رنگ کے ادنیٰ تعصبات کا پیدا کر دینا دونوں میں سے کسی کے لیے بھی مفید نہیں۔ نہ وہ اپنی تحریک کو کسی ایک مذہب کے دائرہ میں محدود کر کے دوسرے مذاہب کو شکایت کا موقع دینا چاہتے تھے۔ شیخ کا نام اکثر اُسی اتحادِ اسلامی سے وابستہ کیا جاتا ہے جس کی آواز کبھی کبھی ترکی یا جابا وغیرہ میں بلند کی جاتی تھی لیکن شیخ کی زندگی اور ان کے اقوال کا بغور مطالعہ کیجئے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ شیخ کی نظر ایک وسیع تر میدان اپنے سامنے

رکھتی تھی۔ وہ مذہب کی بنیاد پر محض اسلام کے داعی نہ تھے بلکہ حق اور انصاف کی بنیاد پر اتحاد مشرق کے داعی تھے۔ عروۃ الوثقیٰ میں اپنے مقاصد کے متعلق اس غلط فہمی کو انھوں نے صاف الفاظ میں رفع کر دیا تھا:-

”کسی کو یہ خیال نہ قائم کرنا چاہیے کہ یہ جو بار بار خاص طور پر مسلمانوں کا تذکرہ آتا ہے تو اس سے مقصود صرف اُن ہی کے حقوق کی حفاظت ہے اور ان کے غیر مسلم ہم وطنوں کے حقوق و مصالح کو جو صدیوں سے رشتہ وطنیت کی بنا پر اُن میں باہم مشترک و مخلوط ہیں نظر انداز کر دیتا ہے۔ ایسا کرنا ہماری افتاد طبعیت اور رجحان کے بالکل خلاف اور ہماری شان سے بالکل بعید ہے کیونکہ ایسا کرنے کی اجازت نہ تو ہم کو ہمارے دین نے دی ہے اور نہ ہماری شریعت اس کو کسی طرح اور کسی حال میں جائز رکھتی ہے۔ ہماری غرض عام طور پر مشرقی قوموں کو ہوشیار اور بیدار کرنا ہے۔“

اکتوبر ۱۹۳۸ء میں تقریباً چھو ماہ کی مختصر زندگی کے بعد عروۃ الوثقیٰ بند ہو گیا۔

اس کتاب کے ضمیمہ ۱ میں عروۃ الوثقیٰ کے بعض مقالوں کا ترجمہ اس لیے پیش کر دیا گیا ہے کہ ان اوراق کے پڑھنے والے شیخ کی سیاسی اسلامی اور بین الاقوامی نقطہ نظر سے زیادہ آشنا ہو جائیں۔ اس جریدہ کے بند ہونے کی وجہ زیادہ تر مالی مشکلات تھیں۔ مختلف ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں شیخ بہت تنگ دست تھے۔ اور عروۃ الوثقیٰ کی اشاعت میں جو کچھ ان کے پاس تھا سب صرف کر چکے تھے اس کے

۴ ستمبر ۳۷ھ - جمال الدین سنو (سنو) اور صابونچی صبح کا ناشتہ
ہمارے ساتھ کھانے آئے اور ہم سے دن بھر باتیں کرتے رہے.....

میں نے مصر میں قوم پرستوں کی ایک پارٹی بنانے کے متعلق جو پروگرام بنایا تھا اس پر بھی شیخ سے گفتگو کی اور نیز ازہر کو تمام دنیائے اسلام کی یونیورسٹی بنانے کے مسئلہ پر بھی مشورہ کیا۔ شیخ نے مجھے بتایا کہ گزشتہ زمانہ میں ازہر کا کیا حال تھا.....“

اُسی زمانہ میں شیخ کے تعلقات پرنس ملکم خاں سے جو لندن میں ایرانی سفیر تھے بہت گہرے اور مخلصانہ ہو گئے۔ ملکم خاں کچھ تو پہلے ہی سے شیخ کے ہم خیال تھے اور کچھ شیخ نے اُن کو اپنا ہم خیال بنایا۔ چنانچہ آئندہ زمانہ میں جب ایران کے متعلق شیخ کو بہت زیادہ کدوکاوش کرنی پڑی تو ملکم خاں اُن کے مدد و معاون رہے۔ جب کبھی شیخ لندن جاتے تھے تو اکثر انھیں کے مکان پر اسلامی مالک کے متعلق مشورے ہوا کرتے تھے۔ اُسی زمانہ میں مہدی سوڈانی کی بغاوت سوڈان میں بہت زیادہ پھیل چکی تھی اور اس کی وجہ سے مصر کے متعلق بھی برطانوی دفتر خارجہ بہت متروک تھا۔ حالات یہ تھے کہ جب سسٹم میں خدیو اسماعیل کو برطرف کر کے توفیق کو خدیو بنایا گیا تو مصر کی حالت بقول بلنٹ کے ایسی تھی جیسے ایک عورت کی عصمت لوٹ لی گئی ہو اور جو معذور و مجبور اپنی قسمت کے آئندہ واقعات کی منتظر پڑی ہو توفیق کی مسند نشینی سے دو برس پہلے سسٹم میں سوڈان میں بد امنی پیدا ہو چکی تھی۔ اس کا سبب روؤف پاشا گورنر سوڈان کے مظالم تھے جو وہ روپیہ وصول کرنے کے لیے وہاں کی رعایا پر کر رہا تھا۔ اعرابی پاشا جس وقت دزیرہ جنگ ہوئے تو انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ نہ صرف روؤف بے کو سوڈان سے واپس بلا لیا بلکہ مہدی سوڈانی کو اجنبی مداخلت کے خلاف اپنا ہم خیال بنالیا۔



پرنس ملیکم خان نظام الدولہ
پیدائش اصفہان ۱۲۴۹ھ (۱۸۳۳-۳۴ع) ، وفات روم ۱۳۲۶ھ (۱۹۰۸ع)

جس وقت اسکندریہ پر گولہ باری ہوئی تو مہدی کا غم و غصہ زیادہ ہو گیا۔ اور اعرابی کی گرفتاری اور جلاوطنی کے بعد تو سوڈان میں ہر طرف آگ لگ گئی۔ چنانچہ نومبر ۱۹۱۷ء میں بحر احمر کے سواحل پر اور تمام مغربی سوڈان اور خرطوم کے جنوب میں مہدی کی تلوار چمکنے لگی۔ سوڈان کا دارالسلطنت خرطوم بھی خطرہ کی حالت میں تھا اور مصر میں برطانوی ”ڈل“ کو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں مہدی سوڈان سے نکل کر مصر پر حملہ نہ کرے۔ گو کہ چند ہی روز بعد مہدی کا انتقال ہو گیا۔ مگر اس کے نشین نے اپنی فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔ بالآخر جنوری ۱۹۱۸ء میں جنرل گارڈن بغاوت کو رفع کرنے کے لیے سوڈان بھیجے گئے۔ مگر وہ خرطوم پہنچ کر محصور ہو گئے برطانوی وزارت کے لیے یہ واقعات نہایت وحشتناک تھے۔ انگلستان سے گارڈن کے لیے جو کمک بھیجی گئی وہ بہت دیر سے بھیجی گئی۔ اکتوبر ۱۹۱۸ء میں گارڈن کی فوج کے دو جہاز بربر کے قریب خشکی پر چڑھ گئے۔ اور مہدی کے آدمیوں نے تمام برطانوی سپاہیوں کو قتل کر ڈالا۔ پھر نومبر میں جو مزید فوج بھیجی گئی وہ راستے بند ہونے کی وجہ سے نہ پہنچ سکی۔ اس وقت مہدی کی ۲۵ ہزار فوج خرطوم کا محاصرہ کیے ہوئے تھی اور گارڈن برطانوی وزارت کو اطلاع دے چکا تھا کہ وہ چند ہفتہ سے زیادہ دشمن کی روک تھام نہیں کر سکتا آخر ۲۶ جنوری ۱۹۱۸ء کو خرطوم پر مہدی کی فوجوں کا قبضہ ہو گیا۔ اور گارڈن مارا گیا۔

آخر ۱۹۱۸ء میں جب سوڈان میں ہر طرف آگ لگی ہوئی تھی بلنٹ یہ کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح مہدی سے صلح ہو جائے اور گارڈن اپنی جان سلامت لے کر واپس آ سکے اس سلسلہ میں شیخ کے متعلق بلنٹ کے روزنامہ کے اندراجات اور شیخ کے بعض خطوط بنام بلنٹ بہت دل چسپ ہیں۔ ایک

خط میں شیخ لکھتے ہیں :-

"پیرس - ۲۱ اپریل ۱۸۵۵ء - جناب عالی ! آپ کا گرمی نامہ موصول ہوا۔ جس کے لیے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اگرچہ مجھے اپنے مصر کے زمانہ قدیم میں کبھی یہ معلوم نہ ہوا کہ مسٹر گارڈن آزادی کے حامی اور اسلام کے رفیق ہیں۔ تاہم جو بھروسہ مجھے آپ کی باتوں پر ہر اُس کا خیال رکھتے ہوئے میں اُن کے افسوسناک انجام پر بلا تامل اظہار ہمدردی کرتا ہوں کہ وہ ایک ایسی صورتِ حالات میں گرفتار ہو گئے جو دن بدن نازک ہوتی جا رہی ہو۔ میں آپ سے یہ بات چھپانا نہیں چاہتا کہ اُس اعتماد پر نظر رکھتے ہوئے جو ہمدی اور اس کے بڑے بڑے شرکا کار کو دجن میں اکثر سوڈانی میرے شاگرد ہیں، مجھ پر ہر میرے لیے آسان ہو کہ میں اس مصیبت سے گارڈن پاشا کو رہائی دلوادیتا جو ان پر منڈلا رہی ہو بشرطیکہ گریم اور عثمان ڈگنا کے درمیان آخری لڑائی نہ ہوئی ہوتی۔ لیکن اس خوفناک جنگ کے بعد جس میں بے انتہا عربی خون بہایا گیا ہو میرا وثاق خیال یہ ہو کہ ہمدی اور اُس کے رفقاء اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ کھوئی ہوئی زمین کو از سر نو حاصل کرنے اور اپنا وقار جانے کے لیے یہ ضروری ہو کہ خرطوم پر قبضہ کر لیا جائے اور مسٹر گارڈن کو یا گرفتار کر لیا جائے یا مار ڈالا جائے۔

۱۔ غالباً اشارہ گارڈن کے اُس یادداشت کے متعلق ہے جو سنہ ۱۸۵۵ء میں مرتب کی گئی تھی اور جس میں سلطنتِ عثمانیہ کے اس طرح حصے تجویز کئے گئے تھے کہ مصر انگلستان کو اور میناروس کو اور یورپین ترکی دوسری خود مختار عیسائی سلطنتوں کو دے دیا جائے۔ بلنٹ نے اپنی کتاب Gordon at Khartum میں اس یادداشت کا ذکر کیا ہے

۲۔ دیکھو ضمیمہ

Received at Din July 1885 from Paris

صديق الشهم الحام موسيو بلونت
بعد السلام عليكم وعلى قريبتكم الفاضلة المحترمة

ان افعالكم الجليلة تذكر واث مساعيتكم الجليلة تشكر
جوزيت خيرا وكفت شرا - ولكني ارى ان سياسة
الوزارة الحالية مماثل للسياسة السابقة في المسئلة المصرية
والسودانية - واث الواعيد الخلو لا تمين ولا تقني
من جوع - واث حل المسئلة المصرية على حسب فكري يتوقف
على المسئلة الافغانية وهي بيدى - ولذا غرمت
ان اذهب في الاسبوع القادم الى افغانستان
- وستنال بعيتك بذهابى الى تلك البلاد ان شاء الله
- وسالكب لك جميع ما افعله بشرط ان تحفظه سرا
عندك حتى يمكننا ان نضل الى نقيحة حسنة - وهك
منك ان تكون المكاتبات متواصلة - والغالب
ان سفرى يكون في يوم الثلث والسلام عليكم
وعلى قريبتكم الشريفة المحترمة
محكم بحال الدين الحسيني

١٧
١٨٨٥

بہر حال اگر آپ مبادیٰ صلح کے بارہ میں فرانسیسی زبان میں مجھے زیادہ تفصیل لکھ کر بھیجیں یعنی ایسی شرائط صلح جو آپ طے کرنا چاہتے ہیں اور جو آپ کے نزدیک قابل پذیرائی ہو سکتی ہیں تو میں آپ کے لیے ہر اُس خدمت کے ادا کرنے میں قاصر نہیں رہوں گا جو میں موجودہ حالات میں کر سکتا ہوں اور نیز ایسے ذرائع کو بہم پہنچانے میں جو بد قسمت گارڈن کی جان بچا سکیں۔

جواب کا طالب

جمال الدین الحسینی الافغانی

"پیرس ۸ مارچ ۱۸۸۵ء - جناب عالی! آپ کا مرسلہ گرامی نامہ ابھی موصول ہوا ہے۔ اُسے میں نے نہایت غور کے ساتھ پڑھا اور اب میں اس کا جواب لکھ رہا ہوں۔ آپ کو چاہیے کہ آپ اُس اہمیت کو نظر انداز نہ کریں جو عام مسلمانوں کے نزدیک مہدی کے روحانی مشن میں مضمر ہے ساتھ ہی اس کو بھی نظر انداز نہ کیجئے کہ وہ لفظ مہدی سے کیا مراد لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس لفظ کا مفہوم غیر مسلموں سے اسلام کو نجات دلانے والا ہے۔ اب میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ مہدی سے کیونکر ایسی صلح کی جاسکتی ہو اور کیونکر اُس کی پیش قدمی کو روکا جاسکتا ہو تاکہ انگریزوں کو مصر میں رہنے کی اجازت مل جائے۔ لیکن مبادیٰ صلح اگر یہ ہوں کہ مصر مصریوں کے پاس رہے گارڈن پاشا مع اپنے عیسائی رفقاء کے بچائے جائیں اور انگریزی افواج مصر سے ہٹالی جائیں تو اس صورت میں میرا خیال ہے کہ اس معاملہ کو خوش گوار انجام تک پہنچانا ممکن ہو سکے گا۔ اگرچہ یہ کام بالکل آسان بھی نہیں ہے اس سے مہدی کے حملہ کو بھی ایک خاص وقت تک روکا جاسکتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ ضروری ہوگا کہ ایک ایسا وفد جس میں زیادہ مسلمان اور چند انگریز ہوں مہدی کی خدمت میں بھیجا جائے۔

اور مسلمانوں کو یہ کہنے کی ہدایت کر دی جائے کہ ہم مصر کی اسلامی قوم کی طرف سے آئے ہیں۔ اس لیے کہ اگر اُن کو مصری حکومت کی جانب سے بھیجا جائے گا تو مجھے یقین نہیں کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکیں گے کیونکہ ہمدی کو حکومتِ انگریزی سے سخت نفرت ہے اور اگر وہ لوگ حکومتِ انگریزی کے نمائندے ہوں گے تو ان کی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔ شیخ المرغانی کے ذریعہ ہم کو اس کا کافی ثبوت مل چکا ہے۔ باقی رہا ان انگریزوں کا مسئلہ جو اس مشن کے رکن ہوں گے تو ان کے متعلق یہ اچھی طرح سمجھ لیا گیا ہے کہ وہ اپنی گورنمنٹ کے انسر ہوں گے اگرچہ کہ واقعہ یہ ہے کہ تمام اشخاص خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائی مشن کے ممبر ہوں گے۔ اس مشن کے بھیجنے کا فیصلہ ہو گیا تو ان حالات میں جن کے بیان کرنے کی میں آپ کے روبرو جرات کر رہا ہوں مجھے یقین ہے کہ آپ اس مشن کے سب سے پہلے ممبر نام زد کئے جائیں گے۔ کیونکہ مسلمانوں کو آپ جیسا حامی اور مددگار میسر نہیں آ سکتا۔ باقی رہے وہ مسلمان جن کا بھیجنا ضروری سمجھا جائے گا سو میں اُن کے نام بتا دوں گا اور آپ ناموں کو عین موقع پر ظاہر کر دیں جب کہ خاص طرزِ عمل کے متعلق فیصلہ ہو چکا ہو۔ آپ مجھ سے استفسار کرتے ہیں کہ توفیق پاشا کی جگہ کس شخص کو مقرر کرنا چاہیے میرا جواب یہ ہے کہ جب موقع آئے گا تو آپ کے یا کسی اور کے لیے جانشین معلوم کر لینا مشکل نہ ہوگا۔ وہ شخص وہی ہوگا جسے مصری قوم چاہتی ہے اور اس کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

آپ کا محب صادق

جمال الدین الحسینی الافغانی

”پیرس، مئی ۱۸۸۷ء۔ جناب عالی! میں ابھی اٹلی سے آیا ہوں۔ ٹیورن کی نمائش میں بھی گیا تھا۔ آج صبح آپ کی دو چٹیاں مجھے موصول ہوئی ہیں جن کو

میں نے نہایت غور کے ساتھ پڑھا ہے۔

آپ کے آخری خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ گارڈن کے انجام سے زیادہ سروکار نہ رکھیں گے اور اس سے ایک مرتبہ اور آپ کی روح کی عظمت اور وفاداری کا نقش میرے دل پر بیٹھ گیا ہے۔ آپ کی اس دلی خواہش کا کہ آپ جنرل گارڈن کے متعلق خط و کتابت والی "بلیوئیک" مجھے بھیجنا چاہتے ہیں جس کی مدد سے بلاشبہ آپ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جنرل موصوف مسلمانوں کے حامی اور اسلام کے دوست نہ تھے، شکریہ ادا کرتے ہوئے میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ آپ کا اسم گرامی ہر مسلمان کے دل میں بالخصوص اور ہر عرب اور مشرقی کے دل میں بالعموم منقش رہے گا اس لیے کہ جو دل چسپی آپ اُن کے معاملات میں لے رہے ہیں وہ ایسی ہے کہ وہ مشکور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ مجھے امید ہے کہ آپ مخصوص وفاداری کے ساتھ اُسی شاندار راستہ پر گام زن رہیں گے اور یہ کہ خدائے برتر اس محنت کا اجر آپ کو دے گا۔ جو آپ ان کے لیے کر رہے ہیں....."

آپ کا صادق

جمال الدین المحیسنی الافغانی

"پیرس ۱۲ مئی ۱۹۳۷ء۔ سلام کے بعد میں ہی صرف آپ کی ناپاک کوششوں کا مرہون منت نہیں ہوں جس کی وجہ سے گورنمنٹ سوڈان کا علاقہ خالی کر دینے پر مجبور ہو گئی ہے۔ یقین رکھیے کہ تمام مسلمان بالخصوص عرب آپ کے اس کارنامہ پر تہ دل سے شکر گزار ہیں اور آپ کی سرگرمی اور جرات کے معترف ہیں آپ کا اسم گرامی جو اہرات کے حروف میں لوح پر لکھا جائے گا اور عزت اور احترام کے القابوں سے مزین کیا جائے گا لیکن

ابھی تک ایک کام ایسا ہی جو باقی رہ گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ گورنمنٹ سے کہیں کہ مہدی کے حملوں کے روکنے کی ذمہ داری کس پر عاید ہوتی ہے۔ ساتھ ہی یہ کہ گورنمنٹ شاہ راہ تجارت کو کس طرح مسدود رہنے کی اجازت دے سکتی ہے۔ کیا ایسی حالت میں جب کہ گورنمنٹ نے سوڈان کے خالی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے گورنمنٹ پر واجب نہیں کہ وہ کسی قابل اعتماد آدمی کو مہدی کے پاس شرائط صلح مرتب کرنے کے لیے بھیجے اور مصر کو مہدی کے حملوں سے بچائے اور اس طرح قتل و خونریزی کو بند کرائے اور تجارتی راستوں کو کھلوائے۔ میرا خیال ہے کہ اگر یہ سوال پارلیمنٹ کے روبرو پیش کیا جائے گا تو سب ممبر اس سے اتفاق ظاہر کریں گے۔

مجھے یہ کام آسان معلوم ہوتا ہے کہ اخراجات طرہ ہو جانے کے بعد اس کام کی تکمیل کے لیے آپ ہی کی ضرورت پڑے گی۔ لیکن مہدی سے صلح کے بغیر صورتِ حالات کبھی پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی۔ یہی وہ بات ہے جس کا آپ تک پہنچانا میں ضروری سمجھتا ہوں۔

آپ کا دوست

جمال الدین الحسینی الافغانی

ان خطوط سے اس امر کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ اہم معاملات میں شیخ اپنی عادت کے خلاف کس قدر مدبرانہ اور معتدل اور محتاط رویہ اختیار کرنے پر قادر تھے۔ مزاج کی گرمی و حدت کو کبھی کبھی ضرورت وقت کے لحاظ سے تدبیر کا اعتدال دبا ہی لیتا تھا!

شیخ کے مشورہ پر عمل نہ کر کے سوڈان کے معاملہ میں برطانوی حکومت نے جنرل گارڈن کی جان کو بہت سستا فروخت کیا۔ براؤن نے انقلاب

Jemal el Din July 18
Algeria

٣٤

صديق الشهم الهيام مرسو بلونت
بعد السلام عليكم وعلى قريبتكم الفاضلة المحترمة

انني ارسلت اليكم مكتوباً يوم الجمعة ١٧ من الشهر
وبينت فيه اراءاتي وما عرّضت عليه - ثم في هذا
اليوم (يوم السبت) واصلني مكتوب من قريبتكم
المحترمة تدعيني الى الذهاب اليكم (الندوة)
- ولكنني ما ادرى هل يترتب حقيقة فائدة على
مجيئي - وهل حضركم على يقين من ذلك او يكون
الامر مبنيّاً على وعود كاذبة واهام باطلّة بلا
الكتاب ثمرة ولا اجتناء فائدة - ولا يبقى لاكم
ولا لي الا الشقة والتعب - فان كنت
على يقين من الفائدة فاكتب لي حتى احضر الى (الندوة)
وان لم تعلم حقيقة الامر ولست على ثقة من
الوزارة الحالية ارجو منك ايضاً ان تكتب لي
حتى اكون على عزمي واسافر الى (اقفانستان)
كما بينت في مكتوبي اليها بقى ارسلام عليكم وعلى قريبتكم
الشريفة الفاضلة
جمال الدين الحسيني السلام
١٨ يولييه ١٢٧٥

خط عربي پيرس سے (مورخہ ۱۸ جولائی سنہ ۱۸۸۵ ع)

ایران“ میں ان معاملات کے متعلق بلنٹ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ -
 ”گلیدسٹن میرے خیال میں بخوشی شیخ کی امداد کو حاصل کرتا
 بلکہ یہ معاملہ مجلس وزراء میں پیش بھی ہوا مگر وزارت خارجہ کا
 یہ منشا ہی نہ تھا کہ صلح اور امن سے یہ معاملہ طر ہو اس لیے یہ تجویز
 نامنظور کر دی گئی۔“

معلوم یہ ہوتا ہے کہ مصر کی آزادی کے متعلق شیخ کی شرط ناقابل قبول
 تھی اور اسی لیے وزارت خارجہ نے شیخ کے مشوروں کو نظر انداز کرنا ضروری
 سمجھا۔ تاہم یہ معلوم ہے کہ ایک انگریزی نایندہ شیخ سے مہدی کے نام تعارف
 کا خط لے کر گیا لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا البتہ جنرل گارڈن کے مارے
 جانے کے بعد پھر بلنٹ نے شیخ سے خط و کتابت کی اور ان کو لندن بلا
 کر بھی سوڈان و مصر کے متعلق مشورہ کیا۔ یہ شروع ۱۸۸۵ء کا واقعہ ہے
 جس کی تفصیلات خود بلنٹ کے ”روزنامچہ“ سے واضح ہوتی ہیں۔

”۲۵ فروری ۱۸۸۵ء۔ پیرس۔ جمال الدین نے کہا کہ اب خرطوم
 فتح ہو جانے کے بعد مہدی سے گفتگو کرنا اور زیادہ دشوار ہوگا۔ انگریز جنرلوں
 کو قتل کر کے مہدی بہت فخر کر رہا ہے۔ پھر بھی جمال الدین کا خیال تھا کہ اگر
 انگریز چاہیں تو صلح ہو سکتی ہے بشرطیکہ -

۱۔ سوڈان کو خالی کر دیں۔

۲۔ سواکن سلطان کے حوالہ کر دیں۔

۳۔ اطالیوں کو مسووا سے علیحدہ ہونے پر آمادہ کر دیں۔ اور

۴۔ سلطان سے مصر میں آزاد اسلامی سلطنت قائم کرنے کا اقرار
 کرائیں۔

۳۱ اپریل - پھر پریس آیا۔ ہمدی سے صلح کے متعلق پھر شیخ سے گفتگو کی انہوں نے کہا کہ برطانوی گورنمنٹ ایک خط ہمدی کے نام لکھے اور اس کو ابراہیم لے کر جائے۔

۱۳ اپریل - شیخ نے پھر وہی اصرار کیا کہ برطانوی گورنمنٹ مہدی کو خط لکھے۔ وہ اس کام کے لیے انگلستان جانے پر آمادہ تھے۔ بشرطیکہ میں ان کو اطمینان دلا دوں کہ وہ وہاں گرفتار نہ کر لیے جائیں گے۔ میں نے اُن کو یقین دلایا کہ گرفتاری کا کوئی اندیشہ نہیں۔ مگر وہ ہندوستان کے تجربہ کے بعد انگریزوں سے بہت بدظن ہیں۔۔۔۔۔“

اس کے بعد بلنٹ واپس گئے اور بعد کو شیخ بھی لندن پہنچ گئے چند روز ٹھہر کر وہ پھر پیرس آگئے جہاں سوڈان اور مصر کے متعلق مزید گفت و شنید کا سلسلہ جاری رہا۔ بلنٹ اپنے ”روزنامہ“ میں پھر ۹ جولائی سے اس گفت و شنید کی طرف اشارے کرتا ہے۔

۴ جولائی۔ ابراہیم کے پاس جمال الدین کا خط آیا ہے۔ جس میں اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر مصر کے معاملہ کو طے نہ کیا گیا تو وہ افغانستان جا کر وہاں انگلستان کے خلاف دشواریاں پیدا کریں گے۔“

۱۶ جولائی - رنڈلف چرچل سے ملنے انڈیا آفس گیا۔
 انھوں نے کہا کہ مجھے بہت فکر ہے کہ امیر افغانستان کیا چال چل رہے ہیں میں
 نے کہا میں جمال الدین کو پیرس سے بلا لوں گا اور اس معاملہ میں نیز مصر
 کے متعلق اُن سے باتیں کر لی جائیں گی۔ رنڈلف یہ سُن کر بہت خوش ہوئے
 اور کہا وہ ضرور شیخ سے میرے مکان پر ملیں گے۔

شیخ پیرس میں بیٹھے برطانوی سیاست کے مدوجزر کا مطالعہ کر رہے
 تھے۔ اور مصر و سوڈان کے معاملہ میں برطانوی وزارت کے طرز عمل سے
 مایوس ہو چکے تھے۔ انگلستان میں کلیڈسن کی وزارت ختم ہو چکی تھی اور نئی
 وزارت میں لارڈ رنڈلف چرچل وزیر ہند بنائے گئے تھے یہ صاحبِ بلنٹ
 کے خاص دوست تھے۔ اس لیے بلنٹ کی اُمیدیں پھر کچھ تازہ ہو گئی تھیں۔
 جب انھوں نے شیخ کو چرچل سے گفتگو کرنے کے لیے لندن مدعو کیا تو شیخ
 نے، ۱۶ جولائی کو بلنٹ کی دعوت کا جواب ایسے الفاظ میں دیا جس سے
 برطانوی سیاست کے متعلق اُن کی بے اعتمادی اور مایوسی صاف صاف
 مترشح ہوتی تھی۔ انھوں نے لکھا کہ -

”میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ موجودہ وزارت کی حکمت عملی بھی مصر اور
 سوڈان کے معاملہ میں کچھ گزشتہ وزارت کی سی ہے۔ بیٹھے اور خوشگوار وعدوں
 سے بھوک کب رفع ہوتی ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں مصر کا مسئلہ افغانستان
 کے مسئلہ پر منحصر ہے اور افغانستان کا معاملہ تمام تر میرے ہاتھ میں ہے اس
 لیے میں نے تو یہ طر کر لیا ہے کہ آئندہ مہفتہ افغانستان چلا جاؤں اور میرے
 جانے سے انشاء اللہ آپ کا مقصد بھی پورا ہوگا غنقریب میں آپ کو اپنی
 کارگزاری سے مطلع کروں گا۔ شرط یہ ہے کہ اُس کو اُس وقت تک اپنے ہی



محمد احمد 'مہدی' سوڈانی

تک رکھے گا جب تک کہ ہم کسی مفید نتیجہ پر نہ پہنچ جائیں۔ مجھے اُمید ہے کہ خط و کتابت کا یہ سلسلہ برابر جاری رہے گا۔ غالباً اس شنبہ کو میں روانہ ہو جاؤں گا۔“

اس خط کے روانہ کرنے کے بعد ہی شیخ کو بلنٹ کی بیگم صاحبہ کا ایک خط وصول ہوا جس میں انھوں نے شیخ کو بہ اصرار لندن بلایا تھا۔ اس خط کا جواب شیخ نے بلنٹ کو حسب ذیل الفاظ میں دیا۔
 ”مارچولائی یوم جمعہ کو ایک عریضہ ارسال خدمت کر چکا ہوں۔ جس میں میں نے اپنے عزم و ارادہ سے جناب کو مطلع کر دیا تھا۔ آج ۱۸ جولائی کو آپ کی بیگم صاحبہ کا ایک عنایت نامہ وصول ہوا جس میں مجھ سے فرمائش کی گئی ہے کہ میں پھر لندن آؤں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میرے آنے سے حقیقتاً کیا فائدہ مرتب ہوگا مفت میں میں آپ کے پاس آؤں اور نتیجہ کچھ بھی نہ نکلے۔ مجھے کچھ فائدہ ہو نہ آپ کو۔ ہاں زحمت مجھے اور آپ کو دونوں کو ہو تو اس سے حاصل کیا۔ اور اگر آپ بھی صورتِ حالات سے ناواقف ہوں اور موجودہ وزارت پر بھی آپ کو اعتماد نہ ہو تو مجھے لکھیے گا تاکہ میں اپنے ارادہ کو عمل میں لاسکوں یعنی افغانستان روانہ ہو جاؤں جیسا کہ اپنے گزشتہ خط میں لکھ چکا ہوں۔“

شیخ کی مایوسی اور کبیدہ خاطر کی کا اندازہ مندرجہ بالا الفاظ سے ہو سکتا ہے تاہم بلنٹ کے اصرار سے مجبور ہو کر وہ پھر لندن گئے اور زڈلف چرچل اور ڈرامنڈ ولف وغیرہ سے گفتگو کی۔ اس زمانہ کے حالات کا کچھ پتہ بلنٹ کے ”روزنامچہ“ کے اندراجات سے چلتا ہے۔

”۲۱ جولائی - مفتی عبدہ اور شیخ پریس سے لندن آئے“

۲۲ جولائی - عبدہ نے میرے ہاں کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد یہ بحث چھڑ گئی کہ قرآن مکمل کتاب کی صورت میں حروف بہ حروف نازل ہوا تھا یا اس کے اجزا زبانی بعد کو جمع کر لیے گئے۔ عبدہ کی یہ رائے ہے کہ زبانی فقرات لکھ کر مرتب کئے گئے ہیں“

صبح کو رنڈلف چرچل میرے مکان پر شیخ سے ملے۔ رنڈلف چرچل جمال الدین سے بہت اخلاق کے ساتھ ملے وہ دونوں فرانسیسی زبان میں گفتگو کرنے لگے مگر میں نے دیکھا کہ رنڈلف بہت کم فرانسیسی بول سکتے تھے اس لیے میں نے ترجمانی شروع کر دی۔ رنڈلف نے پہلے ہمدی کی موت کے متعلق شیخ سے سوال کیا شیخ نے کہا کہ ان کو یقین نہیں کہ ہمدی کا انتقال ہو گیا ہے۔ لیکن اگر یہ صحیح ہے تو بھی حالات میں کوئی فرق نہیں آتا سوڈانی ہمدی کا جانشین مقرر کر لیں گے۔ رنڈلف نے سوال کیا کہ وہ کون ہوگا۔ شیخ نے کہا کہ عثمان ڈگنا تو نہ ہوگا بلکہ ہمدی کے ساتھیوں میں سے کوئی مذہبی آدمی ہوگا۔ عثمان ڈگنا جنرل ہوگا مگر خلیفہ نہ بنایا جائے گا جانشین کا تقرر بالکل اسی طرح ہوگا جس طرح پیغمبر کے انتقال کے وقت ہوا تھا سب سے زیادہ مذہبی آدمی جانشین بنایا جائے گا“

رنڈلف نے افغانستان دروس کے متعلق سوالات کئے شیخ نے کہا کہ۔
”عبدالرحمن اچھے فوجی جنرل ہیں مگر سیاست داں نہیں ہیں لیکن وہ کوئی احمق بھی نہیں ہیں۔ افغانوں کی کثرت ان کے ساتھ ہے مگر ان کے خلاف بغاوتیں کر دینا کچھ مشکل نہیں۔ افغانی سادہ لوح ہوتے ہیں۔ سیاست سے نادانگاہ اور ہر وقت لڑنے کے لیے تیار۔ روس شیر علی

وغیرہ کے ایک درجن لڑکوں میں سے کسی کے ذریعہ سے بغاوت کرا سکتا ہے۔ یہ کام بالکل آسان ہے۔ مگر روسیوں کا افغانستان سے لڑنے کا اس سال ارادہ نہیں بلکہ وہ ان شاہزادوں میں سے کسی سے دوستی کرنا چاہتے ہیں اور ان کے ذریعہ سے بدامنی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ خود مددگار بن کر انگریزوں کے خلاف لڑیں گے اور کشمیر اور پشاور کے اضلاع کے دینے کا وعدہ کریں گے اگر ہندوستان میں بغاوت ہو جائے۔ افغان ان کی بات پر بھروسہ کریں گے۔

رنڈلف۔ کیا افغان روسیوں سے زیادہ ہم سے نفرت کرتے ہیں۔
شیخ۔ روسیوں نے افغانیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے مگر انگریز افغانیوں کے خلاف تین لڑائیاں لڑ چکے ہیں۔

رنڈلف مگر کیا آپ سمجھتے ہیں کہ روسیوں نے اسلام کو ہم سے زیادہ نقصان نہیں پہنچایا؟
شیخ۔ روسیوں نے چند چھوٹے ملکوں پر قبضہ کیا جیسے کریمیا سرکاشیا وغیرہ مگر انگریزوں نے دہلی کی سلطنت تباہ کی مصر اور سوڈان پر قبضہ کر لیا۔

رنڈلف۔ مغلوں کی حکومت کو تو مرہٹوں نے تباہ کیا۔
مرہٹے تو آتے رہے جاتے رہے۔ جس طرح نادر شاہ آیا مگر تم ہندوستان میں جم گئے اور تم نے سلطنت کو تباہ کر دیا۔ روسیوں سے زیادہ تم لوگوں سے نفرت کرنے کے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے تین وجوہ ہیں۔
(۱) چونکہ تم نے دہلی کی سلطنت کا خاتمہ کیا۔

(۲) چونکہ تم مساجد کے اماموں اور موزدوں اور محافظوں کو کوئی تنخواہ نہیں دیتے مگر روسی دیتے ہیں اور

(۳) یہ کہ تم نے مذہبی اوقاف کو ختم کر دیا۔

رنڈلف - مگر ہم بعض مساجد وغیرہ کی مرمت تو کراتے ہیں۔

شیخ - صرف اس حالت میں جب کہ وہ خوبصورتی کے لحاظ سے

اچھی ہوں مگر مذہبی تقدس کے لحاظ سے نہیں۔ اور تم فوج میں اعلیٰ عہدے

مسلمانوں کو نہیں دیتے روسی ایسا کرتے ہیں۔

رنڈلف - ہندوستان کی ریاستوں میں بہت سے مسلمان اعلیٰ

عہدوں پر ہیں۔

شیخ - وہ تو ریاستیں ہیں۔ برطانوی حکومت نہیں ہے جو چیز معذہ

میں نہیں گئی وہ ہضم کیونکر ہو گئی (یعنی جب ریاستوں کا الحاق ہی نہیں

کیا گیا تو ان کو برطانوی ہندوستان میں شامل کیونکر سمجھا جاسکتا ہے)

رنڈلف - تو آپ مسلمانوں کے لیے انگلستان کو روس سے زیادہ

خطرناک سمجھتے ہیں۔

شیخ - میں یہ نہیں کہتا مگر میں ماضی کا ذکر کر رہا ہوں۔ انگلستان

نے ہم کو روس سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ مگر روس اس وقت زیادہ

خطرناک ہے اگر روسی (پنجبدہ یا ذوالفقار تک کا ذکر نہیں کرتا)

مرو میں پانچ برس بھی رہ گئے تو نہ افغانستان ہوگا نہ ایران ہوگا نہ اناطولیہ

ہوگا نہ ہندوستان ہوگا۔ سب ہضم ہو جائیں گے۔ روسی پنجبدہ وغیرہ کو

چھوڑ بھی دیں تو مرو میں ضرور رہیں گے۔

رنڈلف - یہ سچ ہے مگر ہم آپ کی رائے میں کیا کریں۔

شیخ - آپ کو اسلام سے اتحاد کرنا چاہیے افغانوں سے ایرانیوں سے

ترکوں سے مصریوں سے اور عربوں سے۔ آپ کو چاہیے کہ روسیوں کو

پون گھنٹہ تک یہ گفتگو ہوتی رہی اور چلتے وقت دروازہ پر زلزلہ
نے مجھ سے کہا کہ جمال الدین بہت صاف گو اور صبح رائے رکھنے
والے آدمی ہیں۔“

۲۸ جولائی - عہدہ نے بلنٹ کو ان تین افسروں کے نام بتائے جن کو سلا تین پاشا نے رشوت دے کر طل الکبیر پر اعرابی کو شکست دلوائی تھی۔ ایک علی یوسف ترک تھا وسطی ڈویژن کا افسر جو میدان سے ہٹ گئی اور جس نے ویلزلی کی فوج کو راستہ دے دیا اور دوسرا عبدالرحمن حن مصری جو سوار اسکاڈ کا افسر تھا اور جس نے اعرابی کو انگریزوں کی پیش قدمی کی اطلاع قصداً نہ دی اور تیسرا راغب سید ایک چرکسی۔

۳۰ جولائی - ہم ساڑھے گیارہ بجے جیمس اسٹریٹ آئے ... جن امور پر خاص طور سے دلف نے جمال الدین سے گفتگو کی وہ یہ سوال تھا کہ ہمدی سلطان کی خلافت کو مانے گا یا نہیں۔ جمال الدین نے کہا یہ ناممکن ہے۔ ہمدی نہ ہمدی کے جانشین اس کو مانیں گے لیکن وہ اس طرح ایک دوسرے کو مان لیں گے کہ جس طرح سلطان مراقش ہیں۔ اگر مصر میں اسلامی حکومت قائم ہو جائے تو اس صورت میں سوڈانیوں سے کوئی خطرہ نہ ہوگا۔ ہمدی کی حکومت مذہبی ہے اور قاہرہ کے علما اس کو مصر پر حملہ نہ کرنے دیں گے۔ اس کے بعد تخلیہ مصر کے متعلق بحث ہوتی رہی۔ دلف نے کہا کہ برطانوی دفتر خارجہ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اگر برطانیہ مصر کو خالی کر دے گا تو جرمنی فرانسیسوں کے قبضہ کو قبول کر لے گا۔ سید نے کہا کہ وہ اس کا یقین نہیں کرتے کہ فرانسیسی مصر پر قبضہ کر لیں گے۔ آخر میں شیخ اور دلف اس رائے پر متفق ہو گئے کہ اگر انگلستان تخلیہ مصر کی کوئی تاریخ مقرر کر دے گا تو سلطان سے سمجھوتہ کر لیا جائے گا۔ غلامی کے سوال پر جمال الدین نے کہا

کہ بت پرست قبیلوں کو غلام بنانے کا انداد مشکل ہو مگر حبشیوں کی گرفتاری اور فروخت کے روکنے پر ہمدی آمادہ کیا جاسکتا ہو وہ اس معاملہ کو اور انگلستان و مصر کے تجارتی تعلقات کو طر کر سکتے ہیں سلطان کو مصر کے متعلق معقول سمجھوتہ پر راضی کر دینا مشکل نہ ہوگا اور جمال الدین نے کہا کہ اگر ضرورت ہوگی تو وہ خود قسطنطنیہ چلے جائیں گے..... یہ میری تجویز تھی..... ورنہ سلطان کو اعرابی کی واپسی پر رضامند کرنا مشکل ہوگا.....

بلنٹ کے ”روزنامہ“ سے معلوم ہوتا ہے کہ جولائی سے اکتوبر تک شیخ لندن میں موجود تھے اور اس زمانہ میں مصر اور سوڈان کے متعلق گفتگو کا سلسلہ برابر جاری رہا برطانوی وزارت نے ڈرمینڈ ولف کو ان معاملات کے سنبھالنے کے لیے منتخب کیا تھا چنانچہ اس کے بعد کی تمام گفتگو شنید ولف ہی سے ہوتی رہی۔

۸ اگست - ولف نے پورٹسمتھ سے پھرتار دیا کہ وہ جمال الدین سے ملنا چاہتے ہیں۔

۹ اگست - جمال الدین کے ساتھ لندن گیا اور ولف سے طویل گفتگو کی۔ ولف ترکی ایران و افغانستان کے اتحاد کو بہت پسند کرتا ہے مگر کہتا ہے کہ اس معاملہ کے متعلق وہ فی الحال سلطان سے گفتگو نہ کرے گا۔ محض تذکرۂ کچھ کہ سکے گا۔ اس لیے کہ اس قسم کے معاملہ میں گفتگو کرنا سفیر کا کام ہے۔ گفتگو زیادہ تر مصر کے متعلق کی جائے گی۔ ولف کو یہ معلوم کرنے کی بہت فکر ہے کہ سلطان اور ہمدی کے درمیان کس طرح سمجھوتہ کرایا جاسکے گا۔ جمال الدین نے کہا کہ فی الحال اس

سوال کو اٹھانے یا اس کا فیصلہ کرانے کی ضرورت نہیں۔ سلطان کو جس بات کی زیادہ فکر ہوگی وہ تخلیہ مصر کی تاریخ کا تعین ہو۔

دلف نے کہا کہ تاریخ کا تعین تو ممکن ہو اور تجویز یہ ہو کہ سلطان سے کہا جائے کہ وہ تخلیہ سے پہلے مصر کے حالات درست کرنے میں مدد کریں۔ اس پر جمال الدین نے کہا کہ یہ سب بہ اطمینان طر ہو جائے گا۔ اور یہ بحث ضروری نہیں کہ عارضی طور پر ترکی فوج بمصر میں رہے گی یا برطانوی۔ اس کے بعد جمال الدین کی دلف کے ساتھ قسطنطنیہ جانے کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ اصل سوال یہ تھا کہ سلطان اُن کو انگلستان کی پالیسی کا مخالف جانتے ہیں۔ اور جب تک دلف صحیح حالات نہ بتائیں گے وہ یہی سمجھتے رہیں گے کہ جمال الدین دلف کے اغراض کے خلاف کوشش کرنے آئے ہیں.....

..... دلف نے کہا کہ جمال الدین کے ساتھ علانیہ کوئی تعلق ظاہر کرنا ان کے لیے دشواری کا باعث ہوگا..... پھر خرچ کا سوال تھا میں نے کہا کہ شیخ کو جس قدر رُپئی کی ضرورت ہوگی میں دوں گا....“

۳۱ اگست۔ چرچل کا ایک خط ملا جس کے ساتھ دلف کا ایک تار تھا جس میں لکھا تھا کہ جمال الدین کی قسطنطنیہ میں ضرورت ہو....“

۳۱ اگست۔ سید کو لے کر لندن گیا۔ انڈیا آفس میں زند دلف سے ملا۔ میں نے اُن سے کہا کہ سید قسطنطنیہ جاتے ہیں مگر وہ یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ دلف سلطان کے کان میں یہ بات ڈال دے کہ اب جمال الدین انگلستان کے مخالف نہیں ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ اُن کے پہنچنے سے پہلے دلف گفتگو نہ کریں اور مصر کے سوال کو اسلامی اتحاد کے

سوال سے الگ نہ رکھا جائے۔ زڈلف نے اسی وقت دلف کو ایک تار دیا جس کا مضمون یہ تھا کہ اتوار کو جمال الدین قسطنطنیہ سے روانہ ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سلطان اُن کو انگلستان کا دشمن سمجھے ہیں اس لیے یہ بات سلطان کے کان میں ڈال دی جائے کہ اب وہ ہمارے دوست ہیں اور شیخ یہ بھی چاہتے ہیں کہ آپ اسلامی اتحاد کے سوال سے علیحدہ کر کے مصر کے سوال کو نہ اٹھائیں۔

میں ابراہیم سے بھی ملا۔ میری تو رائے ہو کہ دونوں فوراً روانہ ہو جائیں۔ اور دلف کے جواب کا انتظار نہ کریں۔ کیا معلوم کہیں رائے بدل جائے اور جب کہ گیند ہمارے سامنے ہو ہم کو جرات کے ساتھ کھیل کھیلنا چاہیے مجھے ڈر ہے کہ کہیں دلف اس تار سے جو شیخ کے اصرار پر دیا گیا ہو گھبرانے لگے اگر میری رائے پر عمل کیا جاتا تو میں یہ چاہتا تھا کہ شیخ بلا شرائط کے روانہ ہو جائیں۔

۱۵ اراگست۔ ایک تار سے معلوم ہوا کہ دلف نے اپنی روانگی منگل تک ملتوی کر دی ہو۔ اب جمال الدین ان کے ہمسفر ہو جائینگے۔ جیمس اسٹریٹ میں ایک خط ملا جس کو پڑھ کر سخت حیرت ہوئی۔ وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا، دلف نے جمال الدین کے سفر کے متعلق اپنی رائے بدل دی۔ زڈلف کے سکریٹری کا ایک خط ملا جس کے ساتھ دلف کا ایک تار بھی تھا۔ کہ جمال الدین ابھی روانہ نہ ہوں۔ جب تک میں قسطنطنیہ سے تار نہ دوں میں زڈلف سے بلا۔ اس تار کے بعد اُن کی رائے نہیں کہ جمال الدین روانہ ہوں۔ مہوس اس کا ہے کہ گفتگو کی شروع میں جمال الدین زیادہ مفید ثابت ہوتے مگر

اب کیا کیا جائے۔ سید ابراہیم کے ٹکٹ لے لیے گئے۔ اور میں نے فینچ کو سوپونڈ بھی دیدئے تھے۔ (میرا ہمیشہ یہ خیال رہا کہ اس رائے کی تبدیلی نے دلف کے مشن کو ناکام کیا اور ان کی ناکامی کا بڑا سبب یہی ہو کہ انھوں نے معمولی سیاست کے اصول پر ننگو شروع کی اور سید کی اخلاقی امداد حاصل نہ کی جو قسطنطنیہ میں اور دوسرے مرکوزوں پر خفیہ سوسائٹیوں کے متعلق شیخ سے حاصل ہو سکتی تھی.....

۲۷ اگست - مور کا ایک خط آیا جس میں اس نے مجھے بلایا تھا میں اس سے ملا تو اس نے رنڈلف کے نام دلف کا ایک خط پڑھ کر سنایا جس میں لکھا تھا کہ ان کی پوزیشن اس قدر نازک تھی کہ جمال الدین سے اپنا تعلق ظاہر کرنا مناسب نہیں معلوم ہوا۔ جمال الدین سوڈان میں سلطان کی خلافت کے خلاف ہیں اور اگر دلف ان کو اپنا شریک بناتے تو سلطان شاید یہ سمجھتے تھے کہ سمجھوتہ کی تجویز میں ترکی خلافت کی مخالفت بھی مضمر ہو۔ اس وجہ سے دلف جمال الدین کا نام لینے کی جرات نہیں کرتے۔ یہ سب لغویت ہو۔ سلطان کی خلافت کا سوال ہی کیوں اٹھایا جائے۔ اور جمال الدین خلافت کے مخالف تو نہیں سمجھے جاتے بلکہ اُن کے اخبار میں تو ہمیشہ خلافت کے موافق مضامین نکلتے رہے ہیں۔ سید نے قسطنطنیہ جانے سے انکار کر دیا۔ جب تک کہ دلف ان کو نہ بلائیں اس لیے کہ انھوں نے کہا کہ اگر سلطان ان سے نہ ملے تو ان کے اثرات خراب ہو جائیں گے۔.....

۲۸ اگست - رنڈلف سے جمال الدین کے متعلق باتیں ہوئیں مگر چونکہ جمال الدین دلف کے بلائے بغیر قسطنطنیہ جانے کے لیے تیار نہیں اور دلف بلانا نہیں چاہتا اس لیے اس سوال کو ختم کر دیا گیا۔

۴ ستمبر - ابراہیم بے کے پاس اسماعیل جودت کا ایک خط آیا ہے یہ طر
ہوا ہے کہ وہ جائیں گے۔ سلطان نے جمال الدین کے متعلق بھی سنا ہے کہ وہ
ایک وزیر سے ملے تھے اور اب ابراہیم کو بلایا ہے تاکہ سب حال معلوم
کریں۔ سلطان جمال الدین سے بھی ملنا چاہتے ہیں۔ مگر سید کہتے ہیں کہ
وہ سلطان کی دعوت کا انتظار کریں گے۔
۶ ستمبر - ابراہیم قسطنطنیہ گئے۔ سید لندن میں فی الحال ٹھہرے

ہوئے ہیں۔

۲۳ ستمبر - ابراہیم کا خط آیا ہے سلطان جمال الدین سے مشورہ
کرنے کے لیے ایک آدمی بھیج رہے ہیں۔
۲۸ ستمبر - منیف پاشا لندن آئے۔ سید سے اور اُن سے
ملاقات ہوئی
۶ اکتوبر - فرید بے ملنے آئے جمال الدین بھی موجود تھے مگر اُن

کی موجودگی میں فرید بے نے کچھ نہیں کہا۔ جب جمال الدین اٹھ گئے تو اُنہوں
نے مجھ سے کہا کہ قسطنطنیہ کے حالات مایوس کن ہیں اور بے چینی اس قدر
عام ہے کہ اہم واقعات کے پیدا ہونے کا امکان ہے۔ سلطنت کے ٹکڑے
ہو رہے ہیں مگر اب خطرہ ہے کہ ترکی قوم بھی اب ختم ہو جائے گی۔ اگر
کوئی سد باب نہ کیا گیا۔ اب ایسے لوگ جن میں (فرید بے) بھی ہیں یہ
سمجھتے ہیں کہ مدحت کے دستور کو پھر قائم کرنے کی کوشش کی جائے
اور سلطان کے ہاتھ سے اختیارات نکال لیے جائیں۔ موجودہ سلطان
میں عمل کی طاقت نہیں ہے مگر اُس نے سارے اختیارات اپنی وزارت
میں جذب کر لیے ہیں اور حکومت جاسوسی کے ایک بہت بڑے نظم کے

تحت ہو رہی ہے۔ اب بغاوت غیر متوقع نہیں۔ اختیارات کسی قابل فوجی جنرل کو دیئے جائیں۔ اور سلطان کو معزول کیا جائے۔ اور کوئی شخص تخت پر بٹھایا جائے خواہ وہ خاندان سے ہو یا باہر کا۔ جس وجہ سے لوگ جھکے ہیں وہ یہ ہے کہ اگر قسطنطنیہ میں کوئی بد امنی ہوئی تو روس کو مداخلت کا بھانہ مل جائے گا۔

بسمارک دستوری حکومت کے احیاء کی مخالفت کرے گا مگر شاید

لارڈ سلسبری خلاف نہ ہوں وہ (فرید بے) یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ برطانوی حکومت روسی حکومت کی مداخلت کو روکے گی یا نہیں اور سلطان کا تغیر پسند کرے گی یا نہیں۔ ممکن ہے کہ عبدالحمید روس کے پھندے میں پڑ جائے اور اپنی رعایا کے خلاف روسی حفاظت حاصل کرے۔ اس امر کے متعلق کہ انگلستان ترکی میں انقلاب کو پسند کرے گا یا نہیں انھوں نے خواہش کی کہ کسی ذریعہ سے لارڈ سلسبری کے خیالات معلوم کئے جائیں۔

۸ اکتوبر۔ جمال الدین سے قسطنطنیہ کے حالات کے متعلق گفتگو

ہوئی اور خلافت کے متعلق بھی اُن کی رائے یہ ہے کہ مہدی یا مہدی کے جانشین یا شریف عون کو سلطان کی جگہ خلیفہ بنایا جائے یا امام سنا کو۔ مگر قسطنطنیہ مرکز خلافت نہ رہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے خود شریف حسین سے کہا تھا کہ خلافت کا دعویٰ کریں مگر حسین نے کہا کہ بغیر فوج کے دعویٰ بیکار رہی اور عربوں کا متحد ہونا مشکل ہے۔ اب جمال الدین پھر مشرق کی طرف جانے کے لیے بے چین ہیں انھوں نے کہا کہ جب تک سلطان مدعو نہ کریں قسطنطنیہ نہ

جاؤں گا۔ میں نے بھی کہا کہ اگر پارلیمنٹ کے انتخاب میں مجھے کامیابی نہ ہوئی تو میں بھی یمن میں امام سنا کے پاس جاؤں گا۔ اور خلافت کا علم بلند کیا جائے گا۔ جیسا کہ میرا چار برس پہلے ارادہ تھا۔ ۲۰ اکتوبر۔ رات ہندوستانی نمائندوں کا جلسہ اگلے ہال میں ہوا۔ ہم نے جمال الدین سے بھی تقریر کرائی انہوں نے عربی میں تقریر کی راسوامی اور چندوار کرنے بھی تقریریں کیں

یہ تمام اقتباسات ایک اچھا عکس ہیں جمال الدین کے خیالات اور ادوں اور بساط سیاست پر اُن کی نقل و حرکت کا۔ نیز یہ اقتباسات اپنے اندر اس زمانہ کے برطانوی سیاست کی ایک دل چسپ جھلک رکھتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں روس کے متعلق برطانوی مدبرین کے اندیشے بہت بڑھتے جاتے تھے اور شیخ بھی اپنی طرف سے اُن اندیشوں میں اضافہ کرتے رہتے تھے۔ افغانستان کی طرف روسی پیش قدمی نے کچھ تو یوں ہی برطانوی دفتر خارجہ کو متردد کر رکھا تھا اور کچھ شیخ بھی اُس خطرہ کی طرف بار بار اشارے کر کے دلوں میں خوف پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اگرچہ افغانستان بہ ظاہر انگریزوں کا حلیف تھا حتیٰ کہ بغیر ان کی وساطت کے کسی غیبر سلطنت سے سیاسی تعلقات بھی نہ پیدا کر سکتا تھا۔ لیکن روسی خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لیے اس کی حیثیت بہت کم تھی۔ پنجابہ پر جہاں افغانی فوجیں قابض تھیں دفعتاً روسی فوج نے حملہ کیا اور افغانی فوج کو وہاں سے نکال کر روسی جھنڈا نصب کر دیا۔ اس

سے پہلے روسی فوج کا آخری مرکز مرو افغانی سرحد سے دوسو میل کے فاصلہ پر تھا مگر پنجہ پر روسی فوج افغانستان سے صرف پچاس میل رہ گئی اس لیے قدرتاً پنجہ پر روسی قبضہ ایک زہر ملا کا نسا تھا۔ جو برطانوی مدبرین کے دلوں میں کھٹک رہا تھا۔ وہ روس کی اس چال کا کوئی نیا ”توڑ“ تلاش کر رہے تھے۔ تجویز زیر غور یہ تھی کہ انگریز مصر و سوڈان سے اس شرط پر اپنی فوج واپس بلا لیں کہ ترکی ایران و افغانستان روس کے خلاف برطانیہ سے متحد ہو جانے کا وعدہ کریں۔ گویا ایک طرف تو روس کے مقابلہ پر افغانستان کو کھڑا کر دیا جائے اور دوسری طرف روسی سرحد پر ایران اور ترکی کا زور ڈلوایا جائے اس طرح دونوں طرف روس کو متوجہ کر کے ہندوستان کی طرف سے اُس کی توجہ ہٹا دی جائے۔ غالباً بلنٹ کی تحریک پر یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ ترکی و افغانستان وغیرہ سے معاملات حل کرنے کے لیے شیخ کو واسطہ بنایا جائے اور اُن کے اثر و نفوذ سے کام لے کر روس کے خطرہ کا ازالہ کیا جائے۔ شیخ کا اثر اُس وقت افغانستان میں بہت کم تھا اور قراین یہ ہیں کہ امیر عبدالرحمن خاں شیخ کے سیاسی مسلک سے بالکل متاثر نہ تھے۔ تاہم شیخ برطانوی حکومت پر یہ ظاہر کرتے رہے کہ افغانستان میں اُن کی کوشش بار آور ہو سکتی ہو۔ اصل یہ ہو کہ شیخ مصر کی آزادی کی خاطر برطانوی وزارتِ خارجہ سے متفق ہو گئے تھے اور یہ سمجھ کر کہ روسی خطرہ کا خیال انگریزوں کو بہت سا رہا ہر وہ اس خطرہ کی اہمیت کو ہر موقع پر برطانوی مدبرین کے سامنے رکھ دیتے تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ ہندوستان کی طرف روسی پیش قدمی کا

سہ باب کرنے کے لیے انگریز مصر کے قبضہ سے دست بردار ہو کر ترکی کو اپنا حلیف بنانا چاہتے ہیں تو وہ فوراً کوشش کرنے کے لیے تیار ہو گئے لیکن آخر وقت پر معلوم ہوتا ہے کہ ڈرمنڈ ولف کو یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں شیخ قسطنطنیہ میں پہنچ کر سلطان کی مطلقیت اور شہنشاہیت کے متعلق کوئی ایسی بات نہ کہ بیٹھیں کہ سلطان بدظن ہو جائیں اور اصل معاملہ بار آور نہ ہو سکے۔ اُس وقت قسطنطنیہ میں قوم پرستوں کی جماعت سلطان کے خلاف اور دستور حاصل کرنے کے لیے خفیہ کوششیں کر رہی تھی اور ولف کو یہ خیال ہوا ہوگا کہ کہیں شیخ بجائے اس کی امداد کرنے کے قسطنطنیہ پہنچ کر قوم پرستوں کی سازشوں میں شریک نہ ہو جائیں۔ بہر حال اس کے خیالات جو کچھ بھی ہوں عین وقت پر ولف کے انکار نے شیخ کو بہت برہم کر دیا۔ چنانچہ شیخ نے ارادہ کر لیا کہ برطانوی سیاست کی اندرونی ریشہ دہانیوں سے الگ رہ کر وہ اپنا راستہ اختیار کریں گے اور جیسا کہ وہ بلنٹ کو بتا چکے تھے ان کا ارادہ تھا کہ انگریزوں کے خلاف روس افغانستان اور ترکی کو کسی طرح متحد کر دیا جائے۔ روس میں زیادہ تر کانکوف کے ذریعہ سے وہ اپنی تجویز کو کامیاب بنانا چاہتے تھے معلوم

۱۸۷۸ء تا ۱۸۸۱ء روسی افغانہ نویں جس کو اُس زمانہ کی روسی سیاسیات میں بہت دخل تھا اور جو اعلیٰ روسی طبقات میں بہت با اثر کہا جاتا تھا ماسکو میں پیدا ہوا۔ اصلاحات کا حامی تھا اور عرصہ تک کوشش کرتا رہا کہ روسی حکومت آئینی اصلاحات نافذ کرے لیکن جب تک میں نپلسٹ اور سوشلسٹ فرقوں کا زور زیادہ شروع ہوا تو اُس نے اپنی تحریک کو ملتوی کر دیا۔ اور شاہی اقتدار کا معاون ہو گیا ۱۸۶۳ء سے ۱۸۸۱ء تک روس کے مشہور اخبار ماسکو گزٹ کا ایڈیٹر شاہی سے اُس کے تعلقات دوستانہ تھے۔

ہوتا ہے کہ پہلے براہِ راست افغانستان جا کر کوشش کرنے کے بجائے انھوں نے یہ بہتر سمجھا کہ اول روس جائیں اور پھر وہاں سے افغانستان۔ چنانچہ شیخ یہ منصوبہ لے کر آخر ۱۸۸۸ء میں انگلستان روانہ ہوئے۔

اس موقع پر بیجا نہ ہوگا اگر ہم عروۃ الوثقیٰ کے صفحات سے روس و ایران و افغانستان کے مسائل پر شیخ کے خیالات کا ایک عکس پیش کر دیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ کس طرح برطانوی مدبرین کو روس کی پیش قدمی اہل ہند کی بددلی اور افغانیوں کی سیاست سے متاثر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ عروۃ الوثقیٰ کی اشاعت مورخہ اگست ۱۸۸۸ء میں انھوں نے ایران و افغانستان کے عنوان سے لکھا کہ:-

”وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمْ

الْبَيِّنَاتُ طُغُوْا وَلَا يَكُنْ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ “

ہندوستان پر روسی حملہ عنقریب ہوا چاہتا ہے۔ انگریزوں کی سیاست اور حرص پر یورپ کی سلطنتوں میں تقریریں کی جاتی ہیں جن سے روس کو اس کے مقاصد میں تقویت پہنچتی ہے اور اس کے لیے اسباب مفید پیدا ہوتے ہیں اور اس کے ہندوستان سے قریب پہنچنے کی مدت کم ہوتی جاتی ہے۔ یہ ڈھنگ ہے سیاست کا۔ کیا اچھا ہو اگر اس وقت سفارت ایران امارت افغانستان کے ساتھ متحد ہو جائے تو ان دونوں کے لیے اس اتحاد میں بہت فواید ہیں۔ اگرچہ اہل ہند کی انگریزوں سے نفرت روس کے لیے مفید ہوگی مگر اس کے راستہ میں بہت سی مشکلات ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور وہ مشکلات ایران و افغانستان کی موالات ہی سے رفع ہو سکتی ہیں۔ روس ان راستوں سے نادانف

ہو۔ اُس کو امرائے ہند کے ساتھ مواصلت کی ضرورت ہو۔ اس طرح کہ وہ (روس) اہل ہند کی ضرورت کے موقعوں پر اُن کی مدد کرے اور اُن کی خواہشات پوری کرے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کا کوئی راستہ ایرانیوں اور افغانیوں کے اتحاد کے علاوہ نہیں ہو۔ وہ ایسا اتحاد ہو کہ دونوں جنگ اور صلح میں شریک رہیں۔ روس کے لیے آسان نہیں ہو کہ وہ ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے ایران و افغانستان سے مدد حاصل کر سکے الا اس صورت میں کہ وہ ان دونوں کو اپنا شریک بنائے اور مالِ غنیمت اور نفع میں حصہ دینے کا وعدہ کرے۔ اگر یہ نہ ہوگا تو روس کے مقاصد میں بلاشبہ بڑی رکاوٹ پیدا ہو جائے گی۔

روس کے لیے کیونکر ممکن ہوگا کہ بغیر رہنمائی کے وہ ہندوستان کے راستوں پر جہاں شیروں کے جنگل ہیں بہ آسانی جاسکے۔ کیونکر ممکن ہوگا کہ وہ تنگ گزرگاہوں سے بغیر دوسروں کی امداد حاصل کئے گزر سکے۔ روس اس معاملہ کی مشکلات سے ناواقف نہیں ہو اور وہ جانتا ہو کہ ایک بڑی قوم کا (انگریزوں کا) اس ملک سے ہٹا دینا جہاں وہ ساہا سال سے جمی ہوئی ہو اور رتبہ اور افتخار حاصل کر چکی ہو بہت بڑا کام ہو اور اُس کے لیے ضرورت ہو بہت سے مددگاروں اور بھی خواہوں کی۔ روس کے سامنے سوائے افغانستان اور ایران کے کوئی نہیں جس سے وہ امداد حاصل کر سکے۔ یہ حکمت عملی صحیح نہ ہوگی کہ روس ان دونوں کو الگ کر کے ہندوستان کی فتح کے منافع تنہا خود حاصل کرنا چاہے جب کہ وہ خود ابوابِ ہند کو محض تجارت کے لیے

فتح کرنا چاہتا ہے۔ افغانیوں پر لازم ہے کہ اس معاملہ میں اپنے عظیم الشان فواید کو وہ عقل رشید اور فکرِ سدید کے ساتھ دیکھیں اور اپنی آنکھیں کھولیں اور ایرانی بھائیوں کی طرف اتحاد اور اتفاق کی غرض سے بڑھیں۔ درحقیقت ان دونوں کے درمیان کوئی بات ایسی نہیں جس کی بنا پر اختلاف کو حق بجانب کہا جائے۔ دونوں کی اصل ایک ہے اور دونوں ایک ہی رشتہ میں منسلک ہیں اور وہ بہترین رشتہ ہے یعنی دینِ اسلام۔ ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ ایسے وقت میں ان کا باہم اختلاف نہ صرف اُن کے اور ان کے ایرانی بھائیوں کے لیے ضررِ رساں ہوگا بلکہ تمام مذہبی بھائیوں کو سخت مضرت پہنچے گی۔ پس ایرانیوں اور افغانیوں پر لازم ہے کہ اپنے جنسی رشتہ کو دیکھیں اور اپنے مذہب کے فروعی اختلاف کو کلمہٴ اسلام کی بے عزتی اور رشتہٴ اتحاد کے ٹوٹنے کا سبب نہ بنائیں۔ اس لیے کہ یہ عقل کے خلاف بات ہے کہ جزو کے اختلاف کی وجہ سے کل کو کمزور کر دیا جائے۔

میرے خیال میں دونوں فریق جانتے ہیں کہ اُن کا باہمی اختلاف ہی ان پر مصیبت لایا ہے۔ گزشتہ زمانہ کے بعض سیاست دانوں نے اس فروعی اختلاف کو تفرقہ پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا تھا اور اپنی اس تخم ریزی سے انھوں نے منافع بھی حاصل کئے۔ لیکن اب اس درخت سے سوائے ہلاکت اور فساد کے کوئی پھل نہیں مل سکتا۔ اور میرا یہ خیال کسی عقلمند انسان پر مخفی نہیں۔

افغانیوں کے لیے اس وقت ہرگز جائز نہیں ہے کہ وہ فروعی اختلاف کو لے کر کھڑے ہوں۔ ان کو تو اب وحدتِ اصلی کی طرف بڑھنا چاہیے

اس لیے کہ خطرات نے اُن کو ہر طرف سے گھیر لیا ہے اور ان کے لیے نجات کا کوئی راستہ نہیں سوائے ایرانی بھائیوں سے نجات حاصل کرنے کے۔ یہ وقت بہت قابلِ قدر وقت ہے اور اس فرصت کو غنیمت سمجھنا چاہیے اور افغانیوں کے لئے اس معاملہ میں عذر کی کوئی گنجائش نہیں۔ خصوصاً ایسے وقت میں جب کہ سلطنتِ ایران کی صدارت کا ایسا بڑا عظیم القدر رفیع الشان واسع العرفان شخص والی ہوا ہے جو وحدت کی حالت دیکھ کر کثرت کی حالت کا اندازہ کر لینا ہے جو مناسب موقع پاکر کام کرنے سے نہیں رکتا ہے اور وہ ایسا شخص ہے کہ اس کو تفرقہ کے مظاہرے اتحاد کے مقاصد سے بے نیاز نہیں کرتے۔ وہ ایک چیز سے بہت سی چیزیں سمجھ لیتا ہے اتحاد اس کا مشرب ہے۔ اور اختلاف اس کا مذہب ہے۔ میرے خیال میں تو وہ ہر ایرانی کے لیے ایک رحم کرنے والا باپ ہے۔ وہ ان کے کلمہ کو جمع کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتا ہے اور کبھی اختلافِ مذہب اور فردی تفرقہ کا خیال نہیں کرتا۔ جس جماعت کو وہ اپنے ساتھ شامل کرتا ہے وہ اس کا بہت لحاظ کرتا ہے اس لئے افغانیوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے ایرانی بھائیوں کو حلف دینے کے لیے اپنے ہاتھ بڑھائیں اور اس فرصت کو ضائع نہ کریں۔ دونوں فریقوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے اتحاد و اتفاق کو اپنے وطن کی شہرِ پناہ بنالیں اور اپنے دشمنوں کو ذلیل کرنے کا آلہ کار۔ اور اپنے شہرلوں کو عافیت و امن کا ذمہ دار بنائیں۔ بلاشبہ اس طرح وہ شرفِ عظیم اور ہمیشہ قائم رہنے والی عزت حاصل کر سکیں گے۔

پھر ۱۶ اکتوبر ۱۳۳۵ء کی اشاعت میں شیخ نے ”برطانیہ روس

کر دیں۔ ان تمام واقعات نے انگریز سیاست دانوں کے خیالات میں سخت پریشانی اور کھلبلی مچا دی ہے.....

انگریز شاید یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی اس تمسخر انگیز پالیسی کے ساتھ دوسری سلطنتوں سے کھیلتے رہیں گے۔ دوسری طرف وہ اپنی اور اپنی قوم کے اسلحہ کو تیار کر رہے ہیں اور اس طرح دوسروں کو دھوکہ دے کر اپنے اندیشوں اور دھمکوں کو طفلانہ طریق پر مٹانا چاہتے ہیں۔ اس پالیسی کو ممالک ہند میں وہ اپنی سیاست کی بنیاد سمجھتے ہیں (اور اس پر لارڈ ڈفرن نے ممالک ہند کے حفاظت کے لئے بھروسہ کیا، یہ ڈفرن وہ ہے جس نے مصر میں فساد برپا کیا ہے۔ جب وہ مصر میں فساد برپا کر چکا تو اس کو ہندوستان پر حکمران بنایا گیا۔ بلفاسٹ میں تقریر کرتے ہوئے ڈفرن نے کہا کہ ”میں اپنے کو سید سمجھتا ہوں اس لیے کہ مجھے موسیو جیرس روسی وزیر خارجہ کے متعلق واقفیت حاصل ہے“ اس کے بعد ڈفرن نے اپنی تقریر میں موسیو جیرس کی بہت تعریف کی اور کہا کہ میں موسیو جیرس کے دل میں انگریز اور روس کے درمیان صلح اور امن قائم کرنے کی سچی خواہش اور رغبت پاتا ہوں“ اخبار المومیریاں دو بلاٹیک نے تو روس کو لارڈ موصوف کی اس نئی پالیسی پر مبارک باد دیتے ہوئے لکھا کہ باوجودیکہ لارڈ موصوف معاہدہ کا بہت خیال رکھتے ہیں لیکن حال یہ ہے کہ دوسری طرف افغانستان کے شمال میں جنگ ہو رہی ہے اور یہ سب باتیں انگلستان کے لوگوں اور ہندوستانیوں کو دھوکہ دینے کے لیے کہی جاتی ہیں بعض اوقات خود لارڈ ڈفرن اپنے نفس کو بھی دھوکا دیتے ہیں.....

روس ایک قدم بھی مشرق کی طرف نہیں بڑھتا مگر ہندوستان پر قبضہ کرنے کے لیے۔ اور اس کا کوئی قدم اپنے کسی نہ کسی وعدے کو شکست کئے بغیر نہیں بڑھتا۔ اگر وزیر روس نے پھر اس دفعہ لارڈ ڈفرن سے کوئی وعدہ کیا تو یہ حلف بھی گزرے ہوئے اور توڑے ہوئے وعدوں سے کچھ مختلف نہ ہوگا۔ ذاتی محبت اور تعلقات کا سیاسیات میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اور ذاتی تعلقات پر بھروسہ کرنا انگریزوں کی بد عقلی اور کمزوری کی دلیل ہے۔

سبحان اللہ روس نے تو باب ہند (سرخس) پر قبضہ کر لیا اس کی شہرت ان اطراف میں پھیل گئی۔ اہل سرخس کے دل اس کی طرف مایل ہیں۔ نہ وہ انگریزوں سے ڈرتا ہے نہ اپنی رفتار کم کرتا ہے۔ تو پھر آج کے دن کے بعد انگریز کیوں خطرہ محسوس کریں گے۔ یہاں تک کہ روس پنجاب میں نازل نہ ہو جائے یا نہر سندھ سے گزر نہ جائے۔ روس کے بڑھنے کی یہی حالت وہی تو مشرق میں برطانوی قبضہ کم ہوتا جائے گا اور برطانوی طاقت کو گرہن لگ جائے گا۔ قضا و قدر کا فیصلہ تو صادر ہو چکا ہے اور کہ دیا گیا ہے کہ

”بَعْدَ الْقَرْمِ الظَّالِمِينَ“

مسلمانانِ بلخ و بخارا کے تعلقات شیخ کے ساتھ عقیدت مندانہ روس آتھے اور غالباً ازہر کے ذریعہ سے شیخ کی شہرت وہاں تک پہنچی تھی مگر اس تمام کھیل کا جو شیخ کھیلنا چاہتے تھے ایک مہر بہت کمزور تھا یعنی امیر عبدالرحمن خاں۔ امیر عبدالرحمن خاں نہ صرف

شیخ کے سیاسی مسلک سے متفق نہ تھے بلکہ اُن کی سیاست کا رخ شیخ کی تجاویز سے بالکل مختلف تھا اور وہ روس اور انگلستان دونوں سے اپنے تعلقات قائم رکھ کر ان دو رقیبوں کی رقابت سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے اور کسی طرح اس کے لیے تیار نہ تھے کہ ان دونوں میں سے کسی سے بھی بگاڑیں۔ اس لیے شیخ کا یہ سفر کچھ زیادہ نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوا۔ نیز اس سفر کے کچھ زیادہ حالات بھی معلوم نہیں۔ تاہم شیخ کی زندگی کا یہ زمانہ بہت طوفانی تھا اور ان کے اس سفر روس اور مقاصد سفر کے متعلق کہا جاسکتا ہو کہ اُن کے "دریائے بیتابی" کی یہ بھی صرف "ایک موجِ خون" تھی۔

متضاد روایتوں اور مختلف بیانات کی وجہ سے ان کی زندگی کے واقعات کی زنجیر پھر اس جگہ الجھ گئی ہو اور ان کے سفر و حضر کے صحیح راستے تاریخیں اور واقعات سب مشتبہ ہو گئے ہیں۔ کب گئے، کس راستے سے گئے، کتنے عرصہ قیام کیا؟ یہ سب مشتبہ ہوئے۔ سوائے اس امر کے کہ وہ لندن و پیرس سے روانہ ہو کر روس گئے ضرور۔

اس زمانہ میں روسی مسلمانوں کے حالات بہت خراب ہوئے تھے۔ زار کی حکومت میں اسلامی آبادی ایک کروڑ چالیس لاکھ کے قریب تھی۔ ۲۹ روسی صوبوں میں ۵ ہزار کے قریب اسلامی مکاتب و مساجد تھیں اور ۸ ہزار کے قریب علما اور مدرسین تھے۔ مذہبی تعلیم کا بہت بڑا مرکز بخارا تھا۔ کم و بیش ایک صدی ان مسلمانوں پر ایسی گزر چکی تھی جب کہ زار کی شہنشاہیت نے ان پر ہر قسم کا ظلم و

ستم روا رکھا تھا حتیٰ کہ ان کے حقوق عام روسی رعایا کے حقوق سے بھی کم تھے مگر یہی ظلم و ستم تھا جس نے ان کے مردہ جسموں میں زندگی کی حرارت کو قائم رکھا بلکہ ان کے اندر ان کی مظلومیت نے ایک خاص قومی تحریک پیدا کر دی تھی۔ انیسویں صدی کے شروع میں انھوں نے دوسرے اسلامی ممالک خصوصاً ترکی سے تعلقات پیدا کرنے شروع کر دیے تھے ان کا ایک اخبار ترجمان باوجود حکومت کی ممانعت کے کثیر تعداد میں شائع ہوتا تھا اور کریمیا، کوہ قاف سائبیریا ترکستان و چین میں بہت دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاتا تھا جس قدر حکومت کی تعدی بڑھتی تھی اسی قدر روسی مسلمانوں کی قومی تحریکات بھی قوی ہوتی جاتی تھیں۔ انیسویں صدی کے شروع میں انھوں نے ایک عرضداشت زار اور سلطان ترکی کی خدمت میں پیش کی جس میں اُن مذہبی مصائب کا ذکر کیا گیا تھا جو حکومت کی سختی کی وجہ سے روسی مسلمانوں کو پیش آرہے تھے۔ پروفیسر وینسبری نے اپنی ایک کتاب میں ان مظالم کے حالات تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں اس کا بھی ذکر کیا ہو کہ روسی مسلمان تحریک اتحاد سے متاثر ہونے لگے تھے۔

بہر حال شیخ جس زمانہ میں وہاں پہنچے وہ زمانہ روسی مسلمانوں کے لیے سخت ابتلا کا زمانہ تھا۔ شیخ کے بعض شاگردوں کے بیان سے واضح ہوتا ہو کہ اپنے دورانِ قیام میں شیخ نے منسلک سیاسیات مسلمانان و حکومتِ روسیہ کے متعلق ارکانِ حکومت سے تبادلہٴ خیالات کیا۔

اُس وقت تک روس میں قرآن مجید اور مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کی اشاعت بھی ممنوع تھی اور کہا جاتا ہے کہ شیخ ہی کی کوشش سے یہ ممانعت منسوخ ہوئی۔

اس دفعہ روس میں شیخ کا قیام ایک سال سے زیادہ نہیں رہا۔ اور وہاں سے شیخ اپنے منصوبوں میں ناکام ہو کر پھر یورپ کی طرف لوٹے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ روس سے براہِ وسطِ ایشیا اور افغانستان بھی گئے مگر اس کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔ بہر حال اب ان کا رخ ایران اور ترکی کی طرف تھا۔ اور بظاہر روس اور افغانستان سے اُن کی دل چسپی ختم ہو رہی تھی۔

بوشہر ^{۱۸۸۱ء} کے آخر ^{۱۸۸۱ء} کے شروع میں شیخ رؤس سے واپس آئے۔ اور غالباً پیرس ہوتے ہوئے بوشہر چلے گئے۔ مرزا محمد علی خاں سریر السلطنت (پسر حاجی خان مرحوم وزیرِ مسقط) نے رسالہ کاوہ (دبرلن) کے شمارہ ۵ نمبر مورخہ ستمبر ۱۹۳۱ء میں شیخ کے قیام بوشہرہ کا ذکر کیا ہے۔ مرزا احمد علی خاں لکھتے ہیں کہ شعبان ۱۳۳۲ھ ہجری میں شیخ بوشہر تشریف لائے اور ان کے والد مرحوم کے مہمان رہے۔

”اس عرصہ میں میری تعلیم و تربیت سید صاحب کے سپرد رہی۔ میری عمر بارہ سال کی تھی اور مجھے علومِ جدید کا درس دیا جاتا تھا۔ میرے لیے سید صاحب نے جو کتابیں منتخب فرمائی تھیں۔ ان میں کتاب جغرافیہ و ہیت مولفہ مرزا عبد القادر نجم الملک مرحوم۔ سیرت ^{۱۱۴ھ} - مطابق جون ۱۸۸۱ء۔

نپولین مطبوعہ پیرس اور ترجمہ گلستانِ سعدی مطبوعہ مصر و کتاب کلید
دو منہ مطبوعہ ممبئی۔ خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ یہ سب کتابیں
سید صاحب نے اپنے کتب خانہ سے عنایت فرمائی تھیں.....
سید صاحب نے نسخہ التاریخ پڑھنے سے منع فرمایا تھا۔ حاجی نجم الدولہ
کی کتاب ختم کرنے پر سید صاحب نے ایک چھوٹا سا کرۂ ارض مجھے ہدیہ
فرمایا تھا مرزا نصر اللہ اصفہانی اور فرصت شیرازی (مرزا نصیر حسین شیرازی
فرصت الدولہ) ان کے قیام بو شہر کے زمانہ میں ان سے بہت ارتباط
رکھتے تھے۔ سید صاحب تقریباً تین ماہ یہاں رہے اور اس کے بعد
ماہ ذیقعدہ میں محمد حسن خاں اعتماد السلطنت نے شاہ کی طرف سے سید
صاحب کی خدمت میں ایک تار بھیجا۔ اور طہران آنے کی دعوت دی
چنانچہ سید صاحب اسی مہینہ میں خسرو نامی غلام کو ہمراہ لے کر طہران
تشریف لے گئے۔“

شیراز و اصفہان ہوتے ہوئے شیخ آخر ۱۲۸۷ھ میں دارِ طہران
ایران ہوئے۔ مرزا لطف اللہ شیخ کے ایران آنے کا حال یوں لکھتا ہے۔
”ظل السلطان نے شیخ کے اصفہان پہنچنے کی اطلاع بذریعہ تار
در بار ایران کو دی اور شیخ سے درخواست کی کہ وہ دس دن ان کے
ہمان رہیں۔ جب تک وہ اصفہان میں رہے ظل السلطان کو معارف
انتظام و عدالت سمجھاتے رہے۔ دس دن بعد اصفہان سے طہران
روانہ ہوئے۔“

سہام السلطنت مصطفیٰ قلی خاں نے جو اُس وقت حاکم بزد و
کاشان تھے شیخ کی مہانداری کی اور اپنے چند آدمی اُن کی خدمت



ناصرالدین شاه قاجار

پیدائش ۱۷ جولائی ۱۸۳۱ع، تخت نشینی ۱۷ ستمبر ۱۸۴۸ع،

قتل یکم مئی ۱۸۹۶ع

کے لیے ساتھ کر دیئے۔ ۲۲ ربیع الثانی ۳۳۳ھ ہجری کو شیخ طہران پہنچے۔ اور حاج محمد حسن امین الضرب کے جہان ہوئے۔ طہران میں حکومت کی جانب سے اُن کا شاندار استقبال کیا گیا۔

تجوں بطہران واصل شد بصورتِ بیارِ اہتمام استقبال کردہ شدند۔ لہ

شاہ سے شیخ کی پہلی ملاقات کے متعلق آقا سید حسن خاں نے اپنے بیان میں جس کو مرزا لطف اللہ نے اپنی کتاب میں بجسہ چھاپا ہر ایک خوب لطیفہ لکھا ہے۔

اعلیٰ حضرت فرمودند۔ ازمن چہ می خواہی۔ سید گفت "دگو ش!"
شاہ از جرات او متعجب شد

لطف اللہ خاں اس ملاقات کا حال اس طرح لکھتے ہیں کہ
"ناصر الدین خاں در روز ملاقات بہ سید می گویند از این کہ دعوت مارا اجابت و متحمل مسافرت بہ ایران شدہ آید دشما را ملاقات نمودم بسیار خوش و قتم و حضرت شما بہ ہر بابیہ کہ می باشد من شما می شناسیم"
مرزا لطف اللہ نے اس گفتگو کو لفظاً لفظاً نقل کیا ہے اور اس میں شیخ کی زبان سے یہ بھی کہلوا یا ہے کہ "بے ایرانی داسد ابادی ہستم"
مرزا لطف اللہ موقعہ ہو یا نہ ہو ہر جگہ شیخ کے ایرانی ہونے کی بحث کو ضرور ٹھونس دیتے ہیں۔ اول تو یہ ممکن نہیں ہے کہ شاہ اور شیخ کی گفتگو لفظاً لفظاً مرزا نے سُنی ہو۔ اور اس کو یاد رکھا ہو اور نہ یہ قرین قیاس ہے کہ شیخ نے ایک نوجوان لڑکے سے وہ گفتگو بیان کی

ہوا اور نہ خود مرزا یہ لکھتے ہیں کہ شیخ نے یہ گفتگو اُن سے بیان کی تھی یا اس وقت انھوں نے شیخ کے مفصل بیان کو قلمبند کر لیا تھا۔ بہر حال جس قدر واقعات معلوم ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دفعہ ایران میں شیخ کے زیادہ قیام کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی بلکہ بہت جلد ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ شیخ کو ایران سے رخصت ہونا پڑا۔ ان اسباب کے متعلق مختلف بیانات ہمارے سامنے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ نے شیخ سے خواہش کی کہ وہ نظم حکومت میں اصلاحات تجویز کریں لیکن جب شیخ نے کچھ تجاویز پیش کیں تو وہ نہ صرف شاہ کے منشا کے خلاف تھیں بلکہ تمام امرا اور اراکین سلطنت بھی اُن تجاویز کو دیکھ کر بہت ناخوش ہوئے اس لیے کہ نہ تو شاہ اور نہ اُس کے درباری کسی ایسی تجویز کو پسند کر سکتے تھے جو شاہی اقتدار کو کمزور کرنے والی ہوتی اس لیے کہ تمام امرا و وزرا کے ذاتی فوائد اسی اقتدار سے وابستہ تھے۔ غالباً شیخ کی طرف شاہ نے زیادہ تر اس وجہ سے توجہ کی تھی کہ شاہ روس کی زبردستیوں سے تنگ آگیا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ چونکہ شیخ کے اثرات روس میں کافی ہیں وہ کوئی سمجھوتہ کرا سکیں گے لیکن بعد کو شیخ کے یہی اثرات شاہ کی بدگمانی کا باعث ہو گئے۔ وہ واقعہ یوں ہے کہ جس زمانہ میں شیخ طہران آئے تھے۔ شاہ نے اتفاقاً گیلان کا سفر اختیار کیا لیکن موسم سرما کی شدت سے مجبور ہو کر قزوین لوٹ آیا۔ طہران میں شاہ کی غیر حاضری کے زمانہ میں شیخ نے حسب عادت نہایت جرات کے ساتھ اصلاحات کے نفاذ اور استبداد حکومت کے متعلق گفتگو

کرنی شروع کی۔ اب امرانے شاہ کو یہ بتایا کہ اصفہان میں جب ظل السلطان نے شیخ کی بہت مدارات کی تھی تو اس کا باعث یہ تھا کہ ظل السلطان یہ چاہتا تھا کہ شیخ روس میں اپنے اثرات سے کام لے کر حکومتِ روسیہ کا زور شاہ پر ڈلوائیں تاکہ شاہ ظل السلطان کو اپنا جانشین اور وارث تاج و تخت قبول کر لے۔ تعجب نہیں کہ شاہ کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہو اور تعجب نہیں کہ امرانے اس بیان میں کسی حد تک کچھ اصلیت بھی ہو غرض کہ۔

”چوں روز بروز سید جمال الدین افغانی در ایران مشہور گردید و شہرت او زیادہ شدہ می رفت این مسئلہ بہ طبیعت شاہ بد خورد۔ بنابر علیہ جمال الدین افغانی مستحضر شدہ از ایران بطرف روسیہ حرکت نمود“۔

اس مختصر بیان کے علاوہ اور بھی بیانات نقل کرنے کے قابل ہیں جن سے شیخ کے ایران سے رخصت ہونے کے اسباب پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ آقا سید حسن جاں کے بیان کو مرزا الطیف نے بھی نقل کیا ہے۔

..... دے انگلیسہا کہ در کمیں بودند بہر وسیلہ کہ بود بطور غیر مستقیم ذہن شاہ را نسبت بہ او مسموم کردند طغیانِ اعرابی پاشا و خروجِ ہمدی سوڈانی و عزلِ خدیو مصر ہمہ را بابا شاہ بیان

مظفر الدین شاہ کا بڑا بھائی جو گورنرِ اصفہان تھا مگر مظفر الدین روس اور انگلستان کی اعانت سے تخت نشین ہوا اور ظل السلطان محرم رہ گیا۔ وہ تخت کا حق دار سمجھا جاتا مگر ناصر الدین نے اپنے چھوٹے بھائی کو اپنا جانشین نامزد کیا۔ اللہ۔ جریدہ مصورہ استانبول۔

آوردند بطورے کہ ماندن سید با تغیر عقیدہ شاہ در ایران مشکل شد.....“
خود مرزا لطف اللہ حسب عادت بہت طوالت کلام کے ساتھ ان واقعات میں پھول پتے بناتے ہیں۔

.....”سید ہم بہ آں نفوذ کلمہ و قوۃ خطابہ موثرے کہ

داشت در طهران ہم مانند ہمہ جایا کمال جرات و صراحت از خزانی اوضاع مملکت و لزوم اصلاحات و ترقی و تمدن بر ضد استبداد حرف می زد۔ و کلمہ حریت و مدنیت را در میان کلمہائے روشن جاداد.....“

دستیماً در مقام ارشاد و تنبیہ این ملت بخت برگشتہ خواب رفتہ برآمد و بطورے کہ در خور آب و ہوائے طهران بود از انتشار لواحق و مقالات جانوز در محضر علماء و اعیان و اکابر و تجار و اتقا و مواعظ متوسل گردیدند۔
ایں نفس آتین بقدر ذرہ بردل ایں ملت اثر نکرد.....“

تا این کہ بواسطہ نقص عیش ہمایوں و سلب لاحدی کہ لازمہ صلاح است و بعضے از وزرائے خائنین خود خواہ و پارہ از علمائے سور کہ ہمہ وقت از عوام مردم استفادہ کردہ اند بترک و ہمدستی دستہائے اجنبی متفق و در مقام شکایت و مغلطہ کاری بر آئند و از روئے اغراض شخصیہ وطن عزیز را خراب خواستند و راضی بہ اطاعت اجانب شدہ در مقام ضدیت بر آئند و ناصر الدین شاہ را بہ سخنان غرض آمیز زیادہ از حد خالی نمودند کہ مبادا اساس مدنیت و مشروطیت در ایران استوار و برقرار شدہ وجود خبیث خاین شاں نابود و عاقل گردد۔ تا ایں کہ اولیائے دولت خاصہ مرزا علی اصغر خان صدر اعظم خاین کہ مذاق سید در مزاج آں مانند سم قاتل بود شاہ ساؤ

لوح را از وعده خود پشیمان نموده و خاطرش را از سید رنجانید و بحدی
سعایت نمودند که گفتند که اگر چهار روز دیگر سید در طهران بماند سلطنت
را صاحب دشمار خلع خواهد کرد - شاه بسیار متوحش شده مجرمانه بجای
سید محمد حسن امین الضرب که میزبان سید بوده ابلاغ می نماید که توقف سید
جمال الدین را در طهران بجهات چند مناسب نمی دانم به ایشان بگوئید که
چندے بروند و به خراسان باشند تا وقت مناسب دیده ایشان را بطلبیم -
 حاجی محمد حسن فرمایش شاه را به سید می رساند - جواب می گویند که حال که
زمتان است وقتی که موسم بهتر شود بهر جا که خود میل داشته باشیم خواهیم
رفت پس از گذشتن زمتان و اعتدال هوا این محضر را بنامرالدین شاه نوشتند -

عزم نجد و قطیف را داشتم صنع الدوله اعتماد السلطنه بر حسب امر شہریاری به
دار الخلافه دعوت نمود - اتثال نموده آدم - بحمد الله شرف حاصل شد - اکنون قصد
عزیمت فرنگستان را دارم - اجازه سلطان را فریضه ذمه خود می دانم - و بجز تحصیل
اذن مقصد دیگر نیست البته هر جا باشیم خود را خادم مقاصد عالیہ و مساعد افکار
شہریاری که حفاظت دین صیانت مسلمین است می دانم -
شاه نے اس معروضہ کا حسب ذیل جواب بھیجا :-

جناب آقائے سید جمال الدین مقصود از ملاقات شما حاصل شد اکنون
که می خواهید به فرنگستان به روید بسیار خوب است محض این که وجود
مبارک ما را در نظر داشته باشید و فراموش نه نمایند - یک انقیہ
وان للماس جهت شما فرستادم و ماہم ہیچ وقت شمارا فراموش نخواہم
کرد - شہر رجب سنۃ ۱۲۸۵ ہجری -

انتقال ہو گیا اور شیخ کی جو تجاویز خاص اُس کی ذات سے وابستہ تھیں وہ سب ناکام رہیں۔ ماسکو سے شیخ پیٹر و گرا دل چلے گئے اور چند روز وہاں مقیم رہے کہا جاتا ہے کہ وہاں ان کی ملاقاتیں زار روس سے بھی ہوتی رہیں بلکہ ایک بیان تو یہ ہے کہ زار نے ان کو مسلمانوں کا شیخ الاسلام بنانا چاہا۔

”در روسیہ زار روس باسید جمال الدین افغان ملاقات کرد و بشار الیہ عہدۃ شیخ الاسلام مسلمین موجودہ روسیہ را تکلیف کرد۔ اما سید جمال الدین افغانی با ایں صورت جواب داد کہ من ذاتم بطریق مسلمانان می باشم.....“

”من ذاتم بطریق مسلمانان می باشم“ کا مفہوم غالباً یہ تھا کہ یہ منصب پہلے ہی سے مجھے حاصل ہے پھر جدید تقرر کی ضرورت نہیں۔ اس سفر کے متعلق دوسرا بیان جو ہم تک پہنچا ہے آقا سید حسن عدالت کا ہے ۱۱۹ھ

”در سن ۱۱۹۰ قمری سید جمال الدین وارد پیٹرو گرا دل شد۔ نظر بر ایں کہ شخص مشہور بود اغلب ایرانی ہا بہ ملاقات او رفتند۔ بندہ ہم در ضمن ملاقات با ایشان آشنائی پیدا کردم و بہ روزی آشنائی مابعد بہ صمیمیت شد..... تمام اوقات بیکاری خود را در حضور صرف می کردم بالاخر محرمیت تا حدی رسید کہ تمام افکار و عقاید خود

۱۱۹ھ جریدہ مصورہ استانبول

ایران کے مشہور قوم پرستوں میں سے ہیں اور آذر بائجان میں بہت اہم قومی خدمات انجام دے چکے ہیں ۱۱۹۰ھ تک طہران میں موجود تھے۔

را مفصلاً بہ بندہ شرح می دادند و ہرچہ ذیلًا عرض می کنم عیناً روایت خود مرحوم است مخارج اقامت پیٹر و گراڈ را ظل السلطان تکفل کردند از زمان اقامت در پاریس روابط سید جمال الدین با کات کوف کہ از جریدہ نگاران مشہور روسیہ بود دوستی کامل با امپراطور داشت شروع شدہ بود و یکے از اسباب سفر سید بہ روسیہ دعوت کات کوف می باشد اصل نقشہ او تہیہ اتحاد اسلام و استخلاص دول اسلامی از چنگ انگلیس بود و بہ ہمیں لحاظ و ایما گرفتار ضدیت انگلیسہا گر دیدہ حتی در پیٹر و گراڈ ہم دقیقہ از اعمال او غافل نبودند ۔

در این ایام سید در نظر داشتند کہ وسائل جنگ روس انگلیس را فراہم سازند تا ہمہ موقعہ قیام بدست آورد و لے روسیہا کہ جدیداً از محاربہ عثمان متخلص شدہ گرفتار اختلال مالیہ بودند بہ ہیچ جنگ جدیدے حاضر نبودند ۔ سید جمال الدین از باز تولیف مدبر وزارت خارجہ روسیہ ملاقات کردند و لے مدبر مرہور ابر از مساعدت بانقشہ ایشان نمودند اوصاف ظل السلطان ہم مختل شدہ و از رسانیدن وجہ بہ سید عاجز ماند تا ناصر الدین شاہ سفر روسیہ نمود کہ از آنجا برائے حضور و جشن جہوریت وارد پاریس شود ۔ اوقات ورود ناصر الدین شاہ بہ پیٹر و گراڈ و سفارت ایران باعلا الملک تبریزی بود ارفع الدولہ مستشار سفارت بود مفتاح الدولہ نائب سفارت و ہیچ کدام ازین آقایان با سید مرحوم روابط نداشتند کہ مایل بہ ملاقات او بہ شاہ باشند سہ نفر از رجال محترم بتوسط بندہ با

سید مرحوم ملاقات نمودند کہ در ملاقات وصحبت ایشان حضور داشتیم۔
مرحوم اعتماد السلطنہ بہ ہدایت من در کالسکہ تشریف آورد دست
سید مرحوم را بوسید و از مقالہ کہ بر ضد سید مرحوم بعد از عزیمت
ایشان از طهران در روزنامہ ”اطلاع“ نوشتہ بود عذر خواہی
کرد.....“

اسی مقالہ میں آقا سید حسن عدالت ایران کے حالات کا ذکر
کرتے ہوئے دریائے کاروں کے ٹھیکہ کے متعلق جو انگریزوں نے
حاصل کر لیا تھا اور جس کے خلاف روسی حکومت بہت سخت
احتجاج کر رہی تھی شیخ کے خیالات اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:-

”ہیکے از جریدہ نگاران المان مقالہ مبسوطہ در مضرت ایں راہ
نوشت معلوم نمود کہ فایدہ ازادی ایں رودخانہ بہ انگلس عاید می شود
و ضرر آن بہ روس۔ ایں مقالہ از روزنامہ المان بہ تمام روزنامہا
ترجمہ شدہ یک ولولہ و قیل و قالے در روسیہ برعلیہ ناصرالدین شاہ
تولید گردید بطوریکہ ماندن سید مرحوم را در روسیہ مضردانستہ مشارالہ
را بہ امید ہائے بہ ایران دعوت نمودند.....“

۱۸۸۹ء میں شیخ روس سے جرمنی آئے اور
جرمنی فرانس اور پھر روس
چند روز میونخ میں مقیم رہے اور
پھر پیرس چلے گئے۔ اس سفر میں پھر ایک موقعہ پر شیخ کی
ملاقات شاہ ایران سے ہو گئی اور شاہ نے پھر ان کو ایران
آنے کی دعوت دی۔

”بعد ہا در سال ۱۸۸۹ء برائے زیارت شہر گاہ

عمومی کہ درپاریں افتتاح یافت از روسیہ بطرف فرانہ
حرکت کردہ و چندے در شہر میونخ اقامت کرد۔ بار دیگر
بہ پادشاہ ایران ملاقات کردہ۔ ناصرالدین شاہ مشائراۓ را
بہ آمدن ایران دعوت نمودہ اوہم شاہ را رفتن خود
وعدہ داد.....

روایات متضاد ہیں اس لیے صحیح طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ شاہ
اور شیخ کی ملاقات کس مقام پر ہوئی۔ مرزا لطف اللہ بھی اس باب میں
خاموش ہیں مگر یہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ:-

پس از مذاکرات بسیار و اصرار ناصرالدین شاہ قرار بدست
دادن و بستن عہد و حلف نمودن شاہ بہ یکے از ہمراہاں خود می گوید
کہ از جانب من دست معاہدہ بہ جانب آقائے سید جمال الدین بسیار
مگر اد دست اورا باز پس زدہ می گوید دست تو بادست من لایق
عہد نیست و نہ شاید دیریں مجاہدات بجز دست سلطان دست دیگرے را
سزا و مناسبتے نیست کہ بادست من عہد بندد۔ خود ناصرالدین شاہ
دست پیش او آوردہ عہد موافقت را برائے آمدن سید بہ ایران از ہر
جہت موکد و محکم می نماید.....

آئندہ صفحات میں شیخ کا وہ خط درج کیا جائے گا جو انھوں نے
دوسری دفعہ ایران سے روانہ ہوتے وقت شاہ کو لکھا تھا۔ اگر لطف اللہ
کا یہ بیان صحیح ہوتا تو شیخ ایسے شخص نہ تھے کہ شاہ کے نام اپنے خط میں
اس عہد و پیمان کا ذکر نہ کرتے مگر اس خاص واقعہ کا ان کے خط میں کوئی

ذکر نہیں ہر البتہ یہ امر یقینی ہے کہ اس دفعہ شاہ نے اُن سے وعدے و وعید بہت سے کئے اور یہ اصرار ان کو ایران آنے پر آمادہ کیا تھا۔ اسی لئے غالباً امین السلطنت شاہ سے شیخ کے قرب کو اپنے لیے خطرناک سمجھتا تھا اور اس کو شیخ کا اس طرح پر ایران آنا کسی طرح گوارا نہ تھا۔ روسی حکومت اس زمانہ میں امین السلطنت سے بہت ناخوش تھی اس لیے کہ وہ انگریزوں کا ہوا خواہ سمجھا جاتا تھا اور روسی مدیرین کو یہ شکایت تھی کہ وہ خاص طور پر انگریزوں کے ساتھ مراعات کرتا ہے۔ چنانچہ شاہی بینک قائم کرنے اور دریائے کاروں پر کشتیاں چلانے کی اجازت اور معاون کا ٹھیکہ انگریزوں کو دلوانا روسی حکومت کے خیال میں امین السلطنت ہی کا کام تھا اور بدیں وجہ امین السلطنت اس فکر میں تھا کہ کسی طرح روسی حکومت کے خیالات کو اپنی طرف سے صاف کرے۔ وہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ اس وقت شاہ روسیوں کی طرف مایل ہوتے جاتے تھے پس یہ دیکھ کر کہ شیخ پھر ایران آتے ہیں اور روسی حکومت ایران میں ان کی موجودگی کو پسند کرے گی امین السلطنت کو یہ فکر ہوئی کہ کسی طرح شیخ کو راستہ ہی سے ٹال دیا جائے۔

سے دریائے کاروں
محرمہ کے پاس خلیج فارس میں گزرا ہر سہ ماہ میں رطافا
سفیر متعینہ ایران نے شاہ کو آمادہ کر کے اس دریا میں اسٹیمر چلانے کی اجازت انگریزوں کے لیے حاصل کی روس کو یہ امر بہت ناگوار ہوا اور اس نے اپنے سفیر کے ذریعہ سے شاہ پر دباؤ ڈال کر سہ ماہ میں ایرانی حکومت سے یہ عہد کر لیا کہ وہ دس برس تک ملک میں نہ کوئی ریلوے جاری کرے گی نہ کسی دوسری سلطنت کو ایسا کرنے کی اجازت دے گی چنانچہ سہ ماہ تک یہ عہد نامہ قائم رہا جس کی وجہ سے ایران میں کوئی ریلوے نہ بنائی جاسکی۔

چنانچہ اُس نے یہ تدبیر نکالی کہ اُن سے درخواست کی کہ وہ پہلے روس جا کر روسی ذرا سے اس کے معاملات کا فیصلہ کرالیں۔ شیخ نے اُس کی خواہش کے مطابق آمادگی ظاہر کی چنانچہ میونخ ہی سے شیخ پھر روس کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ تمام داستان خود شیخ نے اپنے ایک خط میں بیان کی ہے جس کا ذکر آئندہ آئے گا۔

یہ واقعہ غالباً ۱۸۸۹ء کا ہے۔ چند روز شیخ پھر روسیہ
 روٹن کا تیسرا سفر | میں مقیم رہے اور اس زمانہ میں اُن کی ملاقاتیں دو گیرس
 وزیر خارجہ کے مشیر زنیو ولف اغنا تیف

نویکوف اور جنرل ایردو حیف وغیرہ سے
 ہوتی رہیں۔ اور سلطنت کے وزیر اعظم سے بھی وہ کئی دفعہ ملے۔ ان
 ملاقاتوں کی تفصیل اور ان کے نتائج معلوم نہیں۔ تاہم کہا جاتا ہے
 کہ وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو کر دو ماہ بعد طہران واپس آئے
 اور حسب معمول حاجی محمد حسن امین الضرب کے مکان پر مقیم ہوئے۔

اس زمانہ کے مشرقی درباروں کا یہ معمولی واقعہ تھا کہ
 ایران کا دوسرا سفر | از دیدہ دور از دل دور۔ دو مہینہ کے لیے شیخ جدا ہوئے

اور اس عرصہ میں امین السلطنہ نے شاہ کو ان کی طرف سے بے پردا
 کر دیا۔ غالباً اسی لیے اس نے شیخ کو روس کی طرف بھیجا تھا۔ اب جو
 شیخ طہران آئے تو وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ تو کجا رنگ ہی بدلا ہوا پایا طہران
 آتے ہی ان کو معلوم ہو گیا کہ شاہ اور امین السلطنہ اب وہ نہیں ہیں جو
 دو ماہ پہلے جرمنی میں تھے۔ شاہی نوازشوں کے بادل برس کر گزر چکے
 تھے! شاید اُس وقت شیخ نے صحیح اندازہ نہ کیا ہو لیکن کچھ روز بعد

ان کو معلوم ہو گیا کہ ایران کا یہ دوسرا اور آخری سفر ان کی زندگی کا سب سے زیادہ طوفانی زمانہ تھا۔ یہ دیکھ کر کہ چند ہی ماہ کے اندر ان کی وہ تمام مجوزہ اصلاحات منسوخ اور مسترد کر دی گئیں جو بڑے ذوق و شوق سے مرتب کرائی گئی تھیں شیخ نے ہوا کے رخ کو پہچان لیا ہو گا۔

ایران کی تاریخ کا یہ زمانہ نہایت تاریک زمانہ تھا ایرانی قوم بربادی و ذلت کی آخری منزل پر تھی۔ ناصر الدین شاہ کی حکومت اہل ایران پر ایک عذاب کی طرح مسلط تھی۔ اس کو یورپ کی ادنیٰ دل چسپیوں نے اپنا گرویدہ بنالیا تھا اور قوم کی ساری دولت یورپ کے قہوہ خانہ اور بازاروں میں لٹائی جا رہی تھی۔ ۱۲۸۰ھ میں ناصر الدین شاہ تیسری دفعہ یورپ گیا اس سے پہلے وہ ۱۲۷۳ھ اور ۱۲۷۸ھ میں یورپ کی سیاحی کر چکا تھا۔ ان مغربی سیاحتوں نے اس کے خزانہ کو خالی کر دیا اور خزانہ حالی ہونے کے بعد مصر کی طرح ایران میں بھی اجانب کی دوستانہ مداخلت کے بہت سے موقع پیدا ہو گئے۔ جس طرح خدیو اسماعیل کی فضول خرچیوں نے مصر کو یورپین سامہوکاروں کے ہاتھ فروخت کر ڈالا تھا اسی طرح اب ناصر الدین شاہ اپنے باپ دادا کی وراثت کو سب سے بڑی بولی بولنے والے کے ہاتھ بیع کرنے پر تیار تھا۔ مغربی سامہوکار ہمیشہ ایسے بیوقوف اور عیش پرست مشرقی تاجداروں کو اپنا قرضدار بنانے کے لیے بخوشی تیار رہتے ہیں۔ انھوں نے ناصر الدین شاہ کی مالی دشواریوں سے پورا فائدہ اٹھایا اور دوستوں کے بھیس میں آکر شاہ کو اپنے ملک کا خون چوسنے کے موثر ذرائع بتانے شروع کیے۔ اکتوبر ۱۲۸۰ھ میں شاہ یورپ سے واپس آیا اور اس کے آنے کے بعد برطانیہ

اور روس کے لیے مراعات کے دروازے پہلے سے زیادہ کھول دیے گئے۔ شیخ نے بعد کو جو خطوط ایران کے حالات کے متعلق مجتہدین کو لکھے جن کے ضروری اقتباسات آئندہ صفحات میں درج کئے جائیں گے، ان میں اُس ٹوٹ کی بہت سی تفصیل بیان کی گئی ہے جو اس زمانہ میں ایران میں مچی ہوئی تھی۔ ابواز سے طہران تک سڑک بنانے کا ٹھیکہ خاص حقوق کے ساتھ ایک برطانوی کمپنی کو دیا گیا ملک کی معدنیات یورپین ٹھیکہ داروں کے سپرد کی گئیں۔ ایک شاہی بینک قائم کرنے کی اجازت انگریزوں کو دی گئی۔ روسی پرنس ڈولگروکی کو ریلوں کا اجارہ دیا گیا۔ ایک یورپین کمپنی کو لاٹری قائم کرنے کی اجازت دی گئی جس میں ملک کی ایک کثیر رقم ضایع ہوئی۔ مراعات کے اسی سلسلہ میں تمام ملک کے تمباکو کی پیداوار کا ٹھیکہ دیدیا گیا اور اسی مشہور ٹھیکہ سے ایرانی انقلاب کا آغاز ہوتا ہے۔

شیخ جب طہران پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ فضا بالکل بدل گئی ہے چند روز تو وہ خاموش اور منتظر رہے کہ شاید شاہ ان کو پھر یاد کرے۔ آخر تنگ آکر انھوں نے شاہ کو ایک خط لکھا جو معہ جواب کے مرزا لطف اللہ نے نقل کیا ہے۔

”ما بعد خود و فائزہ مطلوب مرجعہ انجام یافتہ و اکنون بضرب خانہ وارد شدہ ام قبل ازیں کہ تصرف جویم و وارد شہر شوم اظهار میدام می دانم کہ مفت خوراں دست از اغراض خود بر نمی دارند و ہمہ روز شتا خواهند نمود و شہر یار ہم در دفع شبہات و سعایت اقدام نخواہید فرمود و معتز بہ غدد و در عہد خود استوار نخواہند ماند۔ چنانچہ اگر در عہد خود از رفتی

حقیقت باقی و استوارید اجازہ فرمائی کہ وارد شدہ تشریف حاصل نمایم۔ و ہر گاہ کہ اس عہد و دعوت ہم مثل دعوت سابق است از ہمیں جا اذن و ہمید کہ نہ معترضین اعادہ سعایت نمایند و نہ اعلیٰ حضرت بخلاف عہد و میثاق در عالم مشہور شوند۔ والسلام۔ جمال الدین۔

جواب ناصر الدین شاہ۔

”از آمدن شما سرور و زحمت شما منظور و نہایت اعتماد و اعتقاد بہد و وطن خوہا شما دارم۔ مانیز در عہد خود برقرار و باقی می باشیم۔ از ہر جہت اسودہ خاطر شوید منزل در خانہ جناب صدر اعظم کردہ ہمہ روز بہ ایشان بحضور مایل گردید۔“
جواب شیخ :-

”از باقی بودن در عہد و مراحم ملوکانہ نہایت متشکرم۔ نزد صدر اعظم منزل نخواہم کرد۔ منزل متعدد دارم۔ چوں حاجی محمد حسن از دوستان من است و سابق ہم آنجا منزل داشتہ ام میل دارم بازمان جا باشیم۔“
جواب شاہ۔

”حال کہ میل دارید خانہ حاجی محمد حسن منزل کنید۔ بسیار خوب۔“
اس خط و کتابت کے بعد بھی شیخ نے دیکھا کہ وزیر اعظم اور شاہ دونوں ان سے ملاقات کرنے پر مائل نہیں ہیں۔ وہ چند ماہ تک انتظار ملاقات میں حاجی محمد حسن کے مکان پر ٹھہرے رہے۔ مگر سلطنت کے سیاسی اور اندرونی حالات کو دیکھ کر ان کی طبیعت بچپن تھی اور قیاس یہ ہو کہ وہ حسب عادت ایک دن بھی خاموش نہ بیٹھے ہوں گے۔ اور قرابن یہ ہیں کہ انھوں نے ان حالات سے کبیدہ خاطر ہو کر امین السلطنت کے خلاف عوام کے جذبات کو برافروختہ کرنا شروع کر دیا ہوگا۔ اُن کو

یہ معلوم ہو چکا تھا کہ امین السلطنہ ایران میں ان کے قیام کو کسی طرح گوارا نہیں کرتا اور وہ بھی اب بضد تھے کہ جانے سے پہلے امین السلطنہ کی قومی غداری کا پردہ فاش کرتے جائیں۔ چنانچہ وہ اپنے میزبان سے رخصت ہو کر طہران سے چند میل کے فاصلہ پر درگاہ شاہ عبدالعظیم میں جا بیٹھے۔

درگاہ شاہ عبدالعظیم وہ مقام تھا جہاں چند سال بعد ناصرالدین شاہ رضا خاں کرمانی کے ہاتھ سے مارے گئے۔ شیخ نے درگاہ میں بیٹھ کر اپنی تعلیمات اور مواعظ کا سلسلہ جاری کر دیا ان کے درس میں طلباء کی تعداد بڑھنے لگی اور اہل طہران ہزاروں کی تعداد میں درگاہ میں آنے لگے۔

ملک میں ہر طرف خفیہ انجمنیں اور قومی ادارے قائم ہو گئے اور امین السلطنہ کے خلاف عام جذبات بھرکنے لگے۔ اس وقت تک شیخ صرف امین السلطنہ کی بیخ کنی پر آمادہ تھے شاہ کے خلاف وہ ایک حرف نہیں کہتے تھے۔ اس لیے کہ وہ سمجھتے تھے کہ تمام مفاسد کی بنیاد امین السلطنہ ہی ہے اور اگر اس کی بیخ کنی ہو جائے تو شاہ کا راہ راست پر لانا دشوار نہ ہوگا۔ درگاہ میں بیٹھ کر چند روز بعد شیخ نے شاہ کے نام ایک خط لکھا جس سے اس زمانہ کے بعض اہم واقعات اور خصوصاً دوسری دفعہ شیخ کے روس جانے کے اسباب کی حقیقت واضح ہوتی تھی۔ صاحب بیداری ایران نے اس خط کو بجنہ نقل کیا ہے۔ ہم اس کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔

دیکھو ضمیمہ

”عرضداشت بسده عالیہ عتبہ رفیعہ سامیہ اعلیٰ حضرت شہنشاہ
اسلام پناہ“

میونک میں جب مجھے شرفِ نیاز حاصل ہوا اور میں مرکبِ
ہمایونی کے ہمرکاب ہوا تو اس دوران میں جناب امین السلطنۃ
وزیرِ اعظم نے یہ مناسب سمجھا کہ اس عاجز کو بعض امورِ ضروریہ
کے لیے پطرس بورغ (پیشبرگ) بھیجا جائے اور پھر اس کام کو انجام
دے کر میں ایران آؤں۔ اعلیٰ حضرت نے بھی اس تجویز کو پسند
فرمایا اُسی شب کو وزیرِ اعظم نے مجھ سے پانچ گھنٹہ گفتگو کی اُس
گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ اول تو دولتِ روسیہ اور وہاں کے اخبار
نویسوں کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وزیرِ اعظم کو نشانۂ اعتراضات
بنائیں اور اُن کی مخالفت کریں اس لیے کہ وہ یعنی وزیرِ اعظم مالک
وصاحب ملک نہیں ہیں اور معاملات کی بابت دکشاد اُن کے
اختیار میں نہیں ہے۔ دویم یہ کہ مسئلہ کارون موجودہ وزیرِ اعظم کے
اس عہدہ پر تقرر سے پہلے طر ہو چکا تھا حتیٰ کہ اس مسئلہ کے صرف
بعض اجزا بدقسمتی سے اُن کی وزارت کے زمانہ میں انجام پائے ہیں
بس پیشبرگ پہنچ کر وزارتِ روسیہ کو سمجھانا چاہیے اور بتانا چاہیے
کہ وزیرِ اعظم کے متعلق وزارتِ روسیہ کے افکارِ فاسد ہیں۔ ان کو
رفع کرنا اور نیک خیالات پیدا کرنے چاہئیں۔ نیز وزیرِ اعظم نے اس
عاجز سے یہ بھی خواہش کی کہ رئیس الوزرا موسیو کیرس اور وزیرِ خارجہ
ویلنکالے اور ریخوف وغیرہ کو سمجھا دوں کہ وزیرِ اعظم اُن کے مقاصد کے
پورا کرنے کے لیے بہر حال حاضر ہیں۔ اور اگر روس کی طرف سے

خواہش ہو تو جلد ان مسائل کو حل کر دیں اور حالات سابقہ پر اعادہ ہو جائے۔ چونکہ یہ عاجز وزیر اعظم کے مقاصد کو عین رضائے بادشاہ اور خیر ملت اسلام سمجھتا تھا اس لیے سینٹ پیٹر برگ گیا اور چند اشخاص سے گفتگو کی جن کو سیاسیات مشرق میں اپنا ہم مشرب سمجھتا تھا۔ مثلاً حربہ کے جنرل ایرو جیف - جنرل و نختر وزیر دربار - جنرل رغتا یف سفیر سابق روس در اسلامبول و مادام نو دیکف جو با اثر خاتون ہیں۔ ان سب کو میں نے اپنی رائے سے متفق کر لیا دو ہفتہ میں بیس دفعہ موسیو کرلس اور ان دوسرے اشخاص سے ملا اور پہلے اس سے کہ وزیر اعظم کے مقاصد میں سعی کروں یہ کوشش کی کہ سیاسی دلائل اور اپنے ہم خیال اصحاب کی امداد سے یہ ثابت کروں کہ دولت روس کے لیے مشرق میں بہترین اصول کار ہی ہے کہ ہمیشہ دولت ایران سے صلح اور اتحاد رکھے اور مخالفت نہ کرے اور اس سلسلہ میں ہمہ وقت ترکوں اور اراضی ترکمانیہ میں اعلیٰ حضرت کے اثرات کو ان لوگوں کے ذہن نشین کرتا رہے۔ جب میں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ مطلب حاصل ہو گیا اور ان لوگوں کا غصہ بھی فرو ہو گیا تب جناب وزیر اعظم کے مقاصد کو پیش کر کے میں نے اُن صاحبوں سے کہا کہ وزیر اعظم نے خود مجھ سے میونخ میں کہا ہے کہ اگر آپ کوئی طریقہ ایسا بتائیں کہ بغیر لڑائی جھگڑے کے تمام مسائل حل ہو جائیں اور روس و انگلستان و ایران کے سابق تعلقات برقرار رہیں تو وہ اس کام کے لیے حاضر ہیں۔ جہاں تک ہو سکا میں نے وزیر اعظم کے مقاصد میں پوری کوشش کی۔ چنانچہ ایک دفعہ پھر ان مطالب کو ان لوگوں کو لکھا۔ موسیو کرلس اور دیگر اصحاب سے جب دوبارہ دریافت

کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ اس مسئلہ میں پہلے وزیر جنگ اور وزیر مالہ اور شاہِ روس سے مشورہ کر لیا جائے پھر اگر کوئی سیاسی راستہ معلوم ہوگا کہ اس سے مسائل حل ہو جائیں تو ہم تم کو بتا دیں گے تاکہ تم وہی جواب وزیرِ اعظم کو پہنچا دو۔ البتہ اگر یہ مسائل ایسی صورت سے طر ہو جائیں کہ روس اور دولتِ ایران کے درمیان محاصمہ پیدا نہ ہو تو بہتر ہی۔ پس آپس میں مشورہ کرنے کے بعد انھوں نے اپنے اور جناب وزیرِ اعظم کے لیے دو سیاسی مسلک قرار دیئے اور مجھے کہا کہ اگر جناب وزیرِ اعظم چاہتے ہیں کہ آئندہ خطرات کا دروازہ بند کر دیں تو اُن کے پیام کے جواب میں یہ دونوں مسلک اُن کو سمجھا دو تاکہ تمام معاملات بغیر کسی جھگڑے کے ہم سب کی رضامندی کا باعث ہوں۔ یہ عاجز نہایت خوش ہوا کہ خدا کی مدد سے معاملات کو طر کر سکا اور یہ خیال کیا کہ اب میں روس کے مسلک سیاستِ خفیہ کو ظاہر کر کے ایک حد تک اسلامی سلطنت کی ایک خدمت انجام دے سکوں گا۔ جب طہران پہنچا تو شہر کے باہر ٹہر کر میں نے اپنے آنے کی اطلاع جناب وزیرِ اعظم کو دی۔ انھوں نے میرے قیام کے لیے حاجی محمد حسن امین الضرب کا مکان پسند کیا اور میں نے تین ماہ تک اپنی قیام گاہ سے حرکت نہیں کی سوائے ایک دفعہ کے کہ وہ بھی ایک ماہ بعد جب اعلیٰ حضرت سے ملاقات کی عزت حاصل ہوئی تھی۔ اس تمام مدت میں جناب وزیرِ اعظم نے اس عاجز سے کوئی بات دریافت نہیں کی کہ بطر سوارغ میں کیا ہوا اور اس معاملہ کا کیا جواب ہو جس کے لیے میں بھیجا گیا تھا۔ اس مدت میں میں نے کئی دفعہ اپنے آدمی جناب وزیرِ اعظم کے پاس بھیجے۔ انھوں نے وعدہ بھی کیا کہ مفصل ملاقات

کریں گے جب زیادہ زمانہ گزر چکا تو روس سے دریافت کیا گیا کہ اُن معاملات کا کیا فیصلہ ہوا میں نے اُس کا یہ جواب دے دیا کہ ابھی تک وزیر اعظم سے گفتگو نہیں ہوئی ہے اور گفتگو نہ ہونے کا سبب بھی مجھے معلوم نہیں۔ جب وزارتِ روس کو یہ معلوم ہوا تو انھوں نے یہ سمجھا کہ یہ سب جیلہ سیاسی تھا اور مقصود صرف مقابل کے تخیلات اور ارادوں کا معلوم کرنا تھا۔ پس یہ سمجھ کر انھوں نے اپنے سفیر متعینہ طہران کو تار دیا کہ سید جمال الدین نے وزیر اعظم کی طرف سے بعض امور میں گفتگو کی تھی اگر وزیر اعظم چاہتے ہیں کہ ان امور کے متعلق گفتگو کریں تو سفیرِ روس متعینہ طہران یا سفیرِ ایران متعینہ روس کے ذریعہ سے مکالمہ کریں اور جمال الدین کی طرف سے جنہوں نے غیر رسمی طور پر گفتگو کی تھی اب مزید گفتگو فضول ہوگی (لا حول ولا قوۃ الا باللہ) اتنا سفر کیا تکلیف اُٹھائی اور پھر روزِ اول ہی رہا جو گرہ کھل گئی تھی اُس کو پھر باندھ دینا اعلیٰ حضرت پاشاہ اسلام جو طریقہ ڈپلومیسی کو ہر شخص سے بہتر جانتے ہیں سمجھ سکتے ہیں کہ کس قدر غلط ہے۔ جناب وزیر اعظم کو جب وزارتِ روسیہ کے تار کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے بخلاف عادتِ سیاسی بجائے اس کے کہ اس امر پر افسوس کرتے کہ ان مسائل کے متعلق وزیرائے روس کے افکار کیوں اب تک معلوم نہیں کیے اور ان کے جواب کو کیوں اب تک نہ سنا۔ صاف کہہ دیا کہ میں نے وزارتِ روسیہ سے کہنے کے لیے جمال الدین سے کوئی بات نہیں کہی تھی اور نہ میں نے ان کو پطرسبورغ بھیجا تھا۔ اِنَّا بَشِّرُوْا اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ یہ کیا تماشہ ہے یہ کیا فکرِ عقیم ہے۔ یہ کیا نتیجہ فاسدہ ہے۔ اگر یہی مسلک ہے

تو غلطیوں کا کیونکر اندازہ ہو سکتا ہے اور کیونکر خطرات رفع کیے جاسکتے ہیں۔ بے سبب دلوں میں شبہ ڈالنا اور قلوب کو متنفر کرنا! خدائے توانا مجھے اپنی قدرتِ کاملہ سے اس قسم کی حرکات سے محفوظ رکھے! اور یہ عجب واقعہ ہے کہ اعلیٰ حضرت کی زبان سے اپنی تعریف و توصیف سُنے کے بعد حاجی محمد حسن امین الضرب نے مجھے بتایا کہ اعلیٰ حضرت کی مرضی یہ ہے کہ یہ عاجز طہران کا قیام ترک کر کے مقابر شہر قم میں سکونت اختیار کرے۔ میں نے بہت اپنے ذہن میں ڈھونڈا۔ مجھے اس کا کوئی سبب معلوم نہ ہو سکا۔ کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ میں نے دولتِ روس کو اپنے دلائلِ دبراہین سے دولتِ ایران کے مسلک کو قبول کرنے پر آمادہ کر لیا تھا؟ کیا اس کا سبب یہ ہے کہ وزیرِ عظم کی خواہش کے مطابق میں پطرسبورغ گیا اور ان کے مقاصد کو دولتِ روسیہ سے حاصل کرنے کی سعی کی؟ کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ جو کچھ وزیرِ عظم کی خواہش تھی اس کو جدوجہد کر کے پورا کیا؟ مجھے تو ندامت ہوئی چاہیے کہ جو کچھ نمونہ پہلی دفعہ کی جہان داری میں میں نے دیکھ لیا تھا اُس کو کافی نہ سمجھا اور پھر ایران آنے کا خیال دل میں کیا۔ مگر میں شہنشاہ کے الفاظ کو مقدس سمجھتا تھا اور چاہتا تھا کہ میرے خلاف جو کچھ کہا گیا ہے اس کو آپ کے علم میں لاؤں تاکہ آپ کو معلوم ہو کہ میں خیر خواہ اور مطیع ہوں۔ مگر اب یہ صورت ہے کہ میرے بدخواہ یہ صاحبانِ عقولِ صغیرہ اور نفوسِ حقیرہ یہ امید رکھتے ہیں کہ ذہنِ نقاد اعلیٰ حضرت کو اس عاجز کے بارہ میں بھرپور مشتبہ کر دیں۔ لہذا میں حضرت عبدالعظیم میں بیٹھا ہوا منتظر ہوں کہ کیا حکم صادر ہوتا ہے؟

امین السلطنہ کی چال سے شیخ نے شکست فاش کھائی۔ اُس نے نہ صرف شیخ کو روس کی طرف بھیج کر اُن کی غیر حاضری سے کافی فائدہ اٹھایا بلکہ بعد کو روس میں بھی شیخ کے وقار کو کافی صدمہ پہنچا دیا۔ یعنی پہلے تو اُن کو اپنا قاصد اور نمائندہ بنا کر بھیجا اور بعد کو یہ ظاہر کیا کہ جمال الدین سے حکومت ایران کو کوئی واسطہ نہیں اور وہ خود ہی دخل در معقولات کر رہے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ شیخ امین السلطنت کی چالاک کی طرح نہ ہو سکے اور اس طرح ایران میں اُن کی تمام توقعات کا خاتمہ ہو گیا۔ وہ اپنے کو خطرات میں گھرا ہوا پا کر شاہ عبدالعظیم کی درگاہ میں چلے گئے جہاں ایرانی رواج اور مذہبی روایات کی بنا پر حالت ”بت“ میں کوئی شخص گرفتار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اپنے خط کا کوئی جواب نہ پا کر شیخ نے سمجھ لیا ہو گا کہ اب اعلان جنگ ہے۔ تاہم وہ بدستور درگاہ میں بیٹھے ہوئے درس و تدریس میں مشغول رہے۔ سات ماہ تک وہاں وعظ و تلقین کا سلسلہ جاری رہا اس زمانہ میں اپنے ہزاروں معتقدین کو جو لیکچر وہ دیتے تھے اُن کا لہجہ سخت ہوتا تھا اور اپنی عادت کے مطابق وہ اپنے تلخ و تند احساسات کو بے تکان ظاہر کرتے تھے بقول صاحب بیدارئی ایران ایک دفعہ تو انھوں نے ایک تقریر میں یہاں تک کہ دیا کہ:-

”من با ظالم و مظلوم ہر دو عداوت دارم۔ ظالم را برائے ظلمش دشمن دارم و مظلوم را برائے این کہ ظلم قبول می کند و سبب جبارت ظلم ظالم می شود“

”انقلاب“ کا جو تخم وہ شاہ عبدالعظیم میں بیٹھے ہوئے بو رہے تھے

اُس کا شراخوں نے اپنی زندگی میں دیکھ لیا جب ایران میں استبدادیت کا قصر کہن سمار ہونا شروع ہوا اور اسی درگاہ شاہ عبدالعظیم کے دروازہ پر ناصر الدین ایک انقلابی کی گولی کا نشانہ بنا۔

درگاہ میں رہتے ہوئے شیخ کو سات مہینہ گزر چکے تھے کہ ایک دن شیخ کو گرفتار کر لیا گیا۔ وہ اس وقت صاحب فراش تھے جس ترکیب سے شیخ کو باہر نکال کر مقید کیا گیا اس کی تصویر جدیدہ مصورہ کا ایک وقائع نگار اس طرح پیش کرتا ہے۔

”علی اصغر خاں برائے خارج ساختن سید جمال الدین ازاں تربہ کہ تعرض بہ آں ہیچ صورت ممکن نبود یک تدبیر اندیشیدہ بود کہ ایں جنپس روایت می کنند۔“

علی اصغر خاں روزے بہ عبدالعظیم نزد مجتہدین بایک تہور در آمدہ بایک جذب می گوید کہ دیگر چہ طور می شود کہ دریں زیارت گاہ مقدس دعلوی یک ارمنی را نگہ می دارد و علویت ایں جارا نحال می کنند۔ ایں شخصے کہ دریں جا نگہ داشتہ و اسم خود را سید جمال الدین نہادہ است غیر ازیکے ارمنی چیزے دیگر نیست۔ در اول مجتہدین باور نمی کنند۔ اما علی اصغر اصرار می کند کہ باید مشاراً الیہ معاینہ می شود۔ بالطبع چون ادائے معاینہ در داخل ایں تربہ مقدس ممکن نمی شود۔ بیرون از تربہ می آورند مگر باز ہم ممکن نمی شود۔ کہ بار دیگر بہ تربہ داخل شود۔ متعاقباً عسا کرے کہ در اطراف مستور می باشند رسیدہ اورا محاصرہ می کنند۔ سید جمال الدین افغان ہمراہ زنجیر و دولابہ تابہ خافقین آورده می شود و از انجاہ خاک تور کہ گزاشتہ می شود و

از آں جا بہ بغداد می آید.....“

کسی دوسرے بیان سے اس بیان کی تصدیق نہیں ہوئی۔ علاوہ بریں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ درگاہ کے مجتہدین شیخ سے اس قدر نادانگہ ہوں گے کہ علی اصغر کے دعوے کو صحیح سمجھ لیں۔ اس زمانہ میں شیخ سے طہران کے ہزار ہا اشخاص واقف تھے اور ان کے گرد و پیش سیکڑوں معتقدین کا مجمع رہا کرتا تھا۔ مجتہدین بھی ان کی عزت کرتے تھے ایسی حالت میں یہ بیان بہت بھونڈا اور بے تکا معلوم ہوتا ہے اور شیخ بھی اپنے اس مفصل خط میں جو مجتہد اعظم سامرہ کو انہوں نے لکھا اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں کرتے حالانکہ درگاہ میں اپنی گرفتاری کا سارا حال اُس میں لکھتے ہیں۔

البتہ یہ بیان بالکل مصدقہ ہے کہ حالت بیماری میں جب شیخ نشست و برخاست کے قابل بھی نہ تھے اُن کو گرفتار کر کے ایک یابو کی کمر سے باندھ کر بٹھایا گیا اور اس طرح پچاس سواروں کی حفاظت میں وہ خانقین پہنچائے گئے۔ محمد حسن امین الضرب کو جب شیخ کی گرفتاری کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے فوراً کچھ زادراہ اور لباس اُن کے لیے بھیجا اور سواروں کے افسر کے لیے بھی کچھ روپیہ بھیجا تاکہ وہ راستہ میں شیخ کو کچھ تکلیف نہ پہنچائیں۔ علاوہ بریں امین الضرب نے حسام الملک حاکم کرمان اور وفاحین وکیل الدولہ کو خط بھی لکھے اور لکھا کہ شیخ کے آرام و راحت کا لحاظ رکھیں۔

اس طرح شیخ ایران سے آخری دفعہ رخصت ہوئے۔ وہ رخصت تو ہو گئے لیکن شاہ کی مطلقیت کو ایسا گھن لگا کہ وہ چند روز بھی

چین سے حکومت نہ کر سکا۔ نہ صرف اس کی کج کلاہی ختم ہوگئی بلکہ جو قبر اس نے اپنے مخالفین کے لیے کھدوائی تھی اُس میں بقتلے الہی خود ہی دفن ہو گیا۔

گوکہ اس مقام پر داستان کا تسلسل منقطع ہوتا ہے لیکن اگر شیخ کی روانگی کے بعد ناصر الدین شاہ کے خاتمہ تک جو واقعات ایران میں پیش آئے ان کی مکمل داستان بھی اسی جگہ لکھدی جائے تو ایران کا ذکر ان صفحات میں آئندہ کرنے کی ضرورت نہ ہوگی اور ایران کے متعلق شیخ کے مساعی کی رویداد بھی یک جا ہو جائے گی۔ نیز ایران کی انقلابی تحریک سے جس حد تک شیخ کا تعلق رہا وہ بھی بخوبی واضح ہو جائے گا۔

شیخ ایران میں پہلی دفعہ اور دوسری دفعہ بھی شاہ کے بلائے ہوئے گئے تھے مگر وہ ان لوگوں میں نہ تھے جو اپنی ذاتی اغراض کی وجہ سے اپنی زندگی کے اصولوں کو ترک کر دیتے۔ انھوں نے شاہ کی دعوت کو اس لیے قبول نہیں کیا تھا کہ وہ اپنی ذات کے لیے کوئی شاندار مستقبل پیش نظر رکھتے تھے بلکہ جیسا کہ ان کی زندگی کے ہر واقعہ سے مترشح ہوتا ہے وہ ایران کی اصلاح حال کا خیال دل میں لے کر گئے تھے۔ اور شاید یہ سمجھتے تھے کہ ناصر الدین شاہ کے التفات سے فائدہ اٹھا کر اس کو نیک مشورہ دے سکیں گے۔ لیکن دربار کی سازشوں نے ان کو شکست دی اور امین السلطنت کی چالوں کا وہ مقابلہ نہ کر سکے۔ شیخ اس میدان کے مرد نہ تھے۔ وہ صرف ایک ہی جذبہ دل میں لیے پھرتے تھے اور اسی جذبہ صادق سے ہر جگہ کام لیتے تھے۔ عوام اور خواص دونوں اُن

کے لیے یکساں تھے۔ دولت اور ثروت اور عوام کے اعتراضوں سے وہ کبھی موثر اور مرعوب نہ ہوتے تھے۔ وہ دنیا کے تغیرات اور انقلابات میں ایک مضبوط چٹان کی طرح قائم تھے ہزاروں طوفان آئے اور اس چٹان سے ٹکرا ٹکرا کر گزر گئے ایران میں وہ شاہی مہمان بن کر آئے مگر درحقیقت خدمت وہ رعایا کی کرنا چاہتے تھے۔ شیخ کی بڑی اور عجیب کامیابی اس ملک میں یہ تھی کہ انھوں نے اکثر قدامت پسند مجتہدین کا جو ناصر الدین شاہ کی پشت و پناہ تھے رفتہ رفتہ اس کی مطلقیت کا دشمن بنا دیا اور وہی مجتہدین جن کی قدامت پسندی نے قومی ترقی اور اصلاح کے تمام دروازوں میں تالے ڈال دیے تھے اور جو اصلاح ملت کی ہر تجویز پر بدعت ہونے کا فتویٰ جاری کرتے تھے ایک دن ایسا آیا کہ اپنے وطن کی آزادی و عزت کے داعی بن کر میدانِ عمل میں اُتر آئے آج شاید ایران میں آزاد اسلامی سلطنت کا نام و نشان بھی نہ ہوتا اگر شیخ وہاں نہ گئے ہوتے اور شیخ کے اثرات نے وہاں قوم پرست مجتہدین پیدا نہ کر دیے ہوتے۔ بلاشبہ ایرانی عہدِ جدید کے ان معجزات میں بڑا حصہ جمال الدین افغانی کا تھا۔

شیخ کو ایران سے خارج کرنے کے چند ہی روز بعد شاہ نے اپنی شہنشاہیت پر ایک آخری اور کاری ضرب لگائی۔ ، راجِ شہنشاہ میں اس نے ایک یورپین کمپنی کو تمام ایران میں تباکو کی کاشت کا اجازت دے دیا اس کمپنی نے دس کروڑ روپے کے سرمایہ سے اپنا کام شروع کیا لیکن ملک اور قوم کی آزادی جب اس طرح فروخت کی جا رہی تھی تو بہت سے سونے والے جاگ اٹھے تھے۔ سب سے پہلے شاہزادہ

ملکم خاں نے جو اس وقت لندن میں ایرانی سفیر تھے اس اجارہ کے خلاف سختی کے ساتھ احتجاج کیا چنانچہ اسی بنا پر وہ منصبِ سفارت سے معزول کر دیے گئے۔ لیکن انھوں نے اب سرکاری ملازمت سے آزاد ہو کر پوری قوت سے اخباروں میں آواز بلند کرنی شروع اور لندن سے اپنا ایک اخبار قانون کے نام سے جاری کر دیا جس میں اکثر شیخ کے مضامین بھی شائع ہوا کرتے تھے۔ افسوس ہو کہ اس کا کوئی پرچہ ہم کو میسر نہ آسکا۔ قانون کی آواز انقلابِ ایران کے نقارہ کی پہلی آواز تھی۔ باوجودیکہ اس کا داخلہ ایران میں بند کر دیا گیا تھا لیکن اس کے پرچے ہر طرح ایران میں پہنچتے تھے اور شوق کے ساتھ پڑھے جاتے تھے۔

الغرض تمباکو کے اجارہ کا مسئلہ گویا ایک کنبی تھا جس نے شاہ کے خلاف رنج اور غصہ کے دروازے کھول دیئے۔ شیخ بھی غافل نہ تھے انھوں نے اس کنبی کو پوری قوت کے ساتھ استعمال کیا۔ وہ بصرہ میں حاجی علی اکبر شیرازی تاجر کے مہمان تھے حاجی علی اکبر خود ایران سے نکالے ہوئے اکابر میں سے ایک تھے۔ وہیں بیٹھ کر شیخ نے ایران کے حالات کے متعلق اپنا وہ مشہور مکتوب مجتہدِ عظمٰی حاجی مرزا حسن شیرازی کے نام (جو سامرہ میں مقیم تھے) لکھا اور حاجی علی اکبر کی وساطت سے روانہ کیا جو بعد کو لندن سے ”ضیاء الخافقین“ میں شائع کیا گیا اور تمام علما اور مجتہدین کی خدمت میں بھیجا گیا۔ یہ خط شعلہ بن کر بارود خانہ میں گرنا اور ایران کے ہر گوشہ میں آگ لگ گئی۔

جب شیخ بصرہ میں بیٹھے ہوئے یہ خط لکھ رہے تھے تو ترکی سے سلطان عبدالحمید خاں کی دعوت والی بصرہ عزت پاشا کے ذریعہ سے آئی لیکن اُس وقت شیخ ایران کے معاملات میں بہت زیادہ مشغول تھے اور لندن جانے کا ارادہ کر چکے تھے اس لیے ترکی نہ جاسکے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ایران میں انقلابی قوتیں عمل کے لیے بالکل تیار ہیں اور آزادی ایران کے بہت سے ہوا خواہ پرنس ملکہ خاں کی وجہ سے لندن میں جمع ہیں اس لیے شیخ نے اپنا لندن جانا زیادہ ضروری سمجھا۔ لندن سے جب اُن کا وہ مشہور خط شائع ہوا تو ناصر الدین شاہ کی مطلقیت پر گویا ایک بجلی گری۔ واقعہ یہ ہے کہ شیخ نے بھی اس خط میں اپنے مزاج کی حدت اور قلم کی قوت کو بے تکان صرف کیا تھا۔ اس کے چند اقتباسات کا درج کر دینا ضروری ہے۔

”میں حق کہتا ہوں یہ خط شریعتِ اسلامی کی خاطر لکھتا ہوں
جہاں کہیں وہ شریعت جاری اور قائم ہو۔ یہ ایک اپیل ہے جو میں
تمام اُن حق پسندوں کی روجوں سے کرتا ہوں جو شریعت پر ایمان
رکھتے ہیں اور اس کے نافذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یعنی میں
اپیل کرتا ہوں علمائے اسلام سے اور یہ اپیل میں تمام علمائے اسلام
سے کرتا ہوں حالانکہ اس وقت میرے مخاطب ان میں سے ایک
ہی ہیں.....“

خدا نے آپ کو اس اعلیٰ نیابت پر فائز کیا ہے کہ آپ حقیقتِ عظمہ کے نمائندے ہوں اور خدا نے ملتِ بیضی سے آپ کو منتخب کیا ہے آپ انسانوں کی باگِ ہاتھ میں لے کر شریعتِ اسلامی کی

حفاظت و نگرانی کریں ۔.....

اہل ایران اب ظلم و ستم کے اندر اپنے ملک بیت الدین کی حالت کو دیکھ کر بتیاب ہو گئے ہیں جو اغیار اور کفار کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا ہے اور جس پر اُن اغیار کا قبضہ قائم ہو گیا ہے۔ مگر کسی رہنما کے نہ ہونے کی وجہ سے اہل ایران پریشان ہیں، منقسم ہیں، اور معطل ہیں، وہ حیران ہوتے ہیں، اُن کا ایمان متزلزل ہوتا ہے جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان مجتہدوں کی طرف سے کوئی آواز بلند نہیں ہوتی جن کو وہ اپنا رہنما اور اسلامی مفاد کے معاملات میں اپنا رہبر سمجھتے ہیں اور سمجھنے کا حق رکھتے ہیں۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں اور یہ سچ بھی ہے کہ تیرا ایک لفظ ان کو متحد کر دے گا اور تیرا ہی حکم فیصلہ کن ہو گا۔ تیرا ہی ایک حرف با اثر ہو گا اور کسی کی مجال نہ ہو گی کہ تیرے حکم پر حرف زنی کر سکے اور اگر تو چاہے گا تو متفرق عناصر کو اپنے ایک لفظ سے متحد کر دے گا اور اس طرح خدا کے دشمنوں کے دل میں خوف پیدا کر دے گا اور کفار کے ظلم سے اہل ایران کو بچائے گا۔ تیرا ہی ایک لفظ اس مصیبت اور ابتلا کا خاتمہ کر دے گا جس میں اہل ایران گھرے ہوئے ہیں۔ اور ان کو زندگیوں کی سختی سے نجات دے کر راحت و آرام عطا کرے گا۔ پس دین کی حفاظت ہو جائے گی اور اس دین کے حلقہ بگوش اس کو سنبھال لیں گے اور اسلام کا مرتبہ بلند ہو جائے گا۔..... لے امام اعظم! بے شبہ بادشاہ کی قوت ارادی کمزور ہے اس کی سیرت خراب ہے اس کا دل گندہ ہے۔ وہ ملک پر حکومت کرنے اور اہل ملک کے معاملات کو سدھار

کے قابل نہیں اور اس نے حکومت کی باگیں ایک بے دین ظالم اور فاضل کے سپرد کر دی ہیں (امین السلطنت جو رسول پر علانیہ استہزاء کرتا ہو اور شریعت حقہ کی پرواہ نہیں کرتا جو امرائے شریعت کو خیال میں نہیں لاتا اور علماء پر لعنت بھیجتا ہے اہل زہد و تقویٰ کو ذلیل کرتا ہے اور سادات کی تحقیر کرتا ہے علاوہ بریں کفار کے ملک سے واپس آنے کے بعد وہ بالکل قابو سے باہر ہو گیا ہے علانیہ شراب پیتا ہے اور کفار کی صحبتوں میں وقت گزارتا ہے۔ یہ ہے اس کا چلن مگر اس کے علاوہ اس نے ایرانی زمین کا بڑا حصہ مع اس کے منافع کے کفار کے ہاتھ فروخت کر ڈالا ہے۔ (اشارہ ہے معدنیات کے ٹھیکوں کی طرف) یہی نہیں بلکہ سرکاری کاروان سرائیں - باغات - کھیت سب ہی کچھ اُس نے فروخت کر ڈالے ہیں - نیز دریائے کارون بہان خانے - عمارتیں - سرائیں میدان یہ بھی سب کفار کو دے ڈالے ہیں - یہی نہیں بلکہ تمام ایران میں تمباکو کی کاشت مع زمین و عمارت کے ، انگور جن سے شراب بنائی جاتی ہے مع کارخانوں اور سامان تجارت کے ، صابن - موم - شکمہ کے تمام کارخانے ، غرض کہ سب کچھ مع متعلقات اس نے کفار کی نذر کر دیا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ بینک - آپ کیونکر سمجھیں گے کہ بینک کیا چیز ہے اُس کے معنی صرف یہ ہیں کہ دشمنان اسلام کو گویا ساری سلطنت دے ڈالی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب دوغاباز لوگوں کو تسکین دینے کے لیے کہتا ہے کہ یہ انتظامات محض عارضی ہیں - یعنی ایک مقررہ زمانے کے لیے جس کی میعاد سو برس سے

زیادہ نہیں!! یا اللہ یہ کیا دلیل ہے جس کی کمزوری خود اس دغا باز پر
میاں ہوگی۔

اب جو کچھ رہ گیا تھا اس نے روس کے سامنے پیش کر دیا تاکہ
روس خاموش رہے۔ مندب۔ رشت دریائے خزرستان شرک انزلی
و خراسان معہ تمام مکانات سراوں اور متعلقہ کھیتوں کے نگرہوں
نے ناک بھوں چڑھائی اس لیے کہ وہ توکل خراسان آذر بائجان
اور مازندران کی فکر میں ہے.....

یہ ہے نتیجہ اُس پائل کے طرزِ عمل کا..... اور تُو اے
محب اسلام! کیا تو اس قوم کی مدد کے لیے نہ اُٹھے گا اور اُن کو
متحد کر دے گا اور شریعتِ مطہرہ کے زور سے اس گنہگار کے
پاتھوں سے اس کو نجات نہ دلوائے گا؟ بلاشبہ بہت جلد یہ اسلامی
سلطنت اغیار کے زیرِ اقتدار ہوگی جو وہاں جس طرح چاہیں گے حکومت
کریں گے اگر تو نے یہ موقعہ جانے دیا۔ اے امام! یہ واقعہ تیری
زندگی میں پیش آگیا تو لاریب تو اپنا نام تاریخ کے صفحات پر روشن
نہ چھوڑے گا!..... بلاشبہ امام وقت نے سنا ہوگا ان کفر
کے سرغنوں نے اس عالم و فاضل اور زاہد و عابد حاجی ملا فیض اللہ
در بندی کے ساتھ کیا کیا اور آپ عن قریب سنیں گے کہ ان بے رحم
بد معاشوں نے نیک اور سچے مجتہد حاجی سید علی اکبر شیرازی کے
ساتھ کیا کیا۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ان لوگوں نے
اپنے ملک اور مذہب کے محافظوں کو کس طرح قتل کیا ہے۔ مارا ہے
پیٹا ہے لوہے سے داغا ہے، اُن ہی مظلوموں میں ایک صالح نوجوان

مرزا احمد رضا کرمانی ہر جس کو اس کافر امین السلطنت نے زد و کوب کیا اور اسی طرح حاجی سید محلاتی عالم و فاضل مرزا فراخی - مرزا محمد علی خاں اور اعتماد السلطنہ کو بھی ایذا پہنچائی گئی.....“

اس کے بعد شیخ نے ان مظالم کا ذکر کیا، جو ان پر کیے گئے۔ ان کے ایران سے نکالے جانے کا واقعہ خود ان کے قلم سے یوں ہر کہ۔

”اب میری داستان جو کچھ اس ناشکر گزار نے میرے ساتھ کیا

وہ بھی سن لیجئے۔ اس مردود نے طہران کی برف سے ڈھکی ہوئی سڑکوں پر ذلت کے ساتھ میرے زمین پر گھسیٹے جانے کا حکم دیا جب کہ میں خانقاہ عبدالعظیم میں پناہ گزیں تھا اور بہت بیمار تھا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ! اس کے بعد اُس کے ذلیل غلاموں نے مجھے باوجود میری علالت کے بار بردار ٹٹو پر سوار کر کے زنجیروں سے باندھ دیا اور یہ سب اس وقت کیا گیا جب کہ سردی کا موسم تھا برف کے طوفان آرہے تھے اور نہایت سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ اس طرح مجھے سواروں کی نگرانی میں خافقین بھیج دیا گیا۔ جہاں پہلے ہی ترکی کے والی سے طے کر لیا گیا تھا کہ مجھے بصرہ پہنچا دیا جائے۔ یہ اس لیے کیا گیا کہ وہ خوب جانتے تھے کہ اگر میں آزاد چھوڑ دیا گیا تو سیدھا تیرے پاس آؤں گا۔ اے امامِ وقت ! اور تمہکوا اس کے مظالم سناؤں گا اور مملکتِ ایران کے حالات بتاؤں گا اور تجھ سے اے حجۃ الاسلام ! مدد چاہوں گا.....“

یہی خط بعد کو ”ضیاء الخافقین“ (لندن) میں شایع ہوا اور اسی

کی نقول بہت سے علما اور مجتہدین کو بھی گتیں - شیخ کی یہ تحریر ایک تاریخی دستاویز ہو اس لیے کہ اسی تحریر کی بنا پر مجتہدین نے تمباکو کے ٹھیکہ کے خلاف وہ فتویٰ خلیع کیا جس نے سارے ایران میں آگ لگا دی - بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر اس وقت شیخ نے یہ خط نہ لکھا ہوتا اور مجتہدین کا فتویٰ نافذ نہ ہوا ہوتا تو آج ایران خدا جلنے غلامی کی کس بدترین حالت میں گرفتار ہوتا - بلاشبہ وہ شیخ ہی کا ہاتھ تھا جس نے ایران کے گلے پر چلتی ہوئی چھری کو عین وقت پر روکا اور یہ واقعہ تاریخ کے صفحات پر شیخ کی ایک بہت بڑی یادگار ہے - مجتہدین نے جو فتویٰ شایع کیا وہ صرف ایک سطر کا فتویٰ تھا - "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ - آج سے تمباکو کا استعمال کسی صورت میں ہو امام وقت سے بغاوت کرنے کا مرادف ہے"

یہ ایک سطر تھی جس نے ایران اور شاہ ایران کی قسمت کا فیصلہ کر دیا - بقول براؤن کے ایک دن صبح کو جب شاہ نے حسب معمول اپنے محل میں قلیان طلب کیا تو خدام نے عرض کیا کہ محل میں تمباکو کا ایک پتہ بھی موجود نہیں - فتویٰ کے مطابق سب ضایع کر دیا گیا! یہ واقعہ ایک عظیم الشان تاریخی حیثیت رکھتا ہے کہ گزشتہ ڈیڑھ صدی میں پہلی دفعہ علمائے اسلام نے عامۃ الناس کی آواز کے ساتھ متحد ہو کر ایک پوری قوم کے مستقبل کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پہلی دفعہ مذہبی جماعت اپنے حجروں سے نکل کر رلے عامہ کی رہنما بنی - ایران کے صوبوں میں ہر طرف بغاوتیں اور بلوے شروع ہو گئے - خصوصاً آذربائیجان تبریز قزوین اور طہران میں

سخت بد امنی پیدا ہو گئی اور بالآخر شاہ کو تمباکو کا ٹھیکہ منسوخ کرنا پڑا۔ لیکن قوم پرستوں کی گیلی بارود اب خشک ہو چکی تھی اور حالات حکومت کے قابو سے باہر ہو چکے تھے۔ رائے عامہ کے مقابلہ میں مطلقیت کی یہ پہلی شکست تھی اور آخری شکست کی تمہید۔

اب شیخ کو بڑی فکر یہ تھی کہ ایران کی قومی تحریک آئندہ روکی نہ جاسکے اور کسی طرح اپنی آخری منزل تک پہنچے۔ اسی لیے سلطان ٹرکی کی دعوت رد کر کے وہ بصرہ سے میدھ لندن آئے جہاں اس وقت ملکم خاں مصروف کار تھے۔ لندن آکر پہلے شیخ نے ملکم خاں کے اخبار ”قانون“ میں مضامین لکھنے شروع کیے ان کی آوازاں ڈاک کے لفافوں میں بند ہو کر لندن سے طہران آنے لگی اور اس طرح اس نے شاہ اور اس کے حاشیہ نشینوں کی نیندیں حرام کر دیں۔

یوں کہنے کو تو شیخ اپنی صحت کی خاطر جس کو ناصر الدین کے مظالم نے بہت صدمہ پہنچا یا تھا لندن آئے تھے لیکن درحقیقت ان کے پیش نظر اپنا علاج و معالجہ نہ تھا بلکہ ملتِ ایرانی کا معالجہ تھا۔ رجب ۱۳۰۹ ہجری میں انھوں نے عربی اور انگریزی زبان میں ایک اخبار ضیاء الخافقین کے نام سے نکالنا شروع کیا تو اس کی ہر اشاعت میں کم از کم ایک مضمون شیخ خود لکھا کرتے تھے۔ چند ہی روز بعد اس پرچہ کی اشاعت کو روکنے کی کوشش شروع ہو گئی۔ اول تو سفیر ایران متعینہ لندن نے شیخ سے ملاقات کی اور ان کو شاہ کی طرف پھر مایل کرنے اور ان کے جوش کو ٹھنڈا کرنے کی بہت سی احمقانہ کوششیں کیں اور ساتھ ہی ایک معتدبہ رقم بھی ان کی خدمت میں

صفوة اولي الهمم وقودة ارباب الشيم السقيم
الحاج احمد خان لازل مصونا بعناية الرحمن

سنة
انني قد صلت الان ببلدة انت ساكنها ومنك بجهتها وبك
فكبت اليك هذه الوريقة زعمتني انك بتقديك بين اطوار الزمان
واختيارك اجناس الان في ترغيب ان تلاقي كل من ذكك
الدير وحللك العصر ولو كان في كرن حقير متربعاً على حصيد
فان كان الامر كما رأيت فينا لخطي البؤس والا فلت اول
من غرة القمر - وانني جملت بحدت اللقاة في هذه البلدة
نزلت في خان فرب عفن لا يكتنه الله الصديق والدوبش
يسمى البخاروان سوامي كرهوي عرض) والسلام

جمال الدين الحسيني الافندي

Facsimile of autograph letter from
Sayyid Jamāl al-Dīn al-Afghānī,
sent to me by Sayyid Taghi-Jān,
September 19, 1921, taken from the
original.

پیش کی۔ لیکن شیخ نے رقم لینے سے انکار کیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ اب یہ قضیہ اس آسانی سے طے ہونے والا نہیں ہے۔ ایرانی سفیر جب ہر طرح مجبور ہو گیا تو اس نے برطانوی حکومت کا دامن پکڑا۔ چنانچہ اُس پریس پر جہاں ضیاء الخافقین چھاپا جاتا تھا زور ڈالا گیا کہ وہ اس پیچے کو نہ چھاپے۔ چنانچہ یہ تدبیر کامیاب ہوئی اور اس طرح "ضیاء الخافقین" کی اشاعت کا سلسلہ بند ہو گیا۔ لیکن اپنی مختصر عمر میں "عروۃ الوثقی" کی طرح "ضیاء الخافقین" کا اثر بھی ایران کے حالات پر انقلابی اور خونی نقش و نگار بنا گیا۔ شیخ اس پرچہ میں جو مضامین ایران کے متعلق لکھتے تھے اُن سے گویا شعلے نکلا کرتے تھے۔ اسی پرچہ میں فروری ۱۹۰۷ء میں علما کے نام شیخ کا ایک کھلا خط شائع ہوا جس کے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں :-

"جب سے یہ شاہ، یہ سانپ، یہ گنہگار، سلطنت پر قابض ہوا اُس نے آہستہ آہستہ علما کے حقوق کو غصب کرنا اُن کے مرتبہ کو گھٹانا اور اُن کے اثرات کو کم کرنا شروع کر دیا تاکہ وہ بالکل خود مختارانہ حکومت اور اپنے ظلم و تعدی کے دائرہ کو وسیع کر سکے۔ پس اُس نے بہت سے لوگوں کو ذلیل کر کے ملک سے نکال دیا اور تحقیر کے ساتھ لوگوں کو شرع شریف کا تحفظ کرنے سے روک دیا اور بہت سوں کو اپنے گھروں سے جبراً دارالظلم طہران میں لایا اور مجبور کیا کہ وہ ذلت کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ اُس نے اپنے لیے میدان صاف کر لیا اور اہل ملک کو کچل ڈالا۔ ملک کو تباہ کر دیا۔ مسلسل شرمناک گناہ کرتا رہا۔ علانیہ ہر قسم کی سیاہ کاریاں کرنے لگا

اور اب وہ جو کچھ روپیہ غریبوں کے خون سے اور بیواؤں اور یتیموں کے آنسوؤں سے زبردستی حاصل کرتا ہے وہ سب اپنے عیش اور اپنے حیوانی مشاغل میں صرف کرتا ہے۔ (اے دائے اسلام!) پھر جب اس کی نالایقیات مختلف صورتوں میں بڑھیں تو اس نے ایک بیوقوف بد معاش کو اپنا وزیر بنانے کے لیے منتخب کیا جو کوئی مذہب نہیں رکھتا ہے کہ وہ اس کو بد اعمالیوں سے باز رکھے۔ یہ گنہگار جوں ہی با اختیار ہوا اُس نے مذہب کو تباہ کرنا اور مسلمانوں سے جنگ کرنی شروع کر دی۔ فرنگیوں نے سمجھا کہ اب ایران پر بغیر لڑائی قبضہ کرنے کا وقت آگیا ہے اور یہ خیال کر کے کہ علما کی قوت جو مرکز اسلام کو بچا یا کرتی تھی کمزور ہو گئی ہے اور اُن کا اثر جاتا رہا ہے وہ سب منہ کھول کر دوڑے کہ اس سلطنت کے ٹکڑوں کو نکل جائیں۔ اس وقت حق باطل سے بگڑ کر اٹھا اور اس نے باطل کو کچل ڈالا اور بڑے بڑے ضدی ظالموں کو ذلیل کر دیا۔ میں سچ کہتا ہوں اے قائدین اسلام! تم نے اپنی جرات سے اسلام کا بول بالا کر دیا اس کی قوت کو بڑھا دیا اور لوگوں کے دلوں کو خوف دہرا س سے بھر دیا۔ تمام غیر ملکوں کو معلوم ہو گیا کہ تمہاری قوت کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ تمہاری طاقت دبائی نہیں جاسکتی۔ اور تمہارے حکم کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ تم دنیا کا نمک ہو اور تم ہی اہل ملک پر تسلط رکھتے ہو۔ مگر خطرہ بہت سخت ہے اور فوری معاملات بہت نازک ہیں۔ شیطان اب متحد ہو گئے ہیں تاکہ اس چوٹ کا علاج کریں جو انھوں نے کھائی ہے اور اپنے مقاصد حاصل کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور انھوں نے

ارادہ کر لیا ہے کہ اس گہنگار کو کسی طرح دھوکہ دے کر تمام علما کو ملک سے نکلوا دیں۔ پس انھوں نے اس کو بتایا کہ صرف روسی قوم کے افسروں کی طاقت سے اس کے احکام کی تعمیل کرائی جاسکتی ہے اور یہ کہ موجودہ افسران (جو ایرانی اور مسلمان ہیں) کوئی کام علما کے خلاف انجام نہ دیں گے اور نہ علما کو کوئی نقصان پہنچانے پر آمادہ ہوں گے۔ اس لیے حکومت کے اثر کو قائم کرنے کے لیے ان افسروں کی جگہ یورپین افسر رکھے جائیں اور اس بیوقوف غاصب کو انھوں نے اس تدبیر کا ایک نمونہ یہ دکھایا ہے کہ شاہی محافظ دستہ اور کاسک بریگیڈ کے لیے یورپین افسران بلائے جائیں اور شاہ اپنے پاگل پن سے اس تدبیر کو پسند کرتا ہے اور اس پر بہت خوش ہے۔

قسم بخدا! جنوں اور بدیتی دونوں نے آپس میں اتحاد کر لیا ہے اور حماقت و حرص مذہب کو تباہ کرنے، شریعت حقہ میں تحریف کرنے اور وطن اسلامی کو اغیاء کے سپرد کرنے کے لیے متحد ہو گئے ہیں۔

اے رہنمایان ملت! اگر تم اس بد بخت فرعون کو تخت پر بیٹھا رہنے دو گے اور اس کو اس کے اعلیٰ منصب سے علیحدہ کرنے میں عجلت نہ کرو گے تو پھر سارا معاملہ ختم ہے اور پھر اس کا علاج بہت مشکل ہوگا.....“

مندرجہ بالا تحریر میں حسب ذیل علما کو نام بنام مخاطب کیا گیا تھا۔ مجتہد اعظم کربلا حاجی مرزا حسن شیرازی، حاجی حبیب اللہ درشت، حاجی ملا ابو القاسم کربلائی۔ آقا حاجی مرزا جواد (تبریزی) حاجی سید

علی اکبر شیرازیؑ، حاجی شیخ ہادی نجم آبادیؑ، مرزا حسن اشتبان، صدرالعلماء حاجی آقا حسن (عراق)، حاجی شیخ محمد تقی (اصفہان)، حاجی ملا محمد تقی۔

پھر ایک مضمون میں ایران کے حالات کا نقشہ کھینچتے ہیں:-

”ایرانیوں کی آبادی کا پانچواں حصہ ترکی اور روسی ممالک میں بھاگ گیا ہے جہاں تم اُن کو آوارہ اور بے وطن دیکھ سکتے ہو۔ سڑکوں اور بازاروں میں مارے پھرتے ہیں کہیں بہشتی ہیں، کہیں بھنگی ہیں، کہیں خاکروب کہیں قلی، پھٹے ہوئے کپڑوں میں اور باوجود افلاس اور عسرت کے وہ خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ جان سلامت لے آئے۔ گورنر اور اُن کے حاشیہ نشین اب وہ رقبے وصول کرتے ہیں جو انھوں نے رشوت میں دربار کو دی تھیں اور جن کو جمع کر کے بادشاہ کے خزانہ میں داخل کرنے کا انھوں نے اقرار کیا تھا۔ اپنے تمام زمانہ حکومت میں وہ ہر قسم کی پاجیانہ و ذلیل حرکتیں اور خوفناک مظالم کرتے ہیں تاکہ اُن کے مقاصد حاصل ہوں۔ عورتوں کے بال باندھ کر ٹٹکا یا جاتا ہے۔ مردوں کو خونخوار کتوں کے ساتھ تھیلوں میں بند کیا جاتا ہے اُن کے کان لکڑی کے تختوں میں کیلوں سے ٹھونکے جاتے ہیں اُن کی ناک کے اندر رسیاں ڈالی جاتی ہیں اور پھر وہ اس حال میں شہر کی سڑکوں پر اور بازاروں میں گشت کر لئے جاتے ہیں۔ اُن کے لیے سب سے نرم سزا لوہے سے داغنا اور کوڑوں سے مارنا ہے۔“

”ضیاء الحاقین“ ہی میں شیخ نے ایک دفعہ شاہ ایران کو سخت سے اُتارنے اور ذلیل کرنے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ۔



مرزا محمد رضا کرمانی

جس نے ناصرالدین شاہ کو بتاریخ یکم مئی ۱۸۹۶ء گولی کا نشانہ بنایا
اس کو بتاریخ ۱۲ اگست ۱۸۹۶ء پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

”اُس کا معزول کر دینا اتنا بھی مشکل نہیں بنتا کہ پانوں سے جوتے آزار“ شیخ اپنی کوششوں کے نتائج کو امید افزا پاتے تھے اور ابھی طرح دیکھ رہے تھے کہ علما کی مخالفت اور رعایا کی شورش نے ناصر الدین شاہ کے تخت کو ہلا دیا ہو۔ وہ اپنی تحریک کے جن انتہائی نتائج کا انتظار کر رہے تھے وہ نتائج ان کی رحلت کے چند سال بعد انقلاب ایران کی صورت میں پیدا ہوئے لیکن اس سے پہلے ہی ناصر الدین شاہ کو حکم خدا اپنے اعمال کی پوری قیمت ادا کرنی پڑی۔ ۶ مئی ۱۲۹۷ء کو جب شیخ قسطنطنیہ میں مقیم تھے شاہ عبدالعظیم کے دروازہ پر جہاں شیخ ٹٹو کی کمر سے باندھے گئے اور سڑک پر گھسیٹے گئے تھے۔ ٹھیک وہیں ناصر الدین شاہ کی عمر کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلک گیا۔ اگرچہ کہ ناصر الدین شاہ کا قتل اور اُس کے بعد کے واقعات اس داستان کے تسلسل سے باہر ہیں لیکن ایرانی واقعات کے تسلسل کو جاری رکھنے کے لیے بہتر یہی ہو کہ ایران میں اصلاح ملت اور اہدام مطلقیت کے متعلق شیخ کی کوششوں کو یکجا بیان کر دیا جائے۔

۱۲۹۶ء میں قسطنطنیہ میں بیٹھے ہوئے شیخ اپنی زندگی کی آخری منزل پر آپکے تھے۔ لیکن وہ ایران کے حالات کا مطالعہ کرتے رہتے تھے اور اپنے ایرانی معتقدین سے ان کے رسل و رسائل کا سلسلہ جاری تھا۔ نیز وہ ایران کے معاملات کے متعلق مجتہدین سے بھی خط و کتابت کرتے رہتے تھے۔ یکم مئی ۱۲۹۷ء کو ناصر الدین شاہ اپنی سالگرہ کی تقریب میں درگاہ شاہ عبدالعظیم پر حاضر ہوئے اور وہیں درگاہ کے دروازہ پر قتل کر دیئے گئے۔ ان کا قاتل مرزا رضا خاں کرمانی شیخ کے معتقدین میں سے تھا۔ شاید اسی بنا پر یہ خیال کیا گیا کہ اس واقعہ کے

محرک در اصل شیخ ہی تھے۔ حالانکہ خود رضا خاں ایران میں بہت سخت مظالم برداشت کر چکا تھا اور کچھ تعجب نہیں کہ یہ واقعہ خود اسی کے انتقامی جذبات کا تقاضہ ہو۔ یہ سچ ہو کہ وہ قسطنطنیہ میں کچھ عرصہ شیخ کے پاس قیام کر کے طہران واپس آیا تھا لیکن بین ثبوت اس امر کا موجود نہیں کہ شیخ نے کرمانی کو اس کام کے کرنے کا اشارہ کیا ہو۔ رضا خاں نے جو بیان مرزا ابوتراب خاں ناظم الدولہ کے رؤ برؤ لکھوایا تھا وہ اس واقعہ کی بہت سی تفصیلات پر حاوی ہو گویہ ضروری نہیں کہ وہ تمام تفصیلات صحیح ہوں۔ پروفیسر براون نے اس طویل بیان کے کچھ ضروری اقتباسات "انقلاب ایران" میں درج کئے ہیں اور اُن میں سے بعض اس جگہ نقل کئے جاتے ہیں۔

"سوال :- جب تم قسطنطنیہ میں تھے تو یہ تین شخص مرزا آقا خاں،

مرزا حسن خاں اور شیخ ابوالقاسم کس جرم میں گرفتار کئے گئے تھے؟

جواب :- مشہور ہو کہ ایرانی سفیر علاء الملک ان تینوں سے بغض رکھتا تھا چونکہ یہ لوگ اُس کی پروا نہ کرتے تھے ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ یہ لوگ خبریں جمع کرتے ہیں۔ اور ایران میں فساد کراتے ہیں یہ تو ان دونوں کا تصور بتایا گیا مگر حاجی مرزا حسن کو اس وجہ سے پکڑا گیا کہ اُن پر یہ الزام تھا کہ انھوں نے چند خطوط نجف اور کاظمین کے علما کو لکھے تھے۔ کہا جاتا ہو کہ یہ خطوط سید جمال الدین کے اشارہ اور اُن کی ہدایت کے مطابق لکھے گئے تھے اور ان خطوط میں مجتہدین کو ترغیب دی گئی تھی کہ عثمانی خلافت کی تائید کریں۔ یہ خطوط ایرانی وزیر اعظم کے ہاتھ میں پہنچ گئے"

سوال :- ہمیں یہ اطلاع ملی ہو کہ قسطنطنیہ سے روانگی کے وقت

تمہارا ہم سفر کوئی اور شخص بھی تھا علاوہ شیخ ابوالقاسم کے اور یہ کہ سید جمال الدین نے تم کو کچھ ہدایات کی تھیں۔ واقعات کیا ہیں؟
جواب :- سوائے ابوالقاسم کے میرے ساتھ کوئی نہ تھا۔

سوال :- مگر تم اُن ہدایات کو نہیں بتاتے جو قسطنطنیہ سے لائے تھے۔
جواب :- مجھے کوئی خاص ہدایات نہیں ملی تھیں۔ مگر سید جمال الدین کے خیالات سب کو معلوم ہیں اور اُن کا طریقہ گفتگو بھی معلوم ہے۔ وہ اپنی گفتگو میں معتدل نہیں ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ شاہ اور اُس کے وزراء ظالم ہیں۔ اُن کی گفتگو کا یہی انداز ہے۔

سوال ہم اُن لوگوں کے نام معلوم کرنا چاہتے ہیں جو تمہارے ہم خیال اور ہم رائے ہیں تاکہ اگر آئندہ اصلاحات کے سلسلہ میں ہمیں ضرورت ہو تو اُن سے مشورہ لے سکیں۔

جواب :- میں اپنی عزت اور جان کی قسم کھانا ہوں کہ جھوٹ نہ بولوں گا اور اُن لوگوں کی تعداد اس شہر میں اور اس ملک میں بہت ہے جو میرے ہم خیال ہیں۔ علمائیں۔ وزراء میں۔ امرا میں۔ تجار میں اور تمام دوسرے طبقوں میں ایسے لوگ بہت ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ جب سید جمال الدین اس شہر میں آئے تو ہر طبقہ کے لوگ طہران میں بھی اور شاہ عبدالعظیم میں بھی اُن سے ملنے اور ان کی خدمت میں رہنے کے لیے آتے تھے اور آپ کو معلوم ہے کہ وہ کس طرح اُن کے لکچر اور وعظ سنتے تھے اور چونکہ جو کچھ سید جمال الدین کہتے تھے وہ خدا کے لیے اور عامۃ الناس کی بھلائی کے لیے ہوتا تھا اس لیے ہر شخص ان کے بیان سے متاثر ہوتا تھا اور سب مسحور ہو جاتے تھے۔ اس

طرح انہوں نے لوگوں کے دلوں میں اُن خیالات کا بیج ڈالا اور اُس طرح عامۃ الناس جاگے اور اپنے ہوش میں آگئے۔ اب ہر شخص وہی خیالات رکھتا ہے جو میں رکھتا ہوں مگر میں خدائے برتر و قادر کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرے اس خیال اور شاہ کو قتل کرنے کے ارادہ سے سوائے میرے کوئی واقف نہ تھا..... جو کچھ تم سے ہو سکے کر لو.....“

سوال :- کیا اُس کے (شیخ ہادی کے) جمال الدین سے خاص تعلقات ہیں اور اُس کی مسلسل خط و کتابت سید سے رہتی ہے۔

جواب :- میں کیا کہہ سکتا ہوں مجھے معلوم نہیں کہ حاجی شیخ ہادی کی براہ راست خط و کتابت ہوتی ہے یا نہیں۔ مگر شیخ ہادی سید کے بہت معتمد ہیں اور اُن کو بہت بڑا آدمی سمجھتے ہیں۔ جس کسی میں ذرا سی عقل بھی ہوگی وہ سمجھ سکتا ہے کہ سید اپنے زمانہ کے انسانوں میں سب سے جُدا ہیں۔ ہر چیز کی حقیقت اُن کی نظر میں واضح ہوتی ہے۔ یورپ اور تمام دنیا کے فلاسفروں اور عقلا کی گردنیں اُن کے سامنے جھکی ہیں۔ اِس زمانہ کا ایک بھی عالم و فلاسفر اُن کا خادم یا شاگرد ہونے کی اہلیت نہیں رکھتا.....

ایرانی حکومت اُن کی قدر و قیمت نہ سمجھ سکی اور اُن کے محترم وجود سے فائدہ نہ اٹھا سکی۔ اُس نے سید کو بے عزتی اور حقارت کے ساتھ نکالا۔ اب جا کر دیکھو کہ سلطان ترکی اُن کی کس قدر قدر و منزلت کرتے ہیں۔ جب سید ایران سے لندن گئے تو سلطان نے اُن کو کئی دفعہ تار دیئے کہ افسوس ہے آپ کا مقدس وجود اسلامی ممالک سے اِس قدر دُور چلا جائے اور مسلمان اُس سے فائدہ نہ

اٹھاسکیں۔ مرکز اسلام پر آتے تاکہ مسلمانوں کی اذان کی آواز آپ کے کانوں میں جائے اور ہم یک جا رہیں۔ اول تو سید رضا مند نہ تھے مگر پرنس ملکم خاں اور بعض دوسرے دوستوں کے کہنے سے وہ قسطنطنیہ گئے اور سلطان نے ان کو ایک بڑا محل رہنے کے لیے دیا اور دوسو پونڈ ماہوار ان کا وظیفہ مقرر کیا اور کھانا شاہی باورچی خانہ سے دونوں وقت بھیجا جاتا ہو اور شاہی گھوڑا گاڑی ہر وقت ان کی خدمت میں حاضر ہو۔ جس دن سلطان نے ان کو بلدیہ میں بلایا تو ان کے چہرہ پر بوسہ دیا۔ وہ دونوں ایٹیم بوٹ پر جو شاہی باغ کی جھیل میں چلتی ہو بیٹھے ہوئے عرصہ تک باتیں کرتے رہے اور سید نے وعدہ کیا کہ وہ بہت جلد اسلامی سلطنتوں کو متحد کر دیں گے۔ اور ان سب کو خلافت کی طرف راغب کر دیں گے اور سلطان کو تمام مسلمانوں کا امیر المومنین بنا دیں گے۔ اس کے بعد انھوں نے کربلا و نجف و ایران کے تمام شیعہ علما سے خط و کتابت شروع کی اور وعدوں اور امیدوں اور دلائل سے ان کو سمجھایا کہ اگر مسلمان سلطنتیں متحد ہو جائیں گی تو دنیا کی تمام اقوام بھی مل کر ان کے خلاف کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ ان کو چاہیے کہ عمر اور علیؑ کے متعلق اپنے زبانی جھگڑوں کو الگ رکھیں۔ اور خلافت کے مسئلہ پر غور کریں۔ اسی زمانہ میں سمارا میں شیعہ سُنی کا جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا۔ سلطان ترکی نے یہ خیال کر کے کہ شاہ ایران نے خاص طور پر یہ قضیہ شروع کرایا ہو تاکہ عثمانی سلطنت میں بد نظمی پیدا ہو سید سے اس معاملہ کے متعلق مشورہ کیا۔ سید نے کہا کہ چونکہ ناصر الدین شاہ عرصہ سے تخت پر قابض ہو اس لیے اُس کا اثر ایسا ہو کہ شیعہ علما اور اہل ایران ہمارے مقاصد کی تائید کرنے پر آمادہ نہ ہوں گے۔

سوال :- تم سلطان اور سید کی ملاقات کے وقت موجود نہ تھے تو یہ سب باتیں تم کو کیسے معلوم ہوئیں۔

جواب :- مجھ سے زیادہ سید کا رازدار کوئی نہ تھا وہ مجھ سے کسی بات کو نہ چھپاتے تھے۔ جب میں قسطنطنیہ میں تھا تو وہ میرے ساتھ اس قدر عزت کا برتاؤ کرتے تھے کہ لوگ مجھے درجہ میں ان کے بعد سمجھتے تھے۔ سوائے سید کے میرے برابر کسی کی عزت نہ کی جاتی تھی۔ یہ تمام معاملات خود سید نے مجھ سے بیان کیے اور اس قسم کی وہ بہت سی باتیں مجھ سے کہا کرتے تھے جو مجھے اس وقت یاد نہیں۔ جب وہ باتیں کرنا شروع کرتے تھے تو مسلسل کیے جاتے تھے جس طرح ٹوٹی ہوئی کمائی والی گھڑی کو چابی دی جاتی ہو! میں کس طرح سب باتیں اُن کی یاد رکھ سکتا تھا

سوال :- اس کے بعد کیا ہوا۔ جو خطوط سید نے علما کو لکھے تھے اُن کا کوئی اثر ہوا۔

جواب :- ہاں سب نے جواب دیا اور ان کی خدمت کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ بعض حریص اخوند اور ملا روپیہ اور عزت کے وعدوں کو سن کر کہیں خاموش رہ سکتے ہیں۔ الخضر جب سید نے اپنی تجویز کو بوجھ کر لیا اور اس کا نتیجہ نکالنے والے ہی تھے تو سلطان کے بعض آدمیوں نے، بعض ایسے مکاروں نے جو سلطان کو گھیرے رہتے ہیں جیسے ابوالہدیٰ یہ چاہا کہ اس کام کا سہرا اپنے سر باندھے۔ چنانچہ انھوں نے سلطان کو یہ سلطان کا منہم اور پر بھی کہا جاتا تھا۔ عبدالحمید خاں اُس کے بہت معتقد تھے۔ نوجوان ترکوں نے اپنی تحریک کے سلسلہ میں اس شخص کو اپنے زیر اثر کر لیا تھا اور اُسی کے ذریعے سے (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۳)

سید کی طرف سے مشتبہ کر دیا اور یہ بتایا کہ وہ خدیو مصر سے ملے تھے۔ اور سلطان سے مایوس ہو کر خدیو کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔ سلطان کچھ افسردہ خاطر اور مجنون سے رہتے ہیں۔ اُن کو ہمیشہ یہ خطرہ رہتا ہے کہ محل کی عورتیں انہیں قتل نہ کر ڈالیں۔ پس وہ مشتبہ ہو گئے۔ سید کی نگرانی کے لیے پولیس مقرر کر دی گئی اور سواری بھی اُن سے لے لی گئی۔ سید کو بہت ناگوار ہوا اور انہوں نے لندن جانے پر اصرار کیا۔ اُس کے بعد پھر دونوں میں صلح ہو گئی اور پولیس کی نگرانی بھی نہ رہی اور گھوڑا کٹاری بھی آگئی۔ اس مصالحت کے بعد کہا کرتے تھے کہ افسوس ہے یہ شخص (سلطان) مجنون ہی درنہ میں تمام مسلمان قوموں کو اس کا عقیدت مند بنا دیتا۔ مگر چونکہ اُس کا نام بڑا ہے اس لیے یہ کام اُسی کے نام سے کرنا ہو گا۔ جس کسی نے سید کو دیکھا ہے وہ جانتا ہے کہ سید کس قدر ضدی آدمی ہیں۔ وہ کبھی اپنے فائدہ کا خیال نہیں کرتے نہ اپنے لیے روپیہ چاہتے ہیں نہ عزت نہ حقوق۔ وہ بہت پرہیزگار آدمی ہیں۔ وہ صرف اسلام کی عزت بڑھانا چاہتے ہیں۔ اب بھی اگر مظفر الدین شاہ کو اس حقیقت کا احساس ہو اور وہ سید کو بلائیں اور ان سے مصالحت کریں تو یہ کام (نصبِ خلافت) ان کے نام سے کریں گے۔

سوال :- کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ ان تمام واقعات کے بعد جو تم نے بیان کیے ہیں سید کو اپنے یہاں محفوظ رہنے پر اس قدر بھروسہ ہو گا کہ وہ بے خوف چلے آئیں گے۔

جواب :- ہاں میں سید کو خائب جانتا ہوں۔ اگر شاہ کسی غیر سلطنت کو

(بقیہ ماحشیہ صفحہ ۲۶۲) سلطان پر زور ڈالوایا تھا کہ اصلاحات کو قبول کر لیں مگر نوجوان ترکوں نے اپنی تحریک کی کامیابی کے بعد اس شخص کو برطرف کر دیا۔

اُن کی جان کا ضامن بنانا پسند کریں گے تو وہ کسی بات کی پرواہ نہ کریں گے۔ وہ آئیں گے اور شاید اسلام کی بہت بڑی خدمت انجام دیں گے۔ علاوہ بریں وہ جانتے ہیں کہ اُن کی جان کوئی قیمت نہیں رکھتی اور اُن کا خون اگر بہایا جائے گا تو قیامت تک خشک نہ ہوگا۔“

پھر بھانسی لگنے سے ایک دن پہلے رضا خاں نے ایک بیان دیا جس میں اپنے ان جذبات کا اظہار کیا جو اس قتل کے محرک ہوئے تھے۔
 ”جو کچھ ہو گیا ہو گیا۔ میرا ایمان ہے کہ خدا کے حکم کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں گرتا۔ میں نے اپنی رائے میں انسانوں قوم اور ملک کی ایک خدمت انجام دی ہے۔ میں نے تخم بر بانی ڈالا ہے اور اب وہ جتنا ہے سب لوگ سو رہے تھے اور اب وہ جاگتے جاتے ہیں۔ میں نے ایک سخت اور بے ثمر درخت کو اکھاڑ کر پھینک دیا ہے جس کے سایہ میں ہر قسم کے زہریلے اور خوشخوار بہاؤ جمع تھے۔ میں نے اُن جانوروں کو منتشر کر دیا ہے۔“

ناصر الدین شاہ کے قتل سے شیخ کا تعلق کیا تھا یا کچھ نہ تھا اس کے متعلق قیاسات تو بہت ہیں مگر کوئی صریح شہادت موجود نہیں۔ بلنٹ۔ سعید پارس (مولف جمال الدین افغانی مطبوعہ قسطنطنیہ) اور آقا مرزا حسین خاں دانش اور بعض دوسرے لوگوں نے قیاسات سے کام تو لیا ہے مگر کوئی شہادت فراہم نہ ہو سکی۔ البتہ مرزا لطف اللہ شیخ کے متعلق اس شبہ کو بالکل بے بنیاد سمجھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ:-

”مرزا رضا این کہ می گوید کہ اس قضیہ قتل ناصر الدین شاہ با جازہ سید بودہ نگارندہ تکذیب می کنم زیرا آنچہ بر بندہ ثابت و معلوم شد در آن وقت

سید بہ این کار میل نہ داشت۔ چنانچہ وقوع این مسئلہ اغلب نقشہ ہائے سید را بہم زد۔ ستر مرتکب شدن مرزا رضا بقتل شاہ این بود کہ از فرط عشق و محبت داداد تے کہ نسبت بہ حضرت داشت واقفانہ توانست بشود کہ کے نام مرحوم سید جمال الدین را بتوہین برد۔“

اور مرزا لطف اللہ کا یہ خیال قرین قیاس بھی معلوم ہوتا ہے۔

قصہ مختصر شیخ ایران میں اپنی تعلیمات کا ایک ایسا چراغ روشن کر گئے جس نے بڑی بڑی آندھیوں اور بڑے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کیا اور اس چراغ سے سیکڑوں اور ہزاروں چراغ روشن ہوئے۔ خود ان کی زندگی میں بھی اور ان کے بعد سے آج تک یہ روشنی بڑھتی رہی ہے۔

ایران میں شیخ کے ارشد تلامذہ اور مخصوص معتقدین کی ایک بہت بڑی فہرست ہمارے سامنے ہے ”صاحب بیداری ایران“ لکھتا ہے کہ۔

”وزیر قبیل متجاوز از پنجاہ نفر بودند کہ در مجالس سیدات و مہبوت و ساکت می نشستند و بخدمتش افتخاری نمودند“

ان پچاس میں سے بھی جو درحقیقت قومی تحریک میں شیخ کے نائب اور معتمد تھے صرف چند ہی کے نام اس موقع پر لیے جا سکتے ہیں۔ شیخ علی قزوینی مرزا آقا خاں۔ مرزا محمد علی خاں طہرانی۔ شیخ احمد رومی کرمانی۔ جمال الدین داغظہ افغانی۔ شیخ محمد خیابانی۔ شیخ ہادی نجم آبادی۔ آقائے طباطبائی۔ امین الدولہ۔ مشیر الدولہ۔ آقا مرزا نصر اللہ خاں۔ آقا مرزا فرح اللہ خاں۔ ذکا الملک۔ اعتماد السلطنہ۔ ڈاکٹر ہمدی خاں۔ مرزا داؤد خاں۔ مرزا عبد اللہ خراسانی۔ محمد حسن امین الضرب۔ آقا مرزا علی اکبر۔ آقا مرزا ارباب۔ مرزا حسن علی۔ عبد العظیم ہراتی اور شیخ رئیس ملائے طالقانی۔ اگر ان ہی چند کی زندگی کے حالات تفصیل کے ساتھ لکھے جائیں تو انقلاب

ایران کی مکمل تاریخ قلمبند ہو سکتی ہو۔ اس گروہ کا ہر فرد ایران کے عہدِ نو کا ایک معمار تھا۔ انشاء اللہ اس کتاب کی دوسری جلد میں کوشش کی جائے گی کہ تمام ممالک اسلامی میں شیخ کے اُن معقّدین اور شرکارِ کار کے حالات کو یکجا کر دیا جائے جو اُس زمانے میں اُن کی تحریکات کے اعضاءِ ریشہ تھے۔ اقصہ شیخ جب اس جماعت کو ایران میں چھوڑ کر نکلے تو اُن کی ہجرت کے بعد اُن ہی لوگوں میں سے اکثر نے اِس آتشدان کی آگ کو روشن رکھا۔ ۱۹۰۹ء میں انقلاب ایران اور آخر کار خاندانِ قاجار کا زوال اور شاہِ رضا خاں پہلوی کا عروج یہ سب اُسی درخت کی سرسبز شاخیں ہیں جو شیخ نے سرزمینِ ایران پر نصب کیا تھا۔ اب ہم اِس منزل پر ایران کی داستان سے قطع نظر کر کے شیخ کی زندگی کے حالات پھر اُس وقت سے شروع کرتے ہیں جب وہ ایران سے خارج کیے گئے تھے۔

خانیقین۔ بغداد بعصرہ ولندن | اس داستان کے تسلسل کا ٹوٹا ہوا رشتہ اس طرح پھر جوڑا جاتا ہے کہ خانیقین سے بغداد ہوتے ہوئے شیخ لندن آئے۔ بغداد کے قیام کی کوئی تفصیل معلوم نہیں مگر بعصرہ کے متعلق حالات گزشتہ صفحات سے واضح ہوتے ہیں۔ شیخ ایک دفعہ پھر لندن جا کر مکمل خاں کے ساتھ ایران کے متعلق کچھ کام کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ سلطان عبدالحمید خاں کی دعوت کو رد کر کے شیخ نے لندن کا رخ کیا۔

”بد حال الدین افغانی بعد حصولِ صحت بموجب درخواست تلغرافی

یکے از وزرائے لندن بہ انگلستان عازم شد“۔

مجلدِ کابل میں اعلیٰ کے اس بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکومتِ انگلستان نے شیخ کو انگلستان آنے کی دعوت دی تھی۔ لیکن اس واقعہ کی — اگر یہ سے جریدہ مصوّرہ اسلامبول۔

واقعہ ہے۔ کوئی تصدیق کسی بیان سے نہیں ہوتی۔ ایسا ہوتا تو کم از کم بلٹ ضرور کوئی ذکر کرتے لیکن ایک دوسرے بیان سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ بہر صورت شیخ کے درود لندن کو انگریزی حکومت نے اُس وقت ناپسند نہیں کیا تھا اس لیے کہ۔

”در لندن از طرف جریدہ ٹائمس وبعض معرین دیگر استقبال کردہ می شود رئیس الوزرائے حکومت انگلستان ہم چندیں بار برائے ملاقات او بہ ہوٹلے کہ دران اقامت داشت می آید۔“

تعب ہے کہ بلٹ نے اس زمانہ کے حالات کہیں قلمبند نہیں کئے۔ اگر شیخ سے اور برطانوی مدیرین سے اس زمانہ میں واسطہ رہا تو یہ ممکن نہیں کہ بلٹ اُن معاملات سے بے تعلق رہے ہوں در آن حالیکہ اس دفعہ شیخ لندن میں بہت نمایاں رہے اور مختلف ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی اور پبلک معاملات میں شیخ اکثر حصہ لیتے رہتے تھے نیز اُس زمانہ میں مصر اور ایران کے متعلق اُن کے مضامین بھی لندن کے اخبارات میں شایع ہوتے رہے۔

”در روز جشن ولادت ملکہ وکٹوریہ کہ تمام اشراف و بزرگان و نمایندگان خارجہ حضور داشتند ارباب حکومت از سید خواہش نمودند کہ بہ مجمع بزرگ نقطے ایراد نمایند۔ سید ہم چنان نطق موثر ایراد فرمود کہ حکومتِ نطقِ عالی را بہ اہتمام نوٹ کردہ بجا باید شایع کرد“ ۱۷

بہر حال معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کے متعلق اس زمانہ میں انگریزی حکومت کا رویہ بدلا ہوا تھا۔ ڈیڑھ سال تک شیخ اس طرح لندن میں رہے لیکن اُن کی

زندگی کے اس زمانہ کا بڑا حصہ نظر سے پوشیدہ ہو۔ اُس زمانہ میں شیخ کے بڑے دوست اور شریک کار شاہزادہ ملکم خاں تھے شیخ کی صحبتیں اکثر ہالینڈ پارک میں اُن ہی کے مکان پر جا کرتی تھیں۔ چنانچہ آخر ۱۸۹۱ء میں پروفیسر براؤن بھی شیخ سے اُسی جگہ ملے تھے اور اپنی کتابوں میں اُن صحبتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ جب شیخ لندن میں ایران کے متعلق جدوجہد کر رہے تھے تو

قطنینہ سے سلطان عبدالحمید خاں نے اُن کو پھر ترکی آنے کی دعوت بھیجی ترکی سفیر رستم پاشا شیخ کے پاس سلطان کا پیام لے کر آئے مگر شیخ نے پھر بھی انکار کیا۔ تب سلطان نے قطنینہ سے خود دو تین تار بھیجے شیخ ابھی کچھ روز اور لندن سے جانا نہ چاہتے تھے لیکن پرنس ملکم خاں نے اُن کو مشورہ دیا کہ بار بار دعوت کو رد کرنا مناسب نہیں نیز یہ کہ شیخ کا ترکی جانا ایران کے معاملات کے متعلق بھی مفید ثابت ہوگا۔ بالآخر ۱۸۹۲ء میں شیخ لندن سے رخصت ہو کر اپنی زندگی کی آخری منزل کی طرف روانہ ہوئے۔

قطنینہ | جس وقت شیخ آل عثمان کے دار الخلافہ میں پہنچے تو دولت عثمانیہ زوال و انحطاط کے مدارج بہت تیزی کے ساتھ طو کر رہی تھی۔ یورپین تدبیر کی قوت نے اُس کو بالکل بے دست و پا کر دیا تھا۔ شیخ اس بیمار کے بستر کے پاس اُس وقت آئے جب نزع کا عالم شروع ہو چکا تھا۔ مرض الموت کی یہ داستان ۱۲۸۷ھ سے شروع ہوتی ہو جب محمد علی پاشا خدیو مصر کی قوت روز بروز بڑھ رہی تھی اور یونان بھی ترکی کے خلاف پوری تیاریاں کر رہا تھا۔ چنانچہ سلطان کو مجبور ہو کر محمد علی سے امداد مانگنی پڑی اور اس امداد کے معاوضہ میں مور یا شام اور دمشق کی گورنری دینے کا وعدہ کرنا پڑا۔ بالآخر ۱۲۸۷ھ میں محمد علی کے بیٹے ابراہیم پاشا نے

یونانیوں کو شکست دے کر اس بغاوت کو ختم کر دیا اور ایتھنز پھر ایک دفعہ چند روز کے لیے ترکوں کے قبضہ میں آیا۔ لیکن انگلستان، روس اور ترکی یونان کی حمایت پر آمادہ ہوئے۔ اور سینٹ پیٹرسبرگ میں یونانی مسئلہ پر غور کرنے کے لیے ایک کانفرنس منعقد کرائی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی کو بادلِ ناخواستہ یونان کو آزاد کرنا پڑا اور اس کی سیادت محض برائے نام باقی رہ گئی۔ نیز بحر اسود میں روسی جہازوں کو آمد و رفت کی اجازت بھی دینی پڑی۔ ترکی کے گلے کے پھندے اس طرح روز بروز تنگ ہوتے جاتے تھے۔ دوسری طرف سلطنت کے داخلی دروہست کی یہ صورت تھی کہ جانشاری سیاہ سفید کے مالک ہو گئے تھے حتیٰ کہ سلطان کا عزل و نصب اور وزیر کا تقرر بھی انہیں کی رائے پر منحصر ہو گیا تھا۔ بالآخر سلطان محمود نے تنگ آکر ۱۸۲۶ء میں جانشاریوں کا قتل عام کر دیا اور ملک کا انتظام ایک نئی اور بہتر قسم کی فوج کے ہاتھ میں آیا۔ جانشاریوں کی بیخ کنی نے کچھ عرصہ کے لیے ملک کی اندرونی تباہی کو روک دیا اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ ترکی کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ مگر اس نئی تعمیر میں بھی خرابی کی صورتیں مضمحل تھیں۔ نئی فوج میں جرمن اور فرانسیسی افسر اور معلم مقرر کیے گئے لیکن ادھر تو سلطان محمود اندرونی اصلاحات کی تکمیل میں مشغول تھا اور ادھر روسی فرانسیسی اور برطانوی سپروں نے مصری اور ترکی جہازوں کو یونان کے قریب پسپا کر کے تباہ کر ڈالا۔ گو کہ اس کے بعد روس کے متعلق اپنے رقیبانہ جذبات سے متاثر ہو کر انگلستان پھر ترکی سلطنت کے وجود کو قائم رکھنے کی پالیسی پر واپس آ گیا۔ لیکن اس خارجی ہنگامے نے داخلی اصلاحات کی بنی

ہوئی عمارت کو روک دیا اور باوجودیکہ ترکی نے ایک بہت سخت جنگ کے بعد رؤس کو شکست بھی دی لیکن بالآخر دول کی مداخلت نے ۱۸۳۲ء میں یونان کو کلیناً آزاد کر دیا۔

اسی زمانے میں ترکی کے خارجی لمحات بھی یکے बाद دیگر سے اغیار کے قبضہ میں چلے گئے۔ بوسینا اور البانیا میں بغاوت شروع ہوئی، فرانس نے الجزائر پر قبضہ کر لیا۔ فرانس کی امداد کے بھروسہ پر محمد علی پاشا نے عثمانی تاج و تخت پر قبضہ کر لینے کی فکریں شروع کر دیں چنانچہ دمشق اور حلب پر محمد علی کا قبضہ ہو گیا۔ سلطان نے چاہا کہ مصریوں اور فرانسیسیوں کے مقابلہ میں انگریز ان کی حمایت کریں لیکن اُدھر سے بھی صاف جواب ملا۔ بالآخر سلطان کو رؤس کی امداد مانگنی پڑی اور رؤسی فوجیں باسفورس کے ساحل تک بلالی گئیں۔ جنھوں نے محمد علی کی پیش قدمی کو کچھ عرصہ کے لیے روک دیا لیکن رؤس نے اس موقع پر جو امداد کی اس کا معاوضہ بھی ہاتھ کے ہاتھ وصول کر لیا۔ ۱۸۳۳ء کے عہد نامہ کی رؤس سے رؤسی جہازوں کو آبنائے باسفورس میں گزرنے کی اجازت مل گئی حالانکہ کسی دوسری یورپین سلطنت کے جہازوں کو آبنائے سے گزرنے کا حق حاصل نہ تھا۔ محمد علی نے جو اپنی ناکامی کو بھولانہ تھا ۱۸۳۹ء میں پھر ایک دفعہ شام میں ترکی کو شکست فاش دی اور معرکہ کار زار گرم ہو گیا۔ اسی زمانہ میں سلطان عبدالحمید اول تخت نشین ہوئے۔ وہ وقت بہت نازک تھا۔ محمد علی کی قوت اب اس قدر بڑھ چکی تھی کہ امیر البحر احمد پاشا کی غداری کی وجہ سے ترکی بیڑہ پر بھی محمد علی قبضہ کر چکا تھا۔ لیکن اُس کے بڑھتے ہوئے اثرات سے خائف ہو کر دول کی ایک کانفرنس

بمقام لندن ۱۸۴۰ء میں منعقد کی گئی۔ اور اس کانفرنس میں فیصلہ کیا گیا کہ مصر کی گورنری نسلاً بعد نسل محمد علی کو دی جائے اور آبنائے باسفورس کو تمام دول کے جہازوں کے لیے بند کر دیا جائے اور بحیرہ اسود میں بھی ایسی جہازوں کو داخل ہونے کی اجازت نہ دی جائے۔ سلطان عبدالحمید دول کی سازشوں کے مقابلہ میں اپنی کمزوری اور لاچارگی کو بخوبی محسوس کر رہے تھے۔ اور خارجی معاملات میں اپنی بے بسی اور ناکامی سے متاثر ہو کر انھوں نے ارادہ کر لیا کہ پہلے اپنی تمام قوت داخلی اصلاحات پر صرف کریں۔ چنانچہ مصطفیٰ رشید پاشا جو ترکی کے وزیر خارجہ رہ چکے تھے اور لندن میں سفیر تھے واپس بلائے گئے اور انھوں نے اندرونی اصلاحات کی ایک اسکیم تیار کی جس کو ترکی تاریخ میں تنظیمات کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان تنظیمات کی منظوری سلطان نے دے دی اور پہلا خط ہمایونی ”جاری ہوا۔ گویا ترکی میں آئینی اصلاحات کا یہ پہلا قدم تھا۔ تنظیمات کے نفاذ نے ملک کے انتظامی حالات کو بہتر بنانا شروع کیا۔ لیکن اصلاح حال کی اس بڑھتی ہوئی تحریک نے رؤس کو بے چین کر دیا اور رؤسی مدبرین یہ سمجھنے لگے کہ اگر ترکی میں آئینی اصلاحات بخوبی نافذ ہو گئیں تو مداخلت کے امکانات قدر تا کم ہو جائیں گے اور رؤسی منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔ چنانچہ ۱۸۴۴ء میں زار رؤس نے خود لندن جا کر یہ تجویز پیش کی کہ برطانیہ اور رؤس عثمانی سلطنت کو آپس میں اس طرح تقسیم کریں کہ انگلستان کریٹ اور مصر پر قبضہ کر لے اور قسطنطنیہ کو ایک آزاد بین الاقوامی شہر بنا دیا جائے اور ریاستہائے بلقان کو آزاد کر کے اُن پر رؤسی سیادت قائم

کردی جائے۔ لیکن انگلستان کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہتا تھا جس سے فرانس ناخوش ہو جائے اسی لیے اس تجویز پر عمل نہ ہو سکا۔ مگر اس تجویز کے ناکام ہونے کے بعد رؤس نے ترکی عیسائی رعایا کے حقوق کا سوال اٹھا کر پھر ایک دفعہ انگلستان پر دباؤ ڈالا۔ اور انگلستان کو رضامند نہ پا کر آخر اُس نے براہِ راست ۱۸۵۷ء میں ترکی کو الٹی میٹم دے دیا کہ رؤس کے تمام ہم مذہب جو ترکی میں آباد ہیں رؤس کی حفاظت میں دے دیے جائیں۔ انگریزی سفیر کے مشورہ سے ترکی نے رؤس کے اس مطالبہ کو نامنظور کر دیا اور اس طرح رؤس اور ترکی کے درمیان جنگ شروع ہو گئی۔ اس جنگ میں فرانس اور انگلستان اپنی سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ترکی کے طرفدار بنے ۱۸۵۷ء میں رؤس کو مجبور ہو کر صلح کرنی پڑی۔ لیکن وہ ترکی کی عیسائی رعایا کو تنظیمات کے خلاف بھڑکاتا رہا۔ چنانچہ ۱۸۵۹ء میں ڈنیوب کی چند ریاستوں نے متحد ہو کر حکومتِ رومینا قائم کر لی۔ ۱۸۶۰ء میں لبنان میں بغاوت کرا دی گئی۔ دول نے بظاہر تنظیمات کی تائید کی مگر بہ باطن اُن کی مخالفت کے نئے نئے طریقے پیدا کیے اور کسی نہ کسی بہانے سے معاملات میں مداخلت جاری رہی۔ لیکن خود ترکی میں اب ایک جماعت ایسی پیدا ہو گئی تھی جو تمام مشکلات اور خطرات کے مقابلہ میں ملک کے آئینی اصلاحات کے لیے جدوجہد کرنے پر کمر بستہ تھی اور یہی آغاز تھا نوجوان ترکوں کی تحریک کا۔

۱۸۶۱ء میں جب سلطان عبدالعزیز تخت پر بیٹھے تو انھوں نے تنظیمات کی متعلق حکومتی تجاویز کی تجدید کی۔ لیکن رؤس نے اب "تحریک

اتحادِ سلاطین کے نام سے ترکی کی عیسائی رعایا کو حکومت کے خلاف متحد کرنے کی ایک خطرناک کوشش شروع کر دی تھی۔ چنانچہ مانٹی نیگرو اور سرویا میں بغاوت شروع ہو گئی۔ اور جزیرہ کرٹ بھی آزاد ہو گیا گو وہ محض برائے نام ترکی حکومت کے زیرِ سیادت رہا۔ اس عام بے چینی اور بد امنی کے زمانے میں مدحت پاشا کی اصلاحی تجاویز کا بہت چرچا ہونے لگا اور مرکزی حکومت بھی اُن کے زیرِ اثر تنظیمات کے دوبارہ نفاذ پر آمادہ ہو چکی تھی۔ اُسی زمانے میں عالی پاشا اور فواد پاشا جیسے مدبرین نے بھی اپنی کوششوں سے ملک کی داخلی اصلاحات کی رفتار کو بہت تیز کر دیا تھا۔ لیکن یہ رفتار جس قدر تیز ہوتی تھی اُسی قدر یورپین دول اور خصوصاً روس کی بے چینی زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ اس لیے کہ وہ سب جانتے تھے کہ اگر ترکی کی تنظیم مکمل ہو گئی تو پھر اُن کی مداخلت کے امکانات باقی نہ رہیں گے اور یہ شکارِ پنجبہ سے نکل جائے گا۔ چنانچہ اصلاحات کی بڑھتی ہوئی تحریک کو روکنے کے لیے پھر ایک دفعہ روس نے بلغاریہ میں بغاوت کرا دی اور اس ہنگامہ میں پھر اصلاحات کا کام کچھ عرصہ کے لیے رُک گیا۔ اُسی زمانے میں عالی پاشا اور فواد پاشا کا بھی انتقال ہو گیا اور مرکز پر ایسے لوگ حادی ہو گئے جو روس کے زیرِ اثر تھے۔ چنانچہ سلطان کی مطلقیت کو پھر فروغ ہونے لگا۔ مگر سطح کے نیچے اصلاحات کی جو خفیہ تحریک قوی تر ہوتی جاتی تھی اور عالی پاشا کے زمانے میں نوجوان عثمانیوں کے نام سے جو انجمن قائم ہو گئی تھی اُس

نے یورپین دول کی ریشہ دوانیوں کا مقابلہ کرنا شروع کیا۔ مشہور ترکی شاعر ناسق کمال نے اور ضیا پاشا نے پیرس میں بیٹھ کر پمفلٹ اور رسائل و اشتہارات شایع کرنے شروع کئے اور ترکوں کو ترغیب دینی شروع کی کہ وہ مکمل اصلاحات کا مطالبہ کریں۔ مدحت پاشا اس جماعت کے ہمنہال تھے اور انھوں نے بعض دوسرے اراکین مجلس وزرا کو بھی اپنا ہنمیاں بنالیا تھا۔ چنانچہ علما کا فتویٰ حاصل کر کے ۱۸۷۶ء میں سلطان عبدالعزیز کو معزول کر دیا گیا اور اُن کے بھائی مراد بنجم تخت نشین کیے گئے۔ لیکن مراد تین مہینہ کے بعد ہی پاگل ہو گئے اور اُن کی جگہ عبدالحمید دوم تخت نشین ہوئے۔

تخت نشینی سے پہلے عبدالحمید خاں نے مدحت پاشا سے اصلاحات کے متعلق بہت سے وعدے کیے تھے اور سخت نشینی کے بعد بھی ایک اُمید افزا فرمان شایع کیا گیا لیکن واقعہ یہ تھا کہ فطرتاً عبدالحمید اصلاحات کے نام سے گھبراتے تھے اور اُن کو کسی طرح گوارا نہ تھا کہ اُن کی مطلقیت میں کوئی کمی کی جائے۔ چنانچہ چند ہی ماہ کے بعد انھوں نے مدحت پاشا کو برطرف کر کے خارج البلد ہونے پر مجبور کر دیا۔ ۱۸۷۷ء میں پھر روس نے ترکی کے خلاف اعلان جنگ کیا اور ترکوں کو اناطولیا اور یورپین ترکی میں سخت شکستیں اٹھانی پڑیں۔ عبدالحمید خاں نے جنگ شروع ہوتے ہی اُس پارلیمنٹ کو برخاست کر دیا جس کا انتخاب مدحت کی کوششوں سے ہوا تھا۔ ۱۸۷۸ء میں جنگ کا نتیجہ یہ نکلا کہ رومانیہ اور سرودیا قطعاً آزاد ہو گئے اور بلغاریہ کو ترکی سلطنت کا ایک ٹکڑا دلوا دیا گیا۔

قارص اردھان اور بایزید کے صوبے رؤس کے حوالہ ہوتے۔ اور چند ہی روز بعد ترکی کو انگلستان سے بھی معاہدہ کرنا پڑا جس کی رؤسے قبرس انگریزوں کے حصہ میں آیا۔ عبدالحمید اپنی ہر شکست کے بعد اپنے اختیارات بڑھاتے چلے جاتے تھے۔ چنانچہ پارلیمنٹ اور وزیران کے تقریباً تمام اختیارات سلطان کے ہاتھ میں منتقل ہو گئے اور شاہی محل جاسوسی اور سازش کا واحد مرکز بن گیا۔ مدحت پاشا کو سمرنا کا گورنر بنا کر بلایا گیا۔ مگر اُن کے اس طرح بلائے جانے کا اصلی سبب کچھ اور ہی تھا۔ اور وہ یہ تھا کہ عبدالحمید خاں یہ نہ چاہتے تھے کہ نوجوان عثمانیوں کی یہ جماعت اُن کے قابو سے باہر رہ کر اصلاحات کا پروگنڈا جاری کر کے چند ہی روز بعد پاشا پر سلطان عبدالعزیز کے قتل کا الزام لگا کر مقدمہ چلایا گیا اور بعد کو یورپین دول کے دباؤ سے مجبور ہو کر اُن کی سزائے موت کو نظر بندی سے بدل دیا گیا۔ چنانچہ مدحت طائف میں نظر بند کیے گئے اور وہیں کچھ عرصہ بعد مار ڈالے گئے۔ اب عبدالحمید علانیہ اصلاحات کی مخالفت پر اُتر آئے۔

۱۸۸۵ء میں مشرقی رومیلیا میں بغاوت ہوئی اور وہ صوبہ بالآخر رؤس کے قبضہ میں آگیا۔ اس عرصہ میں ارمنیوں نے بھی کئی دفعہ بغاوتیں کیں اور اُن پر ترکوں کے مظالم کی داستانیں بہت نمک مرچ لگا کر یورپ میں سنائی جانے لگیں۔ لیکن عبدالحمید نے اب اصلاحات کے نخیل کو ایک جرم قرار دیدیا اور اپنے خیال میں نوجوان عثمانیوں کی تحریک کو گویا ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ ملک کے اخبار اور

جرائد کی زبان بالکل بند کر دی گئی۔ اور محض جاسوسی کے ایک وسیع تنظیم کے بھروسہ پر حکومت کی جانے لگی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اصلاحات کی تحریک کا وہ عارضی التوا جس کو عبدالحمید خاتمہ سمجھتے تھے خود اُن کی مطلقیت کے خاتمہ کا آغاز تھا۔ دولِ یورپ کے بڑھتے ہوئے دباؤ سے بچنے کے لیے عبدالحمید نے خلافت اسلامی کا ایک سیاسی نخیل دنیا کے سامنے پیش کیا اور اسی نخیل کی تقویت کے لیے وہ شیخ کو اپنا حامی بنانا چاہتے تھے تاکہ شیخ کے ذریعے سے دوسرے اسلامی ممالک میں خلافت کی تحریک کو قوی بنایا جاسکے۔ شیخ کی جانب اُن کا یہ اتفات زیادہ تر ذاتی اغراض پر مبنی تھا۔

ترکی کے یہ حالات تھے جب ۱۸۹۲ء میں شیخ وہاں پہنچے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ عبدالحمید نے خلافت کی تحریک کو اپنی بساط سیاست کا ایک مہرہ بنایا ہے اور وہ عبدالحمید کے ارادوں اور خیالات سے نا آشنا نہ تھے۔ لیکن جس طرح عبدالحمید اُن کی ذات سے اپنے مقاصد پورے کرانا چاہتے تھے اسی طرح شیخ عبدالحمید کے نام اور وقار سے تحریک اتحاد اسلام کو تقویت پہنچانے کی فکر میں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ باوجودیکہ وہ عبدالحمید کے متعلق اچھی رائے نہ رکھتے تھے مگر بالآخر ترکی جانے پر رضامند ہو گئے۔ یقیناً وہ جانتے تھے کہ اتحاد اسلام کے متعلق اُن کے اور عبدالحمید کے ارادے اور خیالات مختلف ہیں۔ شیخ اسلامی دنیا کو یورپ کے دست و برد سے محفوظ رکھنے کے لیے اتحاد اسلامی کی ایک شہر نہاہ تعمیر کرنا چاہتے تھے اُن کی تحریک دفاعی تھی مگر عبدالحمید محض اپنے تخت و تاج کو دول کے ہاتھ سے محفوظ رکھنے کے لیے

یہ سیاسی چال چلنا چاہتے تھے تاکہ وہ اپنے دشمنوں کو ڈرا دھمکا سکیں۔ اور بحیثیت خلیفہ کے دنیائے اسلام میں اپنا وقار قائم کر کے اپنی مطلقیت کو قوی کر لیں۔ شیخ کا تخیل وسیع اور عبد الحمید کی نظر تنگ تھی۔ ایک طرف تحفظ ناموس اسلام اور اتحاد مشرق کے ذریعہ یورپین دول کی جارحانہ پیش قدمی کا مقابلہ بد نظر تھا اور دوسری طرف تحفظ تخت و تاج کی حفاظت۔ شیخ سمجھتے تھے کہ اسلامی ممالک کے تحفظ کا کوئی ذریعہ سوا اتحاد اسلامی کے نہیں اور عبد الحمید سمجھتے تھے کہ آل عثمان کے تخت پر اُن کی ذات خطرہ میں رہے گی جب تک کہ تمام اسلامی ممالک اُن کو خلیفہ اسلام نہ مان لیں۔ شیخ چاہتے تھے کہ خلیفہ اور مرکز خلافت خواہ ترکی میں ہو یا ایران یا مصر یا عرب میں مگر اس مرکز پر تمام دنیا کے مسلمان متحد ہو جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کا تخیل اس قدر مذہبی نہ تھا جس قدر کہ سیاسی تھا۔ انھوں نے ہندوستان کے حالات کا مطالعہ کیا تھا، انھوں نے مصر میں خارجی اقتدار کی شدت دیکھی تھی، انھوں نے ایران کے ابتلا پر غور کیا تھا اور اس تمام عالمگیر مصیبت کا علاج اُن کے نزدیک صرف ایک ہی تھا۔ یعنی اتحاد اسلام۔ مگر عبد الحمید کو کو اگر ایران یا مصر یا کسی دوسری اسلامی سلطنت کے مصائب کا کچھ احساس تھا تو صرف اس لیے کہ وہ اُن مصائب کو اپنی ذات کے لیے خطرناک سمجھتے تھے۔ تخیل کا یہی اختلاف تھا جس کی وجہ سے زیادہ عرصہ تک شیخ اور عبد الحمید کے درمیان اتحاد خیال قائم نہ رہ سکا۔

مرزا لطف اللہ نے شیخ اور سلطان کے درمیان مسئلہ خلافت پر جو گفتگو ہوئی اُس کا ایک حصہ لفظاً لفظاً نقل کیا ہے۔ لیکن حسب معمول

اپنے بیان کی کوئی سند پیش نہیں کی اور نہ یہ امر قرین قیاس ہو کہ وہ گشتگو لفظاً لفظاً لطف اللہ کے علم میں آئی ہو۔ اسی لیے اُس کا ان صفحات میں نقل کرنا ضروری نہیں۔ تاہم شیخ کی اس تجویز کے متعلق کہ تمام ممالک کے مسلمان نمائندوں کی ایک کانگریس منعقد کی جائے مرزا کا یہ مجمل بیان مبالغہ آمیز نہیں معلوم ہوتا کہ۔

"مقصود سید از تشکیل اس گنگرہ دکا نگرس، اسلامی اس بود کہ وسائل ترقی و تکامل عمل اسلامیہ را مشترکاً فراہم نموده شوکت و عظمت اولیہ اسلام را تجدید نماید۔ و ہر گاہ کہ یکے از دول آروپائی بے اعتدالی را نسبت بہ یک مملکت اسلامی رواداشت فوراً ان گنگرہ عالی اسلامی اعلان جہاد مقدس را بتمام مسلمین دنیا برعلیہ آن دولت صادر نموده گزشتہ از تحریم امتعہ و کالائے تجارتی آن دولت ہمہ مسلمین برلئے اطاعت از مبارزہ قیام و شمشیر از نیام کشند۔"

پھر مرزا لطف اللہ ایک جلسہ کا ذکر کرتے ہیں جس میں منجملہ دوسرے اکابر کے حسب ذیل اصحاب بھی شریک تھے۔

"رضا پاشا شیعہ۔ سید برہان الدین لمبی۔ ابوالحسن مرزا شیخ الریس عبدالکریم بک، نواب حسین ہندی۔ شیخ احمد رؤمی۔ مرزا آقا خاں کرمانی۔ مرزا خاں خیر الملک۔ صدی بک۔ جواہر زادہ اصفہانی، شیخ محمود فضل الملک رؤمی وغیرہ۔ اس جلسہ میں شیخ نے دوران تقریر میں فرمایا کہ۔

"امروز مذہب اسلام بمنزلہ یک کشتی است کہ ناخدائے آن محمد بن عبد اللہ صلعم است و قاطبہ مسلمین از خاص و عام کشتی نشینان این سفینہ مقدسہ اند۔ ویو منا ہذا این کشتی در دریائے سیاست دنیا

دو چار طوفان و متصل بہ غرق گردید بہ آں جریانات پولیکی دنیا و حوادث کہ در غرق و افنائے ایں کشتی رجہد کردہ دی کند آیا سکند و راکبین ایں کشتی کہ مشرف بفرق و امادہ ہلاک آمد۔ آیا سخت باید در حسرت است و نجات ایں کشتی از طوفان و غرق آب کوشند بادر مقام دو نیت و اختلاف کلمہ و پیروی اغراض و نظریات شخصی برآمدہ خرابی و ہلاکی یک دیگر را ساعی باشند.....“

پھر مرزا بیان کرتے ہیں کہ - ۵۰۰ خطوط عربی ہندی فارسی اور ترکی زبانوں میں ایران ہندوستان الجزائر مصر طرابلس شام حجاز اور تمام اسلامی ممالک کو بھیج گئے اور شیخ نے یہ تجویز پیش کی کہ چھ رایے اشخاص جو غیر زبانوں سے واقف ہوں ممالک اسلامی کا دورہ کریں۔ بہت سے خطوط کے جوابات وصول ہوئے اور شیخ نے ان کو سلطان کی خدمت میں پیش کیا۔ عبد الحمید بہت مسرور ہوا لیکن ناصر الدین کو جب اس خط و کتابت کی اطلاع ہوئی تو وہ بہت متردد ہوا اور اُس نے اپنے سفیر متعینہ اسلامبول کو ہدایت کی کہ کسی طرح شیخ اور اُن کے شرکائے کار کو گرفتار کر کے ایران بھجوا دیا جائے۔ ایرانی سفیر محمود علی علا الملک نے مدیر نظمیہ محمود پاشا سے ساز باز کر کے یہ طر کیا کہ اگر اُن لوگوں کو گرفتار کر دیا جائے تو شاہ ایران وزیر مذکور کو اعزاز اور منصب سے سرفراز کرے گا اور اُن اشخاص کے بدلہ میں اُن تمام ارمنی باغیوں کو جو ترکی سے بھاگ کر ایران چلے گئے تھے گرفتار کر کے حکومت ترکیہ کے حوالہ کر دے گا۔ چنانچہ مرزا آگے چل کر اس سازش کے نتائج کا اس طرح ذکر کرتا ہوں کہ -

"جب ایرانی سفیر نے وزیرِ نظمیہ سے سازش کر کے سلطان کا حکم اُن اشخاص کی گرفتاری کے لیے حاصل کر لیا اور وہ لوگ گرفتار کر کے ایران روانہ کر دیے گئے تو شیخ کو اس واقعہ کی خبر ہوئی۔ شیخ فوراً سلطان کے پاس گئے اور کہا کہ یہ لوگ وہ ہیں جو میرے ساتھ تحریکِ اتحادِ اسلامی میں کام کر رہے ہیں۔ سلطان کو بہت افسوس ہوا کہ بے خبری میں وہ ایسا حکم دے بیٹھے اور اُس وقت کوشش کی گئی کہ قیدیوں کو واپس لیا جائے۔ لیکن سفیرِ ایران نے محل میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اب اگر حکم منسوخ کر کے اُن لوگوں کو واپس لیا جائے گا تو حکومتِ ایران کی سخت توہین ہوگی اس لیے اس وقت قیدیوں کو واپس نہ لیا جائے مگر وعدہ کیا کہ چند روز بعد یہ لوگ ایران سے واپس بھیج دیئے جائیں گے۔ بہر حال وہ سب لوگ ایران پہنچے اور وہاں فوراً تبریز میں قتل کر ڈالے گئے۔ شیخ کو اس واقعہ کا بہت ہی صدمہ ہوا اور وہ سلطان سے بھی کبیدہ خاطر رہنے لگے۔ چنانچہ جب رومی کے بھائی نے پھر ایک دفعہ شیخ سے جا کر کہا کہ وہ رومی کی جان بچانے کی کوشش کریں اور ایک دفعہ سلطان سے کہیں تو شیخ نے کہا کہ۔

"اگر بغرض پسر ابہ قتل گاہ برندہ از یک شفاعت من نجات یابد
 تن بہ کشتن می دہم اما عار تقاضائے از عبد الحمید را دیگر بر خود نمی بندم"
 غالباً اسی واقعہ کے بعد سے سلطان اور شیخ کے درمیان ناچاقی شروع ہوئی اور پھر کبھی صفائیِ قلب پیدا نہ ہو سکی۔ ایک دوسرے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہِ ایران نے شیخ کو گرفتار کرانے کی بھی سخت کوشش کی تھی مگر اس پر سلطان کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ یہ امر بالکل



سلطان عبدالحمید

قرین قیاس ہو کہ ناصر الدین شاہ کے قتل نے عبدالحمید کو بھی بہت خائف کر دیا تھا اور غالباً وہ سمجھتے تھے کہ یہ واقعہ شیخ کے اثرات کا ایک ثبوت ہو۔ اس لیے وہ ڈرتے بھی تھے مگر شیخ سے اپنے مقاصد بھی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ گرفتاری کے واقعہ کے بعد سے وہ مطمئن نہ تھے لیکن شیخ اور سلطان کے ظاہری تعلقات پھر بھی بہت خوشگوار تھے اور اُس کی بہت سی معتبر شہادتیں موجود ہیں۔ چنانچہ اس زمانہ کے حالات پر بلنٹ کے بیانات بہت کچھ روشنی ڈالتے ہیں۔ انقلاب ایران میں براون نے بلنٹ کا ایک بیان درج کیا ہے۔

”میں نے قسطنطنیہ میں اُن کو سلطان کا خاص مقبول و منظور پایا وہ نشان طاش کے مسافر خانہ میں مقیم تھے جو یلدریم کی باغ کی دیوار سے ملا ہوا ہے جب میں پہلی دفعہ اُن سے ملا..... تو مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ جن کمروں میں وہ ٹھہرے ہوئے تھے وہ بہت خوبصورت تھے اور ان کے گرد بہت سے علما اور فضلاء بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ اُسٹے اور میرے دونوں رخساروں پر ہوسہ دیا..... اور مجھے چائے اور کافی پلائی اور عربی اور فارسی زبان میں مجھ سے بہت سی باتیں کرتے رہے.....“

بلنٹ ۱۸۹۲ء میں قسطنطنیہ گئے تھے اور اپنے روزنامہ میں وہ جا بجا شیخ کا ذکر کرتے ہیں۔

۱۵ اپریل ۱۸۹۲ء:- سلطان جوہر نے سلطان عبدالحمید خاں سے

طلاقات کرنی چاہی۔ سلطان آمادہ نہ تھے مگر شیخ جمال الدین نے کوشش کی۔ جمال الدین خود بھی شاہی دعوت میں شریک تھے..... آج کل

یلدیز میں اُن کا بہت اثر ہے۔۔۔۔۔ انھوں نے محض اپنی صاف گوئی اور جرأت کی وجہ سے سلطان پر اپنا اثر جمایا ہے۔ سلطان نے ہر قسم کے اعزاز انھیں دینے چاہے مگر انھوں نے ہمیشہ انکار کیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۲۶ اپریل کرہ ترکوں سے بھرا ہوا تھا ابراہیم موہلی بھی موجود تھے انھوں نے مجھ سے مصر کے متعلق گفتگو کی۔ میں نے شیخ سے کہا کہ وہ میری سلطان سے ملاقات کرا لیں۔ میں سلطان سے جو ایک بات دریافت کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر برطانوی حکومت وولف کمیشن کی بنیاد پر پھر گفت و شنید کرنا چاہیے تو سلطان بھی آمادہ ہوں گے یا نہیں۔ مگر جمال الدین کی رائے ہو کہ پہلی ملاقات میں اس حد تک گفتگو کا بڑھانا ناممکن ہوگا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

یکم مئی ہم اب انگلستان جاتے ہیں مگر یہ طر ہو گیا ہے کہ جمال الدین اس طرح کارروائی کریں کہ سلطان خود مجھے موسم گرما میں بلا لیں اور شیخ میری بیوی کے لیے تمغہ شفقت حاصل کریں گے۔ اور میں اس عرصہ میں جمال الدین کو خطوط لکھوں گا جو وہ سلطان کو دکھائیں۔ اس وقت تک شاہی دربار میں شیخ کا اقتدار اس قدر زیادہ تھا کہ ایک دفعہ عید بیرام کے موقع پر شیخ کو دربار عام کے دروازہ پر کسی افسر نے روکا۔ شیخ بہت تند مزاج آدمی تھے اور اتنی سی بات کو بھی گوارا نہ کر سکتے تھے۔ اُن کو سخت غصہ آیا اور کہنے لگے کہ بحیثیت عالم اور تہذیب کے میرا درجہ کسی سے کم نہیں ہے اور یہ کہ کر دربار میں گھس گئے۔ سلطان نے اس واقعہ کو دُور سے دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ شیخ کو بلا کر اپنی کرسی کے پیچھے جگہ دی۔ اُس

زمانہ میں شاہی دربار کے موقعہ پر القاب شاہانہ کا ایسا مظاہرہ عجیب و غریب سمجھا جاتا تھا۔ شیخ کی تند مزاجی اور سلطان کی نوازش کے متعلق ایک واقعہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہو کہ جب شاہ ایران نے خاص طور پر سلطان سے شکایت کی کہ شیخ قسطنطنیہ میں بیٹھے ہوئے اُس کی تخریب کے درپڑ رہتے ہیں تو سلطان نے شیخ سے کہا کہ ”شاہ ایران آپ سے بہت خائف ہیں اُن کو آپ معاف کیجئے“ اور شیخ نے بہت سختی سے جواب دیا کہ ایسا نہیں ہو سکتا پھر جب سلطان نے بہت اصرار کیا تو بالآخر شیخ نے کہا کہ بہتر ہو میں خلیفہ وقت کے حکم کی تعمیل کرنے کے لیے شاہ کو معاف کرتا ہوں۔ اس قسم کی ایک اور روایت میں نے ایک افغانی فاضل کی زبان سے سنی۔ وہ واقعہ یوں ہو کہ اس زمانہ میں جب کہ بعض سیاسی مصالح کی بنا پر سلطان عبدالحمید خاں چاہتے تھے کہ شیخ اُن کے اشاروں پر کام کریں انھوں نے شیخ کو خوش کرنے کے لیے اُن کی خدمت میں وہ شاہی تمغہ بھیجا جو سوائے وزرا کے کسی کو عنایت نہ ہوتا تھا۔ جس وقت یہ تمغہ لے کر شاہی قاصد شیخ کی صحبت میں حاضر ہوا تو وہ طلبا کو درس دے رہے تھے اور اُن کے پاس ایک بلی بیٹھی ہوئی تھی۔ شیخ نے تمغہ کو اُس کے غلاف سے نکال کر دیکھا اور بلی کے گلے میں ڈال دیا۔ شاہی قاصد کو شیخ کی یہ حرکت بہت ناگوار ہوئی اور اُس نے کہا کہ حضرت! آپ عطائے شاہی کی توہین کر رہے ہیں۔ راوی کہتا ہو کہ شیخ یہ سن کر مسکرائے اور کہنے لگے کہ جن لوگوں کے گلے میں یہ تمغے ڈالے جاتے ہیں وہ عموماً خائن ہوا کرتے ہیں اسی لیے میں نے بلی کو اس اعزاز کا زیادہ

اہل سمجھا ہو! اس قسم کی بہت سی روایتیں مشہور ہیں جو بظاہر مبالغہ سے پاک نہیں تاہم اس میں شک نہیں کہ باوجود شیخ کی تنگ مزاجی کے عرصہ تک سلطان کی نظر میں اُن کا وقار بہت زیادہ رہا اور یہی وجہ تھی کہ سلطان کے مصاحبین میں سے اکثر اُن سے حسد کرنے اور اُن کو زک پہنچانے کی فکر میں رہنے لگے۔

شاہ ایران کے قتل سے چند روز پہلے شیخ کے خلاف دربار میں ایک قوی جماعت تیار ہو گئی تھی۔ جو اس فکر میں رہتی تھی کہ کوئی موقع ملے تو شیخ سے سلطان کو بدگمان کر دیں۔ چنانچہ ایک موقع اس کو مل گیا۔ اسی زمانہ میں خدیو مصر قسطنطنیہ آئے ہوئے تھے سلطان سے کہا گیا کہ شیخ خدیو سے خفیہ طور پر ملاقاتیں کر رہے ہیں اور مشورہ یہ ہو رہا ہے کہ خدیو کو خلیفہ بنایا جائے۔ اس خبر کا سلطان پر بہت بُرا اثر ہوا اور وہ شیخ سے بدظن ہو گئے۔ اس واقعہ کے متعلق کئی بیانات ہمارے سامنے ہیں اول تو ایک جرمن سیاح کا بیان ہے جس نے شیخ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ۔

شیخ نے مجھ سے کہا کہ نوجوان خدیو مصر عباس پاشا پہلی دفعہ قسطنطنیہ آئے ہوئے تھے وہ مجھے لٹا چاہتے تھے مگر سلطان کا فضا نہ تھا۔ لیکن خدا جانے کس نے خدیو سے کہہ دیا کہ میں ہر شام کو کاغذ خانہ پر بیٹھتا ہوں۔ خدیو ایک دن وہاں اس طرح پہنچ گئے کہ گویا اتفاقاً آ گئے ہیں۔ میری طرف آئے اپنا مجھ سے تعارف کرایا اور کوئی پندرہ منٹ تک مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ اس کی خبر

سلطان کو ہوئی اور اُن کو بتایا گیا کہ ملاقاتِ اتفاقیہ نہ تھی بلکہ پہلے سے اس کا انتظام کیا گیا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا کہ دورانِ گفتگو میں نے خدیو سے کہا کہ وہی سچے خلیفہ ہو سکتے ہیں۔ مگر اس وقت تک سلطان اس قسم کی سازشوں سے متاثر نہ ہوا کرتے تھے۔“

اس بیان کی تصدیق ایک دوسرے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ ”سید صاحب کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ مصر کے مشہور ادیب عبداللہ ندیم کی صحبت میں وہ کاغذ خانہ کے پارک میں تفریح کر رہے تھے۔ وہاں اتفاقاً عباس حلمی پاشا خدیو مصر سے اُن کی ملاقات ہو گئی۔ تینوں نے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر پندرہ منٹ باتیں کیں۔ کہا جاتا ہے کہ ابو الہدیٰ نے سلطان تک یہ خبر پہنچائی کہ عبداللہ خدیم اور شیخ نے کاغذ خانہ کے پارک میں خدیو سے ملنے کا انتظام کیا اور دونوں نے قول و قرار کئے۔“

عبدالحمید جیسے شکی اور دہمی مزاج آدمی کو بھڑکانے کے لیے یہ خبر کچھ کم نہ تھی چنانچہ چند روز تک شیخ پر پولیس کی نگرانی رہنے لگی۔ لیکن بعد میں پھر معاملات صاف ہو گئے۔ البتہ سلطان کی اس بدگمانی نے شیخ کو بہت بدل کر دیا اور یہ دیکھ کر کہ تحریکِ خلافت کی آڑ میں عبدالحمید محض اپنے ذاتی مقاصد حاصل کرنے کی فکر کر رہا ہے شیخ اور بھی زیادہ آزرده خاطر ہو گئے۔ اسی زمانہ میں نوجوان ترکوں کی طرف سے مشروطہ کا مطالبہ بھر شمع ہو گیا۔ اور دارالخلافہ میں ۳۰ ہزار خفیہ پولیس محض ”سیاسی“ اشخاص کی نگرانی کے لیے

مقرر کر دی گئی۔ اسی کے ساتھ ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ -

”سید عبداللہ خادم مدینہ منورہ بہت غیر معمولی طور پر ذی حمت تھے اور اُن سے ایک دفعہ دلی عہد عثمانیہ سے جھگڑا ہو گیا۔ وہ جھگڑے کے بعد جمال الدین کے پاس چلے آئے جب گرفتاری کے لیے اُن کی تلاش شروع ہوئی تو شیخ نے اُن کو حوالہ کرنے سے انکار کر دیا۔ بلکہ جس وقت خدیو مصر قسطنطنیہ سے جانے لگے تو اُن کے سپرد کر دیا اور وہ سید عبداللہ کو اپنے ساتھ قاہرہ لے گئے“ ۷

اس واقعہ نے شیخ کے مخالفین کو سلطان کو بھڑکا دینے کا ایک اور موقعہ دیا۔ حالات کو دیکھ کر شیخ نے بھی پھر لندن جانے کی اجازت چاہی لیکن سلطان جانتے تھے کہ جس طرح ایران سے نکل کر شیخ نے لندن میں شاہ ایران کے خلاف ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا اسی طرح وہ ترکی کے متعلق بھی اپنے قلم اور زبان سے کام لیں گے اور پھر معاملات سنبھالے نہ سنبھل سکیں گے۔ اس لیے ترکی میں شیخ معزز مہمان کی طرح بلائے گئے اور خطرناک قیدی کی طرح بند کر لیے گئے۔ اُن کا سب سے بڑا مخالف سلطان کا سب سے بڑا پیر اور ندیم اور مصاحب ابوالہدی تھا۔ اس شخص کے متعلق شیخ کے جذبات بھی بہت قوی تھے اور بقول سعید پار اس -

”سلطان عبدالحمید کے پیر شیخ ابوالہدی سے سید کو اول ہی دن سے نفرت تھی وہ ہمیشہ اُس کو شیطان کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک دن سلطان کے سامنے بھی اُس کو اسی نام سے

یاد کیا۔ سلطان نے کئی دفعہ کوشش کی کہ شیخ ان کے پیر سے صلح کر لیں لیکن انہوں نے ہمیشہ سختی کے ساتھ انکار کیا۔ ایک دن سلطان نے اپنے اے۔ ڈی۔ سی منیر پاشا کو شیخ کے پاس بھیجا اور حکم دیا کہ شیخ سے کہو کہ ابوالہدیٰ سے صلح کر لیں اس لیے کہ دونوں کی شکر رنجی ہمارے لیے تکلیف دہ ہے۔ سید صاحب یہ سن کر بہت برہم ہوئے اور فرمایا کہ جا کر کہہ دو کہ اگر جبریل آکر میرا دروازہ کھٹکھٹائیں اور جب میں دروازہ کھولوں تو اپنے پر میرے سر پر ہلائیں اور کہیں کہ رب السموات نے مجھے بھیجا ہے اور کہا ہے کہ جمال الدین ابوالہدیٰ سے صلح کرے تو بھی میں یہی کہوں گا کہ میں اس شیطان سے صلح نہیں کر سکتا۔ پھر تباؤ تمہارے سلطان کی کیا بساط ہے....“

شیخ کی تند مزاجی اور تیز گفتاری ہمیشہ ان کی مشکلات میں اضافہ کرتی رہتی تھی۔ اور ان کے دشمنوں کو ان کے خلاف لوگوں کو بدگمان کرنے کے بہت اچھے موقع مل جاتے تھے۔ اُسی زمانہ میں بقول سعید پارس ابوالہدیٰ نے شیخ کے خلاف ایک رسالہ شایع کیا۔

”جس میں اُس نے سید فضل علوی شیخ طاہر مدنی طرابلسی۔ شیخ طریقت شاذلی اور سید جمال الدین افغانی پر حملے کئے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس منشور میں سید صاحب پر الحاد و فساد اعتقادات کی تہمت لگائی گئی تھی۔ سید صاحب نے ایک دفعہ مجھ سے فرمایا تھا ”کہ بندرلو کے درختوں کے اطراف میں میں اس طرح جھک لگاتا ہوں جس طرح حاجی لوگ کعبہ کا طواف کرتے ہیں۔“

یہ جگہ ایک تفریح گاہ ہر جہاں پانی کے بند بندھے ہوئے ہیں۔ اور باغات ہیں۔ جمال الدین کے متعلق کہا جا سکتا ہو کہ انھوں نے اپنے ایک خیال کو شاعرانہ انداز میں ظاہر کیا مگر اسی طرح کی شاعرانہ گفتگو کو ابوالہدیٰ نے الحاد اور کفر سے تعبیر کیا.....“

شیخ کے خلاف اس قسم کے تمام اسباب جمع ہوتے رہے اور ناصر الدین شاہ کے قتل نے عبد الحمید کے رہے رہے حواس گم کر دیے۔ غالباً سلطان کو یہ محسوس ہوا کہ اگر جمال الدین کا ذاتی وقار اس قدر زیادہ ہو کہ اُن کے معتقدین بادشاہوں پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت کر سکتے ہیں تو پھر اُن کا وجود بلاشبہ خطرناک ہو۔ یہ بات ہزار ہاتھتوں اور سازشوں سے زیادہ موثر تھی۔ اور اُسی وقت سے شیخ قسطنطنیہ میں شاہی مہمان کے بجائے شاہی قیدی بنادیے گئے۔ وہ پولیس اور جاسوسوں کی سخت نگرانی کے ماتحت زندگی بسر کرنے لگے۔ چنانچہ بلنٹ جب اُن سے آخری دفعہ قسطنطنیہ میں ملے تو انھوں نے شیخ کو بہت افسردہ خاطر پایا۔

”پھر جب میں دوبارہ قسطنطنیہ گیا تو اُن سے ملا انھوں نے بلدیہ کی عجیب دنیا میں اپنی پوزیشن مجھے بتائی۔ جہاں وہ آدھے مہمان اور آدھے قیدی کی طرح رہتے تھے۔ وہ اُس وقت اس حالت میں بھی خوش تھے۔ اُن کے لبوں پر تو مہر نہ تھی وہ ہمیشہ بہت صاف صاف باتیں کیا کرتے تھے۔ اور یہ اُن کی عادت تھی.....“

نگرانی اور قید کے شدید آخر زمانہ میں اور بھی زیادہ ہو گئے تھے

لیکن شیخ کی زبان اُس وقت بھی بے تکان چلتی تھی۔ جو جی میں آتا تھا کہتے تھے اور سلطانی جاسوس اُن کی تمام گفتگو سلطان تک روزانہ پہنچاتے تھے جس کو سن سن کر سلطان اور زیادہ خوف زدہ ہوتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ شیخ کے آخری عمر کے ان مصائب کا بڑا باعث شیخ کی تنک مزاجی اور صاف گوئی تھی۔ اس زمانہ کی حالت شیخ کے شاگرد برہان الدین جو اکثر نظر بندی کی حالت میں بھی حاضر رہتے تھے اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:

”چون در اسلامبول اوازش ملت احرار کہ از ظلم و استبداد او (سلطان) می نالیدند شنیدند بالطبع بہ ہیجان آمدند۔ بنابر علیہ نظر بہ ضرب المثل مشہور کہ “راست گو را در شہر نمی گزارند” از طرف مامورین خفیہ سلطان عبدالحمید خاں زیر سانسور و سنسور و تعقیبات گرفتہ شدند تا ایں کہ بہ علامہ مشہور افغان در اقامت گاہ شان نشان طاش تمانا زیر تعقیبات گرفتہ شدند۔ فقط من با وجود ہر قسم ممانعت و مشکلات و تعقیبات حکومت ہر وقت بحضور شان مشرف گردیدہ و عرض تسلیت می نمودم“۔

مرض الموت و وفات و تدفین | نظر بندی اور پریشانی کی اس حالت میں شیخ مرض سرطان میں مبتلا ہوئے ڈاکٹر جمیل پاشا اُن کے معالج تھے۔ اول شیخ کے چھو دانت نکال دیئے گئے اُس کے بعد مرض پھر زور پکڑ جاتا تھا۔ اس حالت میں شیخ نے علاج کی غرض سے

۷۰ درجیدہ ”متر“ ترکی۔ ۷۱ جمیل پاشا بعد کو خلیفہ عبدالحمید کے اسسٹنٹ سکرٹری ہو گئے تھے اوچھو سال پہلے
 دہلی میں بقیہ نام برقمیم تھے جہاں میں اُن سے شیخ کی بیماری کے حالات معلوم کرنے کے لیے ملا تھا۔

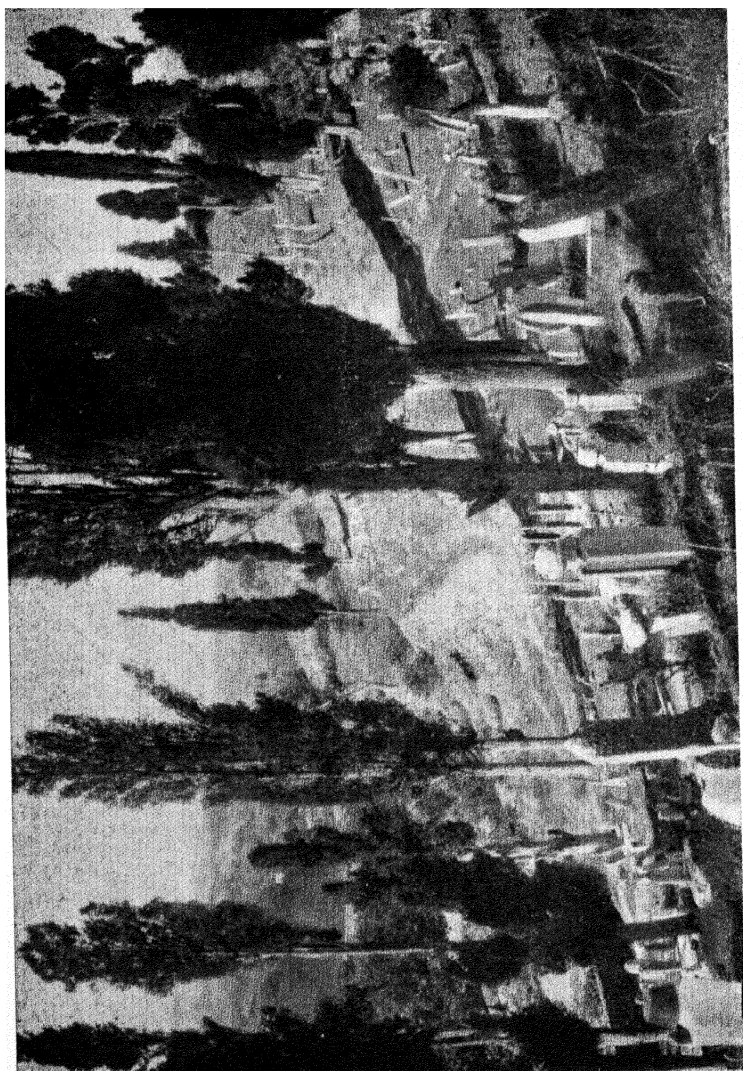
دینا جانے کی اجازت طلب کی مگر سلطان نے اجازت نہیں دی۔ آخر چند روز مرض کی تکلیفیں برداشت کر کے ۹ مارچ ۱۹۷۷ء کو انتقال فرمایا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ شیخ کی عمر سن عیسوی کے حساب سے ۸۵ سال اور سن ہجری کے حساب سے ۶۰ سال ہوئی۔

”مشاہیر الشرق“ کے صفحہ ۹۵ پر شیخ کی ایک تصویر شایع ہوئی ہے جس میں وہ بحالتِ مرض بستر پر بیٹھے ہوئے ہیں گود میں ایک کتاب رکھی ہے ہاتھ میں تبیغ ہرسلے New York herald کا ایک پرچہ پڑا ہوا ہے اور بستر کے پاس ایک میز پر ہاتھی کا ایک مجسمہ رکھا ہوا ہے۔ آخری وقت بھی اُن کے گرد و پیش جو چیز تھی وہ اُن کی گزری ہوئی زندگی کا ایک عکس تھی۔

قبرستان شیوخ (شیخ لرمزاری) محلہ ماچھا میں دفن کیے گئے جنازہ ایک بیان کے مطابق بہت تزک و احتشام کے ساتھ اور ایک بیان کے مطابق بہت خاموشی سے صرف چند اشخاص کے کندھوں پر اٹھایا گیا۔ اور اس طرح وہ اپنی آخری منزل پر سپرد خاک کر دیے گئے۔ سدا رہے نام اللہ کا۔

عبد الحمید کے انتقام پسند اور ضدی طبیعت کو دیکھتے ہوئے اُسی زمانہ میں یہ خبر اُڑی تھی کہ شیخ کو زہر دلوایا گیا۔ بعض ایرانی سوانح نگار تو صاف صاف کہتے ہیں کہ ایسا ہوا۔ لیکن ترک اس سے انکار کرتے ہیں اور جمیل پاشا نے مجھ سے کہا کہ یہ خبر محض بدگمانی پر مبنی ہے۔ حسن صابری شیخ کے ایک مرید خاص کہتے ہیں کہ زہر دیا گیا۔ مرزا لطف اللہ کا بھی یہی خیال ہے۔ بلٹ تو بالکل

آخری آرامگاہ



صاف صاف کہتے ہیں کہ
 "میں اس امر پر یقین کرنے پر آمادہ ہوں کہ ان کی مہلک
 بیماری زہر کا نتیجہ تھی۔ اُن کے دشمن بہت تھے اور اُن کا وجود
 عبد الحمید کے لیے عذابِ جان ہو گیا تھا۔"
 مرزا لطف اللہ بھی یقین کے ساتھ اس واقعہ کے تفصیلات
 بیان کرتے ہیں۔

"مسموم نمودن آن سید بزرگوار ہم صحیح است
 ناصر الملک برائے قتل و جلب آن سید و حکم وحید منتخب و مامور
 شد۔ اذین کہ دولتِ ترکیہ سید را تسلیم نمود و سفیر ایران و
 مامور مخصوص کہ از ایران برائے اس کار رفته بود ہمراہ و متفق
 می شوند و در سال ۱۳۱۴ ہجری قمری آن سید منظلوم معصوم
 غریب و حید را مانند اجداد کبارش بہ شربت ناگوار سم قتل شہید
 نمودند۔"

مگر لطف اللہ قتل کی ذمہ داری سلطان کے بجائے حکومتِ
 ایران پر رکھتے ہیں۔

آقا مرزا حسین دانش کا خیال ہے کہ اپرلین کے بعد زہر پیدا
 ہو گیا۔۔۔۔۔

"سید گرفتار سرطلنے در دھان شد و در انجام قطع آن سرطان
 از طرف دایان ترک داگراشت میگویند کہ سید در ہنگام مرض اذن
 رفتن بہ ارد پا برائے مداورت از سلطان طلبید و لے نتوانست گرفت
 برنے نیز می گویند کہ در ہنگام اجرائے عمل جراحی در دھن مسموم

گردید و نیز گویند کہ در دم واپس جز یک خادم صادق نصرانی کے دربتش بنود و در آغوش او جاں بجاں بخش داد و در بشک طاش در حظیرہ "یکمینی افندی درگا ہی" سخاک سپردہ شدہ رحمۃ اللہ علیہ و غفرانہ"

پروفیسر براون نے بھی اس مسئلہ پر بحث کی ہے مگر اپنی کوئی رائے ظاہر نہیں کی صرف "العلم عند اللہ" کہ مگر خاموش ہو گئے۔

اگر ہم عبد الحمید کے سیاسی رویہ کو پیش نظر رکھیں اور یہ بھی یاد رکھیں کہ اس کے عہد میں مدحت پاشا کی طرح کتنے نامور اشخاص سیاسی اختلاف کی بنا پر قتل ہوئے تو شیخ کے قتل میں بھی شبہ کی گنجائش کم رہ جاتی ہے۔ ابو سعید العربی نے بھی اخبار جہان اسلام میں صاف صاف لکھا تھا کہ۔

"سلطان سید کی آزاد خیالی سے خوف زدہ ہو گیا تھا اور ان کی بیماری کی وجہ سے گھبراتا تھا۔ سید کو خلاا کرنے کی بہت عادت تھی سلطان نے بہت سے غلاا بھیجے۔ جن میں زہر لگا ہوا تھا شیخ ان غلاا کو استعمال کرنے کے بعد بیمار ہو گئے۔ نیچے کا جبڑا سڑ گیا اور اسی مرض میں انتقال ہوا لیکن مشہور یہ کیا گیا کہ سرطان ہو گیا۔"

سید علی خاں نے اخبار وطن قسطنطنیہ میں اس خبر کے ہر پہلو پر بحث کر کے اپنا خیال صرف اتنا ہی ظاہر کیا ہے کہ "دربارہ مسموم کردن او دلائل قطعی نیست"

اس قسم کے کسی معاملہ میں جن کا تعلق ایک سلطنت اور بادشاہ کی پالیسی سے ہو "دلائل قطعی" کا حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ قراین عبد الحمید خاں کے خلاف ہیں لیکن ایک وقایع نگار پروفیسر براون کی طرح سوائے اس کے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ "العلم عند اللہ" شیخ کے انتقال کے بعد ہی اُن کے سیکرٹری جارچی بے کو گرفتار کر لیا گیا اور شیخ کے تمام کاغذات بحق حکومت ضبط ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ شیخ کے انتقال سے چند روز پیشتر کسی رؤسی وزیر نے بھی شیخ کے بعض اہم سیاسی خطوط عبد الحمید کے حوالہ کر دیئے تھے۔ جارچی بے تو بعد میں رہا کر دیئے گئے لیکن شیخ کے کاغذات ہمیشہ کے لیے ناپید ہو گئے۔ آج اُن کاغذات میں سے چند بھی ہمارے ہاتھ آتے تو معلوم نہیں اس سوانح عمری کی تاریخی حیثیت کس قدر اہم ہو جاتی۔

شیخ کی قبر عرصہ تک بے نام و نشان رہی لیکن ۱۹۱۹ء یا ۱۹۲۰ء میں ایک امریکن نے اُس کو پہنچ کر ادا کیا شیخ کے شاگرد محمد برہان الدین بلخی نے اس واقعہ کو جریدہ ملت ترکی میں بیان کیا ہے۔

"تخمیناً یک و نیم سال پیش میں محب تورک مسٹر چالیس کرین امریکائی کہ از سیاحت و تبعات علمیہ خود از حوالی ترکستان بلخ مزار شریف جارجوی و سمرقند فراغت یافتہ بہ اسلامبول آمد بامشارالہ اشنا شدم۔ روزے یکے دوستانم مدیر سابق "سیر و سفین" عمومی حسین بک آمدہ بمن گفت کہ اس مستشرق امریکائی می خواہد کہ باشما

ملاقات کند بنا بران با حسین بک برائے ملاقات او بہ ہوتل
 "بار لا پالاس" رفتہ در اثنائے ملاقات راجح بہ علم وفن حضرت
 استاد سید جمال الدین افغانی بحث کردہ در ضمن ملاقات از
 من خواہش کرد کہ مدفون حضرت استاد بہ او نشان بدہم در عین
 آن روز بعد از فراغ ملاقات برابر بہ مزارستان شیوخ اسلامیہ
 بجلد ما چہارفتہ قبر ایشان را برائے مسٹر چارلس کرین امریکائی نشان
 دادم مثلاً ایہ بمن گفت کہ قبر ایں عالم بزرگ اسلام را خود من
 تعمیر خواہم کرد۔ چنڈے بار مدیر خلیل بک بمن گفت کہ قبر حضرت
 استاد را مسٹر کرین امریکائی بہ اصول درستی انشا و تعمیر کردہ است۔

اسی زمانہ میں ایک قوم پرست ترک نے ترکی اخبارات
 میں شیخ کی قبر کے متعلق ایک مضمون لکھا تھا اُس کے چند الفاظ
 اس لیے نقل کیئے جاتے ہیں کہ اُن سے شیخ کے متعلق ترکوں
 کی نئی نسل کے احساسات کا اندازہ ہوتا ہے۔

"اس بڑے مسلمان عالم کے لیے امریکن مسٹر کرین نے نہایت
 شاندار سنگ مرمر کا مزار بنایا ہے۔ یہ امریکن کروڑ پتی ہمیشہ مسلمان دوست
 اور محب ترک رہا ہے۔ مگر اُس کی تازہ ترین قدر شناسی نے نہ معلوم
 کیوں میرے دل میں حسرت اور افسوس سے ملا ہوا ایک جذبہ
 پیدا کیا۔ جمال الدین کا ایک محتشم و شاندار مزار بنایا جانا درحقیقت
 ایک ایسا کام ہے جس سے روح انسانی پاتی ہے۔ جمال الدین اپنی تمام
 زندگی میں دنیوی جاہ جلال سے بے پردا رہا اور اپنی وضع کے

لیکن ایک بات پر غور کیجئے جمال الدین افغانی اور ایک امریکن میں کس قدر فاصلہ ہے۔ دین کا فاصلہ۔ زبان کا فاصلہ۔ حیات کا فاصلہ۔ محیط و ماحول اور اُن کے بے پایان تاثرات کا فاصلہ اُن میں سے ہر ایک ایک لمبی منزل ہے جو مسٹر کرین کو جمال الدین سے دُور رکھتی مگر مسٹر کرین نے اِن سب مسافتوں کو طے کیا اور جس محترم کو ہم سب بھول گئے تھے اُس کا مزار بنایا۔.....

میں اس خیال سے تو خوش ہوں کہ جمال الدین کا مزار اس کی مادی یادگار ہوگا مگر میرے قلب کے ایک گہرے اور مغرور گوشہ میں ایک خفیف سی ٹھیس لگی ہے اور میرا دل سوال کرتا ہے کہ جمال الدین کے مزار کو ایک ترک یا ایک افغان یا ایک ایرانی نے جس کو جمال الدین کے ایرانی ہونے پر بہت اصرار رہتا ہے کیوں نہ تعمیر کرایا.....“

شیخ کی زندگی کی داستان پیدائش سے قبر اور طلوع سے غروب تک ختم ہوتی ہے دنیا کا حافظہ بہت کمزور ہے۔ وہ بہت جلد بھول جاتی ہے۔ پیغمبروں کو بھول جاتی ہے۔ بڑے بڑے سر بلند بادشاہوں کو بھول جاتی ہے۔ جمال الدین کو اگر بھول گئی تو تعجب کیا ہے۔ اب

اُن کی خاک پر سنگ مرمر کا جو خول چڑھایا گیا ہے تو کیا یہ مرمر میں غلاف اُن کی اُن یادگاروں اور اُن کی زندگی کے اُن نقوش کے مقابلہ میں جو تاریخِ عالم کے صفحات پر ثبت ہیں اہل نظر کے لیے کچھ زیادہ اہمیت رکھ سکتا ہے؟

اپنی نظر بندی کے زمانہ میں شیخ نے اپنے ایک ایرانی دوست کو ایک خط لکھا تھا جو غالباً اُن کا آخری خط تھا۔ یہ خط اُن کے نفس کی کیفیات اور اُن کے بلند ارادوں اور اُن کے اسلامی جذبات و افکار کا ایک مجملہ آئینہ ہے۔ اس خط میں جو اُن کے افکار عالیہ کا آخری مظاہرہ ہے اُن کے الفاظ ایک آخری وصیت کا وزن رکھتے ہیں۔

”بر سر این موقع نامہ را بہ دوست عزیز خودی نویسم کہ در محبسِ محبوس داند ملاقاتِ دوستانِ خود محروم۔ نہ انتظارِ نجاتِ دام نہ امیدِ حیاتِ نسیم، نہ از گرفتاریِ حیران و کشتہ شدن متوحش۔ خوشم بہ صس و خوشم بر این کشتہ شدن مجوم برائے آزادیِ نوع، کشتہ می شوم برائے زندگیِ قوم، دے افسوس می خورم ازین کہ آرزوے کہ داشتم کا ملا نایل نہ گردیدم و شمشیرِ شقاوت نہ گذاشت کہ بیداری عملِ مشرق را بنیم۔ دستِ جہالتِ فرصت نہ داد کہ صدائے آزادی از حلقومِ مشرق بشنوم۔ لے کاش من تمامِ تخمِ افکارِ خود در مزرعِ مستعدِ افکارِ ملت کاشته بودم چه خوش بود کہ تخمِ ہائے بارور خود در زمینِ مشحورہ زادِ سلطنتِ فاسد نمی نمودم۔ انجہ در آں مزرعہ کاشتم بہ نمونہ رسید و ہر چه دریں زمین کویرِ غرس نمودم فاسد گردید۔ دریں مدت ہمچک از تکالیفِ خیر خواہانہ من بگوش

سلاطین مشرق فرد نہ رفت ، ہمہ را شہوت و جہالت مانع از قبول گشت ۔ امید داری ہا بہ ایرانم بو دند ۔ اجر ز حاتم را بقراش غضب حوالہ کردند بہ ہزاران وعدہ وعید بہ ترکیہ احضام کردند ایں نوع مفعول و مقہوم نمودند غافل ازیں کہ انہد ام نیت نمی شود صنہ روزگار صرف حق را ضبط می کند بارے من ازیں دوست گرامی خود خواہشمندم ، ایں آخرین نامہ را بنظر دوستان عزیز ہم مسلکہائے ایرانی من بہ رسانید و زبانی بہ آن ہا بگویند کہ شما میوہ رسیدہ ایران ہستید ۔ برائے بیداری ایران دامن ہمت بہ کمزردہ آئید ۔ از جس و قتال نہ ترسید ۔ از جہالت ایران خستہ نہ شوید از حرکات مذہبوانہ سلاطین متوحش نہ گردید ۔ با نہایت سرعت بکوشید ، بکمال چالاکی کوشش کنید ۔ طبعیت بہ شما یار است و طبعیت مددگار ۔ یل تجدد بہ سرعت بہ طرف مشرق جابری است بنیاد حکومت مطلقہ منہدم شدنی است ، شما ہامی توانید در خرابی حکومت مطلقہ بکوشید
موانع را کہ میان الفت شما و سایر عمل واقع شدہ رفع نماید
اس خط کے اختصار و اجمال میں شیخ نے اپنی زندگی کے فلسفہ کی پوری تشریح و توضیح کر دی ہے ۔ یہ اُن کی آخری وصیت آخری پیام ، آخری آواز ، اہل نظر کے دلوں میں آج بھی
چالیس برس بعد گونج رہی ہے ۔ سُننے والے اُس کو سُن رہے ہیں اور ”یل تجدید“ کے ساتھ بڑھنے والے بڑھے چلے جا رہے ہیں ۔ شمع گل ہو چکی مگر اُس کا نور باقی ہے ۔ سبب

ہنگامہ محفلِ موجِ خواب ابد ہر گھر وہ محفلِ قائم ہے۔

”انعام صاحبِ نیت اسبابِ انعام نیت نمی شود“

یہی وہ یقینِ محکم تھا جو پہاڑوں کی چوٹیوں پر اور سمندر کی
موجوں میں جمالِ الدین کو سرفراز لے گیا۔

جسدِ فانی فنا ہو چکا مگر اس کی رُوحِ زندہ ہے۔

اقوال

- (۱) "لا صداقة الا بائتمام المشرب ولا قرابة الا لوجهات المارب"^۱
 (۲) "من در جوانی شعری سرودم ولیکن در بزرگی به ترکش گفتم"^۲
 (۳) "الدنيا لعب هر که برد برد و هر که باخت باخت"^۳
 (۴) "انعدام صاحب نیت اسباب انعدام نیت نمی شود"^۴
 (۵) "دو نوع فلسفه در دنیا هست یک آنکه هیچ چیز در دنیا مال بانیست و قناعت به یک لقمه باید کرد و دیگر آن که همه چیز با خوب و مرغوب دنیا مال ماست و باید مال ما باشد - این دومی خوب است - این دومی را باید شعار خود ساخت نه اولی را که با بشریت نمی ورزد"^۵

۱- از مکتوب شیخ نیام آقائے طباطبائی - ۲- روایت از مرزا الطف الله: سید جمال الدین در افکار و اطوار چنان تند و صلابت بود که طبع جوان و آتشش بیشتر بایل به مطالب حقیقی سیاسی و مجادلات علمی شفاف یا قلمی بود و چندان با موضوعات باریک ادبی سازش نداشت - و شاعری را کمتر از پایه خود انگاشت و اغلب می گفت من در جوانی شعری سرودم ولیکن در بزرگی به ترکش گفتم - ۳- روایت از مرزا الطف الله ۴- از مکتوب شیخ به یکے از دوستان خود مندرجه باب آخر -

۵- روایت از آقا مرزا خاں دانش -

(۶) ”جو انسان را ادب زیب و زیور کمال است معہذا نہ باید بدین
اکتفا نمود۔ چنان قناعت بعدی از درجات کمال باوصف این
کہ اور را حد و پایا نے نیست از دون ہمتی و پست فطرتی است۔“ ۱۰
(۷) ”میں کتابیں لکھتا نہیں۔ میں زندہ کتابیں تصنیف کر رہا ہوں۔“
(۸) اگر کوئی شخص اپنے حق میں نیکی کرنا چاہتا ہے تو یہ مشکل ہے
لیکن اگر وہ اپنے ملک کی خدمت کرنا چاہتا ہے تو اس کو اپنی ذاتی
خواہشات قربان کرنی ہوں گی۔ ۱۱

(۹) ”در موضوع انحطاط مسلمین شکوہ از او روپیان خطا است۔ و خرابی
حال مسلمانان از اخلاط فاسدہ درونی خود مسلمانان است۔“

(۱۰) ”حق وہ ہے جو دلیل و برہان رکھے۔“ ۱۲

(۱۱) ”شیرجہاں جاتا ہے اپنے لیے غذا مہیا کر لیتا ہے۔“ ۱۳
(۱۲) چند اشعار جو شیخ اکثر پڑھا کرتے تھے (بقول مرزا لطف اللہ)
نخستیں بادہ کندر جام کردند ز چشم مست ساقی دام کردند
چو خود کردند ستر خوشین فاش عراقی را چرا بد نام کردند

باز سخن پریم یک حرف مراد است۔ ویران نشود عالم تا میکدہ آباد۔

۱۴ روایت از مرزا لطف اللہ خاں ۱۵ روایت از علامہ رشید رضا، کہ جب شیخ مصر سے
جاء ہے تھے تو شاگردوں میں سے کسی نے کہا کہ اپنی یادگار کوئی کتاب تصنیف کیجیے۔ اُس
کے جواب میں یہ نفرہ فرمایا تھا۔ ۱۶ روایت از مرزا لطف اللہ ۱۷ از یک خطبہ در مجلس طہنی مصر۔ ۱۸ مصر
سے غلاب البلد ہوئے تو روانگی کے وقت ایرانی سفیر نے کچھ روپیہ بطور زادہ پیش کیا اُس کو جواب دیا کہ ”مجھ سے
زیادہ تم کو اس چیز کی ضرورت ہے۔ شیرجہاں جاتا ہے اپنے لیے غذا مہیا کر لیتا ہے۔“

یا دل کہ تواند بُرد یا جساں کہ تواند داد
 دل بردن و جاں دادن ایں ہر دو خدا داد است

آسمان رشتک برد بہر زمینے کہ درو۔ یک دو کس بہر خدا یک نفسے بشتند

من آن شوخ طناز رامی شناسم من آن مایہ ناز رامی شناسم
 بگوش من آمد دی آواز پائے من آن صاحب آواز رامی شناسم

اخلاق و اوصاف و عادات و علم و فضل و عقاید مذہبی و سیاسی

شیخ کی زندگی کے تینوں دور بیان کر دینے کے بعد اب اخلاق و عادات و فضائل اور اسی قسم کے جزئیات کا بیان کرنا چنداں ضروری تو نہ تھا لیکن عذر صرف یہ ہے کہ -

”لطیف بود حکایت دراز تر گفتیم“

جس کسی نے گزشتہ اوراق کو بغور پڑھ لیا وہ اب مزید تشریح اور توضیح کا حاجت مند نہیں۔ شیخ کی زندگی خود ایک آئینہ ہے۔ اس لیے صرف دو تین ہی باتیں اور عرض کی جائیں گی -

شیخ کے علم و فضل پر اُن کے سیاسی مشاغل نے ایک پردہ سا ڈال دیا تھا مہتمم عالم ایک سیاسی مدبر کے لباس میں روپوش ہو گیا تھا فضیلت علمی پر اُن کا ذوق سیاست اس قدر چھایا تھا کہ جب تک وہ چار پردے اٹھائے نہ جائیں علم و فضل کے نقطہ نظر سے شیخ کا اعلیٰ مقام عام طور پر نظر نہ آسکتا تھا۔ دنیا نے اُن کی عظیم الشان سیاسی طاقت کو محسوس کیا لیکن سوائے مخصوص شاگردوں کے بہت کم لوگ معلوم کر سکے کہ اُن کا

تجہر علی کنشاعظیم الشان تھا۔ اگر شیخ کی خداداد ذہانت اور زود فہمی تمام تر علمی دنیا میں برسرے کا آتی تو آج اُن کا نام عہدِ قدیم و جدید کے معزز ترین عملا کے ساتھ لیا جاتا اپنے زمانے کے علمائے برحقوں کو حاصل تھا وہ یہ تھا کہ برخلاف دوسرے عملا کے شیخ کا علم عمل سے محروم نہ تھا۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور برخلاف علمائے حاضر کے وہ جدید علوم کے متعلق اپنی معلومات میں ہمیشہ اضافہ کرتے رہتے تھے۔ وہ اس تاریک حجرہ سے باہر آگئے تھے۔ جس میں آج بھی ہمارے علمائے بند پڑے ہیں۔ وہ علمائے جماعت میں اجتہاد کی قوت کے فقدان کو محسوس کرتے تھے۔ اسی لیے وہ قدامت پسند علمائے نظر میں کھٹکتے تھے لیکن اُن کو اس کی پروا نہ تھی۔ سیاست علم اور مذہب ہر میدان میں وہ اپنے لیے طاقتور و مقابل تجویز کرتے تھے اور اُن کی ہمت بلند اپنے سے کم سے مقابلہ کرنے پر کبھی آمادہ نہ ہوتی تھی بقول مرزا حسن خاں دانش "سید ہموارہ خوش می داشت کہ با بزرگ تر از خود بیاد یزدو باقوی از خود بستیزد"۔

براہون نے اُن کی اس ادا کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔
 "خطرہ کے مقابلہ میں جبری اور بہادر صاف گو اور خوش خلق تیز مزاج ہر شخص کے ساتھ خوش اخلاق مگر بڑے لوگوں کے ساتھ بہت آزاد طبع اور بے پروا"
 اب ذرا دوسروں ہی کی زبان سے شیخ کے کچھ اور فضائل بھی سن لیجئے۔

سید رشید رضا یہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ۔
 "ایک دفعہ سید صاحب نے یورپ کی تاریخ پر ایک کتاب کا

مطالعہ شروع کیا کتاب ایک ہزار صفحے کی تھی اور باریک لاطینی حروف میں چھپی ہوئی تھی۔ آٹھ بجے شب کو کتاب شروع کی اور دوسرے دن صبح کے نو بجے تک مسلسل پڑھتے رہے حتیٰ کہ کتاب ختم کر دی۔ انہماک کا یہ عالم تھا کہ پتہ ہی نہ چلا کہ دن نکل آیا ہو جب کبھی اس کتاب کے مضامین پر گفتگو کی یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے حافظ ہیں۔ سید صاحب جو کتاب ایک مرتبہ پڑھ لیتے تھے پھر اُن کو اس کی احتیاج نہ ہوتی تھی۔ دماغ ایسا ہمہ گیر تھا کہ جس فن کی کتاب ایک دفعہ پڑھ لیں اُس کے مضامین اپنے اصلی خد و خال کے ساتھ اُن کے دماغ میں محفوظ ہو جاتے تھے۔“

ابو سعید العربی نے اخبار جہان اسلام میں ایک واقعہ یوں لکھا ہے کہ ”قسطنطنیہ کے زمانہ قیام میں ایک علی اسکیم پر شیخ الاسلام سے گفتگو ہوئی اور اختلاف رائے پیدا ہو گیا سید نے کہا کہ میں تین مہینہ بعد اس اسکیم پر ترکی زبان میں خطبہ دوں گا۔ لوگوں نے اس دعوے پر تعجب کیا اور مذاق اڑایا کیونکہ سید اس وقت تک ترکی زبان سے بالکل نا آشنا تھے لیکن سید نے تین مہینے میں ایسی مشق بہم پہنچائی کہ ٹھیک تین مہینے بعد شیخ الاسلام وزیر معارف اور مشاہیر دار السلطنت کے سامنے فصیح ترکی زبان میں خطبہ دیا اور سب سے اپنی رائے منوالی“

بلٹ لکھتے ہیں کہ ”

”محمد عبدہ بیان کرتے تھے کہ شیخ کا حافظہ غضب کا تھا وہ جس کتاب کو ایک دفعہ پڑھ لیتے تھے اُس کے تمام الفاظ اُن کے حافظہ میں فوراً محفوظ ہو جاتے تھے اُن کی طاقت لسانی بھی عجیب تھی اور

مشرق و مغرب کی دانائی سے ان کا دماغ لبریز تھا۔
صاحب "شہر مشاہیر ادا الشرق" (محمد عبدالفتاح) نے تو یہاں تک
لکھ دیا ہے کہ :-

مرحوم بمنزلہ سقراط تھے شیخ محمد عبدالہ افلاطون سعد پاشا زاغلول
ارسطو یعنی جمال الدین سے شیخ محمد عبدالہ کو وہی نسبت تھی جو سقراط سے
افلاطون کو۔
بلنٹ لکھتے ہیں کہ :-

"..... جمال الدین ایک بڑے شخص تھے ان کی
تعلیمات میں ایک خاص اثر اور کشش پائی جاتی تھی یہاں تک کہ آخری تیس
سال میں دنیائے اسلام میں ان سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں ہوا۔ میں اپنے کو
بہت زیادہ معزز اور منفرد سمجھتا ہوں کہ وہ انگلستان میں میرے یہاں تین
ہفتے مقیم رہے۔ وہ اپنے خیالات میں پکے اور پوری طرح ایشیائی تھے اور
آسانی کے ساتھ یورپین رسوم اور عادات سے مانوس نہ ہوتے تھے۔
مرزا آقا خان کرمانی :-

"عرب دیدہ و ترک و تاجیک و روم۔ زہر جنس در نفس پاکش علوم"
منفی عبدالہ :-

"میں بھی اُن کے شاگردوں میں سے ایک ہوں اور اگر میں یہ دعویٰ
کروں کہ اللہ تعالیٰ انبیا کے علاوہ جن نفوس کو قوتِ ذہن اور وسعتِ عقل
اور وقتِ نظر عطا کیا کرتا ہے وہ سب اُن میں (شیخ میں) بدرجہ اتم موجود
ہیں تو میرا یہ کہنا مبالغہ آمیز نہیں"
فیلسوف فرانس :-

”دین اسلام و قرآن مجید من اولّم الی آخره مساعد و رہنمائے ترقی روحی و جسمی طبیعت انسانی است و تا و قنیکہ اسلاف ما علما و علمائتمسک و منتسب بہ حقیقت او بودند در مہنتی درجہ عرش سعادت استوار بودند۔ پس از آن کہ ازیں رہنمائے الہی اخلاف ما دور شدند بہ ایں حال نزول رسیدند۔ پس در موضوع انحطاط مسلمین شکوہ از اروپائیاں خطا است و خرابی حال مسلمانان از افراط فاسدہ درونی خود مسلمین است و جبل التین استخلاص مسلمانان ازیں ہفتم طبقہ پستی و خواری تمسک علی بعروۃ الوثقی قرآن متین است“

آقا حسین خاں عدالت کے از تلامذہ :-

”ہرکس از دین مرحوم شیخ سوال می کرد می فرمود مسلمانم ہونے در مجلس درس یکے از علمائے تنین صاحب مجلس از سید مرحوم پرسیدہ بود کہ در چہ عقیدہ می باشی - فرمودہ بود مسلمانم - صاحب مجلس دوبارہ پرسیدہ بود از کدام طریقت - سید فرمودہ بود کہے را بزرگ تر از خود نمی دانم کہ طریقت او را قبول نہایم - صاحب مجلس باز گفتہ بود کہ رائے شما با کدام یک از چہار طریقت مطابقت دارد - سید فرمودہ بود مختلف است در بعضے بایکے در بعضے با دیگرے ----- حضرت رسول صلعم را خیلے محترم می داشت “

مرزا دانش گفتے ہیں کہ :- خطاب بہ پیامبر آخر الزماں کردہ می گفت

دین ترا در پی آرایش اند در پی آرایش و پیرایش اند

بسکہ بہ بستند برو برگ دساز گر تو بہ مینی نشناسیش باز

مرزا آقا حسین خاں نکلتے ہیں کہ :-

”سید جمال الدین باوجود داشتن یک مذہب فلسفی در ظاہر بہ طریقت صوفیہ سالک مذہب خفی بود و اہتمام شدید بہ ادائے فرائض مذہبیہ داشت“
مرزا لطف اللہ خاں بحوالہ مرزا حسین خاں دانش :-

”سید جز از یک مقلب Revolutionery بسیار آتشیں با بصیرت و دانائی و یک محرک Agitator فلسفی مشرب چیزے دیگر نبود بشیز و نفرت یک ملت از راہ مکمل اعتقاد نہ داشت تمامی روئے زمین بحشم جمال الدین یک تختہ شطرنج“

پروفیسر براؤن :-

”یہ بزرگ شخص ایک ایسا زبردست سیاح اور عالم تھا کہ باوجود اس کے کہ دولت دنیا میں سے فصیح زبان و قلم و وسیع علم سیاسی فہم و ذہانت و معلومات مختلفہ اور اسلام کے لیے جس کے انحطاط کو وہ اپنے دل میں محسوس کرتے تھے، سچے عشق کے سوائے اُن کے پاس اور کچھ نہ تھا تاہم یہ بات بلا مبالغہ کہی جاسکتی ہے اور حرف بہ حرف صحیح ہے کہ انھوں نے بادشاہوں کے تخت و تاج کو ہلا ڈالا تھا اور مدبرین یورپ کے بعض متفقہ تجاویز کو درہم برہم کر دیا تھا۔ انھوں نے ان غیر معمولی قوتوں کو استعمال کیا جن کی جانب مشرق اور مغرب کی سیاست دونوں میں کوئی شخص بھی ملتفت نہ ہوا تھا اور نہ کبھی ادنیٰ سے فائدہ اٹھانے کا خیال ان کے دل میں آیا تھا۔ صرف انھیں کے ذریعہ مصر میں حب الوطنی اور مذہبی اتحاد کے جذبات پھیلے“

اسٹنڈرڈ اپنی کتاب New world of Islam میں شیخ کے

متعلق اپنے خیالات اس طرح ظاہر کرتا ہے :-

"جمال الدین بہت بڑے سیاح تھے اور نہ صرف دنیائے اسلام سے کماحقہ واقف تھے بلکہ مغربی یورپ سے بھی پوری واقفیت رکھتے تھے۔ مسلسل سیاحتوں اور وسیع مطالعہ کی وجہ سے ان کی معلومات سجد و بیسج ہو گئی تھی جسے انھوں نے گوناگوں تحریکوں میں موثر طریقوں سے استعمال کیا۔ وہ پیدائشی مبلغ تھے اور اس حیثیت سے لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیتے تھے۔ دنیائے اسلام میں جہاں کہیں وہ گئے، اُن کی زبردست شخصیت نے ذہنی انقلاب پیدا کرنا شروع کر دیا۔ برعکس شیخ سنوسی کے انھوں نے مذہب سے بہت کم سروکار رکھا اور تمام دکال سیاست میں مہمک رہے ۔"

۴

جمال الدین پہلے مسلمان تھے جنہوں نے مغربی غلبہ کے آنے والے خطرہ کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا اور انہوں نے بقیہ عمر اسلامی دنیا کو اس خطرہ سے آگاہ کرنے اور مدافعت کرنے کے ذرائع معلوم کرنے میں صرف کر دی۔ یورپین آبادیوں کے حکام اُن کو شورش پسند قرار دیتے تھے بالخصوص انگریز جو اُن سے خائف رہتے تھے اور اُن سے سخت سلوک روا رکھتے تھے۔۔۔۔۔ نہایت ذکی اور فہیم شخص تھے اور ان میں بہت زیادہ مقناطیسی قوت و ودیعت کی گئی تھی۔ وہ کام کرنے کی غیر معمولی طاقت رکھتے تھے۔۔۔۔۔“

”شاہیر الشرق“ میں جرجی زیدان لکھتا ہے:-

”ان کی زندگی اور کارناموں کے مختصر حالات پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ مقصد جو ہمیشہ ان کے پیش نظر رہا اور وہ مرکز جس پر ان کی اُمیدیں ہمیشہ مجتمع رہیں اتحاد اسلام تھا جس کا مطلب یہ تھا

”یکے از مجاہدین کہ بہ مساعی ملت ہائے مظلوم شرق در ساخت تجدید و دیاکر سی می نمودہ اند شیخ جمال الدین است۔“

رنڈ لف چرچل :- ۷

جمال الدین بہت صاف گو اور صحیح رائے رکھنے والے آدمی ہیں۔۔۔“
ہانس کان :-

”جمال الدین یہ سمجھتے تھے کہ اسلام کی پاکیزگی اور اُس کے ابتدائی فلسفہ کی عظمت کا احیا ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے مسلمان اقوام اپنی قدیم سیاسی قوت اور برتری حاصل کر سکیں گی۔ جمال الدین کے اثرات گزشتہ صدی میں سب سے بڑے روحانی انقلاب کا سبب ہوئے۔۔۔“

مصر کے فلاہین کی فوجی تحریک نے اپنے کو ان اصلاحی تحریکات سے متحد کر لیا جو اسلامی تعلیمات کے مشہور مرکز الازہر میں جاری ہو چکی تھیں جمال الدین افغانی کو ہم اُن تحریکات کا بانی کہہ سکتے ہیں کیونکہ وہی اسلام کی جدید سیاسی بیداری کے پیدا کرنے والے تھے۔ انھوں نے اپنے اثرات کے نشانات تمام مشرقی ممالک میں چھوڑے ہیں۔۔۔۔۔“
ارنلٹ رینان فیلسوف فرانس :-

”این عجوبہ دہر۔ کہ بحقیقت یکے از تجلیات مستثنائے قدرت فاطرہ بود مانند یک شعلہ برق در میان یک طوفان بر جہاں تافت و گزشت دہیزرے از خود باقی نہ گزاشت مگر این کہ بگویم کہ اگر سی سال

۷۱۹۲۳ء سے درجیدہ وطن اسلامبول شمارہ ۳۰

۷ برطانوی وزیر ہند سنہ

پیش ازین تحریکات و مجادلات سید در ایران بہ قصد تخریب سلطنت مستبد ناصرالدین شاہ دہم سطوت او وقوع نہ پیوستہ بود ملت ایرانی چندیں مسافات در راہ آزادی و تجدد نہ پیمود بلکہ روئے آزادی را ہم بہ این زودی نہ دیدہ بود :

شیخ کی سیاسی ذہنیت کا یہ خاکہ مکمل نہیں، جس طرح یہ ساری کتاب ہنوز غیر مکمل ہے، بہر حال ان سطور میں اس شعلہ برق درمیان یک طوفان کا ایک جلوہ منتشر ضرور موجود ہے۔

شیخ اپنے سیاسی مسلک اور اوضاع میں اس درجہ پختہ اور کہا جاسکتا ہے کہ شدت کے ساتھ ضدی تھے۔ کہ باوجود شدید ناکامیوں اور قوی ترین ترغیبات کے وہ اپنے راستہ سے ایک قدم نہ ہٹے۔ ایک دفعہ ان کے دوست اور معتقد حاج سید ہادی نے ان کو ایک خط لکھا جس میں ان کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے خیالات میں کچھ اصلاح کر لیں ورنہ ان کی جان خطرہ میں رہے گی۔ شیخ کے جواب کی بلاغت اور اس بلاغت میں اتہزا کی تلخی ملاحظہ ہو۔

”سید ہادی جان من۔ مکتوب تو بہہومحافی درشتافت، الفاظش درحقیقت چوں بتانے بود کہ میدان اشجار ملتفتہ اش بہ انواع از ہار مرصع باشد و لے صد حیف کہ سالک بین اشجار ہمہ مملو بود از قبور خار بہ و عظام بالیہ و جث قتی و سیل و بار کہ نگاہ کردنش موجب کراہت و تعبورش سبب نفرت می گردید۔ و متن رائجہ ایں باقوۃ شامہ را از استشام ان انوار و از ہار بازی داشت، والسلام“

دوستوں کی اس قسم کی خیر طلبی پر ان کی جرات عمل ہنسا کرتی تھی۔

تصنیف و تالیف

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے تصنیف و تالیف کی طرف شیخ کا رجحان بہت کم تھا وہ فرمایا کرتے تھے کہ میں زندہ کتابیں تصنیف کرتا ہوں " اور بلاشبہ انہوں نے ہزار ہا زندہ کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی دماغی قوت تمام تر سیاسی مشاغل میں صرف ہوتی تھی اور نہ کبھی ان کو سفر و سیاحت سے اتنی مہلت ملی کہ تصنیف و تالیف کی طرف توجہ کرتے۔ ان کے قلم کا تمام سرمایہ جرائد و رسائل کے صفحات پر بکھرا ہوا ہے۔ اس سرمایہ کو امتدادِ زمانہ نے بہت کچھ ضایع کر دیا پھر بھی اہل ذوق چاہیں تو تلاش اور جستجو کا میدان تنگ نہیں ہے۔ آثارِ جمال الدین " کی دوسری جلد میں شیخ کے تمام مضامین جو مل سکے جمع کر دئے گئے ہیں۔ لیکن ابھی زمانہ کے گرد و غبار سے ڈھکے ہوئے بہت سے جو اہر ریزے متفرق اور منتشر ہیں جن کو شیخ کا مجھ سے کوئی زیادہ قابل و اہل سوانح نگار جمع کر سکے گا۔

کتابی صورت میں شیخ کی تالیف صرف ایک ہی ہے یعنی "تمتہ البیان فی تاریخ افغان" یہ پہلے فارسی زبان میں مرتب ہوئی پھر مصر میں اُس کا

عربی ترجمہ شایع ہوا اس کے بعد ہندوستان میں اردو ترجمہ چھاپا گیا اس کے بعد شیخ کا ایک مضمون ”رد علی الدھریں“ فارسی سے عربی میں ترجمہ ہوا۔ یہ مضمون سب سے پہلے حیدرآباد میں لکھا گیا اور پھر رسالہ کی صورت میں شیخ کے مصری شاگردوں نے اس کو شایع کیا۔ مستقل تالیف و تصنیف کا سرمایہ تو بس اسی قدر ہے۔ چند مضامین اردو اور فارسی زبان میں مقالاتِ جمالیہ کے نام سے کلکتہ میں شایع ہوئے اس رسالہ کے نسخے اب کیاب ہیں۔ ایک نسخہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے کتب خانہ میں موجود ہے جس سے راقم الحروف کو بہت مدد ملی اس کے علاوہ شیخ کے حسب ذیل مضامین بھی مصر اور ہندوستان میں بصورت رسائل شایع ہو چکے ہیں۔

(۱) ”حجۃ البالغہ“ - (۲) جملہ القرآن - (۳) فلسفہ الدین و اللغۃ (۴) الحافظہ

علی الدین (۵) القضاۃ والقدور (۶) الوصیۃ بساۃ الاسلامیہ -

”عروۃ الوثقی“ میں شیخ کے جتنے مضامین شایع ہوئے وہ سب کتابی صورت میں مصر میں شایع ہو چکے ہیں البتہ ”ضیاء النافقین“ میں شایع

شدہ مضامین کا پتہ نہ چل سکا۔ اسی طرح پرنس ملکم خاں کے رسالہ ”قانون“ میں جو مضامین شایع ہوئے ان تک بھی رسائی نہ ہو سکی۔ حیدرآباد کے رسالہ معلم اور معلم شفیق میں شیخ کے حسب ذیل مضامین شایع ہوئے تھے۔

(۱) فلسفہ وحدت و جنسیت (۲) تعلیم و تربیت (۳) اسباب حقیقت

سعادت و شقائے انسان (۴) فوائدِ جریدہ (۵) فوائدِ فلسفہ (۶) تشریح حال

۷۔ مطبعۃ الاولیٰ مطبعۃ الموسوعات بیاب الخلق مصر خلیفہ - ۱۶۰۰ صوفی پریسنگ

وپریسنگ کمپنی لمیٹڈ پٹنہ بہار الدین پنجاب مطبوعہ اسلامیہ سٹیٹ پریس لاہور۔

۸۔ مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۸۸۷ء - (۱۶۲)۔

اگھوریان - اخبار "دار السلطنہ" (کلکتہ) میں شیخ کا ایک مضمون تفسیر مفسر کے عنوان سے شایع ہوا۔ بطرس البستانی کے رسالہ دائرۃ المعارف مصر میں بھی شیخ نے بانی مذہب کے متعلق کچھ مضامین لکھے۔ اخبار مصر (اسکندریہ) میں دو مضامین تعلیم اور صنعت پر شایع ہوئے۔ رسالہ المنار (مصر) میں بھی شیخ کے حالات کے سلسلہ میں اُن کے بعض مضامین نقل کئے گئے ہیں جن میں دو مضامین "فی الحکومتہ الدستبدادیہ" کے عنوان سے بہت مشہور ہیں۔ ۶۲-۸۹۰ء میں Ednburgh Review نے بھی شیخ کے دو تین مضامین شایع کئے تھے۔

علاوہ مندرجہ بالا رسائل و مضامین کے بعض کا ذکر مرزا الطاف اللہ نے کیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ کہاں اور کب شایع ہوئے۔ اُن رسائل کے عنوانات بقول مرزا الطاف اللہ یہ ہیں۔ (۱) طفل رضع (۲) رسالہ حقیقت آشنا (۳) کیفیت شہادت۔ حضرت سید الشہداء باوجودیکہ شیخ کے مضامین کچھ زیادہ حاصل نہیں ہو سکے، پھر بھی اتنے ہیں کہ اُن کے مجموعہ کو ایک علیحدہ جلد میں شایع کرنا پڑیگا۔

✽ ✽ ✽

✽ ✽

✽

ضمیمہ جات

ضمیمہ جات

۱۔ علامہ موسیٰ جاوید اللہ - روسی

راستوف (روس) میں پیدا ہوئے، تعلیم قازان، بخارا، مصر اور حجاز میں حاصل کی۔ ۱۹۱۵ء میں اُن کی عمر ۳ اور ۴ سال کے درمیان تھی۔ اس لیے جب وہ شیخ سے ملے تو یقیناً بالکل نوجوان ہونگے۔ مصری سیاح ارشاد بک لکھتا ہے کہ روسی مسلمانوں میں موسیٰ جاوید اللہ کا وہی پایہ تھا، جو مصر میں مفتی عبدہ کا تھا کہا جاتا ہے کہ جب شیخ روس میں مقیم تھے تو علامہ موصوف بھی کبھی کبھی اُن کی خدمت حاضر ہوا کرتے تھے۔ علامہ موصوف آج کل ہندوستان آئے ہوئے ہیں لیکن افسوس ہے کہ اُن کے زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے۔

۲۔ پروفیسر ایڈورڈ گارڈنر برطان

۱۸ فروری ۱۸۶۳ء کو پیدا ہوئے ۱۸۸۷ء میں جب اُن کی عمر ۲۴ سال کی تھی پہلی دفعہ ایران گئے اور اُس کے بعد ایران کے کچھ ایسے گردیدہ ہوئے کہ ساہی عمر اُسی ملک اور قوم کی خدمت میں گزار دی۔ سند یافتہ ڈاکٹر بھی تھے مگر کبھی مطب نہیں کیا۔ کیمبرج میں فارسی اور عربی کے پروفیسر رہے اور دنیا کے قابل ترین مستشرقین میں سے ایک مانے جاتے تھے۔ بلکہ ایران کی ادبیات ذوقیات۔ معنویات یعنی شعرا۔ حکما اور ارباب مذاہب کے انکار کے متعلق کسی دوسرے مستشرق نے اس قدر خاص اور خالص محبت کا ثبوت نہیں دیا۔ اُن کی تصانیف میں ۱۲ بڑی کتابیں اور ۲۳ رسالے ہیں جن میں سے

- (۱) "ایک سال ایرانوں کی صحبت میں" ۱۹۲۶ء
 (۲) مسافر کی داستان ۱۸۹۱ء
 (۳) تاریخ ادبیات ایران ۱۹۰۲ء
 (۴) انقلاب ایران ۱۹۰۵ء
 (۵) ترجمہ چہار مقالہ ۱۹۲۱ء
 (۶) عربی طب ۱۹۲۱ء
 (۷) اشعار و مطبوعات ایران —
 (۸) البہا ۱۸۹۱ء
 (۹) ترجمہ تاریخ جدید مرزا حسین ہمدانی ۱۸۹۳ء
 (۱۰) ترجمہ مقالہ سیاح —
 (۱۱) بعض اسناد در بارہ مذہب بابیہ ۱۹۱۸ء

زیادہ مشہور ہیں اور تاریخ ادبیات ایران تو بلاشبہ اُن کا شاہ کار ہے جو نہ صرف یورپ میں اپنے رنگ کی بے نظیر کتاب ہے بلکہ فارسی زبان میں بھی اس مضمون پر کوئی کتاب اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ سیاسیات ایران کے متعلق برادون کی دو کتابیں سب سے زیادہ مشہور اور مستند ہیں یعنی انقلاب ایران اور اشعار و مطبوعات ایران بابی مذہب کے متعلق بھی اُن کا مطالعہ بہت گہرا تھا اور انھوں نے جو کچھ لکھا خوب لکھا علامہ موصوف کی تالیفات کی بڑی خصوصیت ہمیشہ یہ رہی ہے کہ اُن کی صحت معلومات مشتبہ نہیں ہوتی وہ جو کچھ لکھتے تھے بہت تحقیق و تفتیش کے بعد لکھا کرتے تھے۔ اُن کی مالی حالت بہت اچھی تھی لیکن وہ خود نہایت سادہ علمی زندگی بسر کیا کرتے تھے حافظہ عجیب و غریب تھا اور السنہ اسلامی کا خاص ذوق رکھتے تھے۔

عربی، ترکی اور فارسی بہت اچھی طرح بولتے تھے۔

ایران کے ساتھ براؤن کی ہمدردیاں بے حد دانتھاتھیں اور وہ سچے دل سے ایران کے ہوا خواہ اور ہمدرد تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے قلم سے ایرانی قوم پرستوں کی بہت معاونت کی۔ ایران کے حالات کے متعلق اُن کے دل میں جو جذبات موجزن رہتے تھے اُن کا اندازہ خود ان ہی کی تحریروں سے ہوتا ہے۔ قزوینی نے اپنے ایک مضمون میں براؤن کے بعض مکتوبات کا حوالہ دیا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے دل میں ایران اور ایرانی قوم کے متعلق کس قدر درد تھا۔ انگریزوں کی ایران میں مداخلت کے متعلق اپنے خیالات ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں۔

”ازیں خبر دشت انگیز تمہید نامہ انگلش بحکومت ایران یاس بر یاس افزود۔ یک طریقے ماندہ بود برائے خلاصی ایران از چنگ حریفان و بنیان آن اولاً بر اتحاد کامل بود و فداکاری از برائے وطن و فرض گرفتن از زردشتیاں بمبئی کہ حاضر بودند بہ شروط مقبول و تدارک ہمیش بہ ہر روزی کہ ممکن باشد و نمک باریان مجتہدین کبار خصوصاً جناب ملا محمد کاظم خراسانی کہ از وطن پرست ہائے حقیقی و عقلا بد نے دور بین است..... از کثرتِ حزن حالتے ندارم کہ بیش ازیں نویسم و مخلص خود خیال داشتم کہ بہ ملا محمد کاظم عریضہ بنویسم مراتب امور را معروض دارم دے یاس بطور یہ غالب شدہ است کہ عزم من بہ چیزے قرار نمی گیرد.....“

پھر مغربی اقوام کی تعدیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

..... دے قوت ظلم دریں دنیا خیلے است گاہے می ترم
 کہ عدل و جب حریت کم کم نادر تر از کبریت احمر شدہ است و شکے
 نیست کہ بیشتر این تعدیات از تحریکات مالیون است کہ ہمیشہ حاضر اند
 کہ ہر سرخ خون مردم بخزند نہ از خدای مرسند و نہ از آہ مظلومان
 لے کاش کہ می توانستم ازیں عالم سیاسیات دہائی ہوم دور دور
 عالم افکار و معانی روحانیات آرام بگیرم۔ حاضر دوسہ سال است
 بہ واسطہ اوضاع ایران مثل حالت نزع از بر لے من حاصل شدہ
 است ..

میں نے جب آخر دفعہ سلسلہ میں اُن کو دیکھا تھا تو عارضۂ
 قلب میں مبتلا اور حالت ضعف میں لیٹے ہوئے تھے لیکن بستر
 کے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی میزوں پر سینکڑوں کتابیں اور
 کاغذات سب ایران کے متعلق انبار در انبار رکھے ہوئے تھے۔
 ڈاکٹر نے مجھے صرف بندرہ منٹ ملنے کی اجازت دی تھی مگر انھوں
 نے ڈھائی گھنٹے تک اُسٹھنے نہ دیا اس لیے کہ ذکر چھڑ گیا تھا۔
 جمال الدین اور ایران کا !

وہ ایک بہت بڑا انسان ایک بہت بڑا عالم اور مستشرق
 تھا جو ہ جون سلسلہ کو اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

۳۔ ولفرڈ اسکاؤن بلنٹ Wilfred Scawn Blunt سلسلہ

میں پیدا ہوئے ابتدائی عمر میں برطانوی سفارت خانوں میں ملازم
 رہے۔ پہلے یونان کے برطانوی سفارت خانہ میں تعینات کیے گئے
 ایک معزز اور دولت مند خاندان کے رکن تھے۔ جوانی کا زمانہ تھا

پیرس کی دلچسپیوں میں مبتلا ہو گئے اس لیے وہاں سے پرنگاں کر کے سفارت خانہ میں بھیج دئے گئے۔ اس کے بعد انگلستان واپس آئے اور لیڈی اینا بیلا نیول Annabella Neol سے شادی کر لی۔ یہ آرل آف لودلیس Earl of lovelace کی بیٹی تھیں اور اُن کی ماں شاعر بائرن کی پوتی تھیں۔ شادی کے کچھ روز بعد بلنٹ کے بڑے بھائی کا انتقال ہو گیا اس لیے وہ آبائی جاگیر کے وارث قرار پائے ملازمت ترک کر کے وہ چھ برس تک اپنی جائیداد کے انتظام میں مصروف رہے۔ اُن کی بیوی کا محبوب مشغلہ مصوری تھا اور وہ خود نقاش اور شاعر تھے۔ لیکن شروع ہی سے اُن کو مشرقی ممالک سے خاص دلچسپی تھی اور اُن کی بیوی کو بھی سیاست کا بہت شوق تھا چنانچہ یہ دونوں مشرقی ممالک کی سیاحت کے لیے گھر سے نکلے اور گھوڑوں پر اسپین الجزائر ایشیائے کوچک عراق ایران نجد اور وسط عرب کا سفر کیا۔

سلسلہ تک بلنٹ کے تعلقات انگریزی مدبرین اور اعلیٰ عہدیداران حکومت سے بہت اچھے تھے۔ برطانوی دفتر خارجہ میں ان کا ذاتی اثر بہت تھا۔ گلیڈسٹن سے ذاتی تعلقات کی بنا پر براہ راست اُن کی خط و کتابت ہوتی تھی۔ انگلستان میں بلنٹ مشرقی ممالک اور سیاسیات کے اچھے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ اسی زمانہ میں انھوں نے اپنی پہلی کتاب ”مستقبل اسلام“ Future of Islam شائع کی۔

صحیح طور پر معلوم نہیں کہ شیخ سے پہلی دفعہ کہاں اور

کیونکہ اُن کی ملاقات ہوئی لیکن مصر کے معاملات میں بلنٹ برطانوی پالیسی پر شدت کے ساتھ نکتہ چینی کر رہے تھے اس لیے شیخ کے اور اُن کے درمیان اشتراک عمل ہو گیا۔

اعرابی پاشا کے معاملہ میں اُن کی کوششوں نے تمام مصری قوم پرستوں کو اُن کا گردیدہ کر دیا۔ اعرابی کے مقدمہ کی پیروی میں انھوں نے اپنی جیب سے ۴۵ ہزار روپیہ خرچ کیا اور انگلستان میں حکومت کی پالیسی کے خلاف اس قدر سخت پروپیگنڈا کیا کہ آخر ننگ آکر حکومت نے دو برس تک اُن کو مصر میں داخل ہونے کی ممانعت کر دی۔ اپنی ایک مشہور نظم The wind and that whirlwind میں انھوں نے برطانوی سیاست پر شدید نکتہ چینی کی۔

اسی طرح آئر لینڈ کے معاملات میں بھی انھوں نے وہاں کے قوم پرستوں کا ساتھ دیا اور ایک دفعہ باوجود سرکاری ممانعت کے ایک جلسہ منعقد کیا اور اس خلاف ورزی احکام کی پاداش میں دو مہینہ قید کی سزا پائی اُس قید کی حالت میں انھوں نے ایک نظم لکھی جس سے اُن کے عالی خیالات کا پتہ چلتا ہے۔

”خدا جانتا ہے کہ میں نے پہلے سے اس کارروائی کا ارادہ نہ کیا تھا نہ میں کسی خاص سیاسی مصلحت سے اپنے گھر کی اساکش جھوڑ کر ان خدا کے نام قبول بندوں سے لڑنے آیا تھا نہ میں کسی ذاتی غرض سے ساہا سال فوت اور تشفیص کا مقابلہ کرتا رہا ہوں۔ میری رُوح ان جھگڑوں سے پہلے ایک بہائی کی طرح تمام

انسانوں سے محبت کرتی تھی خدا جانتا ہو کہ انسانوں پر انسانوں کے مظالم کس طرح میرے دل پر اثر کرتے ہیں اور خدا ہی گواہ ہو کہ ان قاتلوں کے خلاف کس طرح میرے غصہ کی آگ بھڑکی جو دولت کے لیے قتل کرتے ہیں۔ اور خدا ہی جانتا ہو کہ میں نے اُن کا کیا مقابلہ کیا اور خدا ہی جانتا ہو کہ اُس دن سے آج تک ایک مسلح دنیا غصہ اور خوف کی حالت میں کس طرح میری زندگی پر حملے کر رہی ہو۔

مصر اور آئرلینڈ کے علاوہ بھی جہاں کہیں آزادی کا علم بلند ہوا بلنٹ کی آواز بھی بلند ہوتی رہی۔ ۱۹۰۵ء میں دانشوائی میں جب لوگوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا تو بلنٹ نے سختی کے ساتھ ہر سر عام احتجاج کیا۔ اسی طرح ۱۹۰۹ء میں اہل طرابلس پر اطالیوں کے مظالم کے خلاف انھوں نے غم و غصہ کا اظہار کیا پھر مسلسل میں جب آئرلینڈ کے مشہور انقلاب پسند جارج کیمنٹ کو سزائے موت دی گئی تو وہ خاموش نہ رہ سکے۔

ایک دولت مند اور بے فکر انسان کی زندگی کے یہ مشاغل تعجب انگیز ہیں بلنٹ اگر چاہتے تو اُن کے پاس ایسے وسائل موجود تھے کہ وہ سیاست اور حکومت کے حلقوں میں اعلیٰ مناصب حاصل کر لیتے مگر انھوں نے ہمیشہ قوی کی قوت سے قطع نظر کمزور و ضعیفوں اور کمزوروں کی اعانت و حمایت میں اپنی دولت خرچ کی اور عمر بھر اُن کا سیاسی مسلک یہی رہا۔

اُن کی تصانیف میں سے، نشر کی کتابیں اور وہ نظمیں بہت مشہور

ہیں۔ نثر میں -

(۱) تاریخِ دخلِ مصر History of the occupation of Egypt

۱۹۰۷ء

۱۹۱۱ء

(۲) Gordon at Khurtum گارڈن خرتوم میں

۱۸۸۲ء

(۳) Future of Islam مستقبلِ اسلام

۱۸۸۵ء

(۴) Ideas about India خیالات متعلقہ ہند

۱۹۰۹ء

(۵) India under Ripon ہندوستان بعد حکومت رپن

۱۹۱۲ء

(۶) Land war in Ireland جنگ زمینداری در آئر لینڈ

۱۹۱۹ء

(۷) My diaries vol. I روزنامہ چہ جلد اول

۱۹۲۰ء

(۸) My diaries vol. II روزنامہ چہ جلد دوم

بہت مشہور ہیں اور نمبر (۱) و (۲) تو اپنی قسم کی بہت اہم اور مستند کتابیں مانی جاتی ہیں جن میں اس زمانہ کی برطانوی حکمت عملی کی بے محابا پردہ دری کی گئی ہے۔ - - - - - منتہی میں انتقال ہو گیا۔

۳۔ مدحتِ پاشا

ابو احمد مراد، مدحتِ پاشائیت عثمانی میں تحریک قوم پرستی کے بانی ۱۸۲۲ء میں بمقام قسطنطنیہ پیدا ہوئے۔ ۲۲ سال کی عمر میں خانقہ آندلی کے سکریٹری مقرر ہو گئے اس کے بعد رومیلیا کے گورنر بنا کر بھیجے گئے وہاں کی بغاوت فرو کرنے کے بعد وہ پھر اپنی جگہ واپس آ گئے۔ ۱۸۵۵ء میں جب بلغاریہ میں بغاوت ہوتی تو پھر اُس کو فرو کرنے کے لیے بھیجے گئے نیش کی گورنری کے زمانہ میں انہوں نے وہاں کی داخلی حکومت کے نظم و ترتیب کے متعلق کچھ اصلاحی

تجاذیز تیار کیں اس کے بعد سلطان نے ان کو تمام سلطنت کے لیے صلاحی تجاذیز بہ مشورہ فواد پاشا و عالی پاشا تیار کرنے کا حکم دیا۔ ۱۸۶۶ء میں انھوں نے مجلس حکومت کے قواعد میں ترمیم کرائی لیکن کچھ روز بعد عراق کے حالات کو درست کرنے کے لیے بغداد کے گورنر بنائے گئے باوجودیکہ دار السلطنت میں اُن کا قیام مستقل طور پر نہ تھا لیکن وہ تمام عمر یہی کوشش کرتے رہے کہ ملک کے اندرونی انتظامات میں ایسی اصلاحیں کرائی جائیں جن سے حکومت تقویت حاصل کرے اور رعایا کو مشکلات و مظالم سے نجات حاصل ہو لیکن قسطنطنیہ میں اُن کے خیالات کے سخت مخالف ندیم پاشا وزیر اعظم تھے اور وہ مدحت پاشا کی تجاذیز کو کسی طرح قبول نہ ہونے دیتے تھے مگر مدحت سلطنت کی بد حالی کو اچھی طرح دیکھ رہے تھے اور بار بار سلطان کو اُس کی طرف متوجہ کرتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ تو اُنھوں نے تنگ آکر یہ جرأت کی کہ سلطان کو ایک خط لکھا جس میں صاف صاف لکھ دیا کہ ”آپ ایک بُری خندق کے کنارے آگئے ہیں“ اس زمانہ میں ایسی جرأت وہی مخلص قوم پرست کر سکتا تھا جس کو شاہی انعام و اکرام کی پروا نہ ہو یہ خط لکھنے کے بعد انھوں نے اپنے منصب سے استعفیٰ دیدیا اور قسطنطنیہ واپس آگئے۔

سرکاری ملازمت سے آزاد ہونے کے بعد اب وہ اور زیادہ جرأت کے ساتھ ملک و قوم کی خدمت پر کمر بستہ ہو گئے چنانچہ اپنی جماعت کو منظم کر کے انھوں نے شیخ الاسلام کی ہمدردیاں حاصل کیں اور آخر ۱۸۷۵ء میں فتویٰ حاصل کر کے سلطان عبدالعزیز کو معزول

کرادیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ سلطان کو معزول لئے بغیر اصلاحات کی تجاویز روبراہ نہ ہو سکیں گی۔ سلطان عبدالحمید خاں کو آل عثمان کے تخت پر بٹھانے والی مدحت کی جماعت تھی۔ عبدالحمید نے مدحت سے یہ عہد و پیمان کر لیا تھا کہ وہ تخت نشین ہو کر مجوزہ اصلاحات کو ملک میں نافذ کریں گے اور غالباً اسی قرار داد کی بنا پر مدحت کی قوم پرست جماعت نے عبدالحمید کی تخت نشینی کا سارا اہتمام کیا تھا۔ عبدالحمید نے تخت نشین ہوتے ہی مدحت کو وزیر اعظم بنایا اور بری شان و شوکت سے ترکی پارلیمنٹ کا افتتاح کیا لیکن یہ سب عبدالحمید کی حکمت عملی تھی۔ وہ اپنی استبدادیت اور مطلقیت میں ایک ذرہ کمی گوارہ نہ کرتے تھے اور وہ سب سے زیادہ مدحت سے بدگمان تھے۔

اور یہ سمجھتے تھے کہ مدحت کی قوت ملک میں بڑھ رہی ہو اور اگر وہ عبدالعزیز کو معزول کر سکیں تو مجھے بھی تخت سے اتار سکتے ہیں چنانچہ عبدالحمید نے جب دیکھا کہ پارلیمنٹ کی قوت بڑھ رہی ہو اور سلطانی اختیارات کم ہوتے جاتے ہیں تو انھوں نے مدحت کی طاقت کو توڑنے کا ہتھیار کر لیا۔ بالآخر یہ الزام قائم کر کے کہ وہ ایک سازش میں شریک تھے ان کو خارج البلد کر دیا گیا۔ اور ساتھ ہی پارلیمنٹ کے دروازے بھی بہ جبر بند کر دئے گئے۔ یہ سب کچھ کر کے بھی عبدالحمید مطمئن نہ تھے وہ جانتے تھے کہ جب تک مدحت زندہ ہیں دستوریت کی تحریک بھی ترکی میں زندہ رہے گی اور ان کی زندگی میں اصلاحات کے تجاویز کو قطعاً منسوخ کر دینا بہت دشوار ہوگا۔ اس لیے پھر ایک دفعہ مدحت کے متعلق خوفناک اظہار

کر کے واپس بلایا گیا۔ اور سمرنا کا گور زربنادیا گیا۔ پھر دفعتاً سلطان عبدالعزیز کے قتل کا دوبارہ الزام ان پر عاید کر کے ان کو گرفتار کر لیا گیا۔ جھوٹے گواہ تیار کر کے ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ اور عدالت سے سنرائے موت کا حکم صادر کر دیا گیا۔ لیکن اُس وقت برطانوی سفارت خانہ کی ہمدردیاں مدحت کے ساتھ تھیں۔ ادھر سے معاملات میں مداخلت کی گئی اور عبدالحمید برطانوی اثرات سے مرعوب ہو گئے۔ اُس زمانہ میں برطانوی سفیر سر ہنری ایلٹ نے اس مقدمہ کے متعلق اپنی ایک رپورٹ میں لکھا تھا کہ عبدالحمید کے دور حکومت پر یہ ایک نہ ٹٹنے والا دھبہ ہے۔ اب عبدالحمید نے گھبرا کر سنرائے موت کو عمر بھر کی نظر بندی سے بدل دیا اور مدحت کو عرب میں نظر بند کر دیا گیا لیکن یہ نظر بندی بھی انگریزوں کو صرف چند روز مطمئن کرنے کے لیے عبدالحمید کی ایک چال تھی اُن کے دل میں دہی خیال جا ہوا تھا کہ جب تک مدحت زندہ ہیں میرا تاج و تخت محفوظ نہیں اس لیے ۲۶ جولائی ۱۸۸۷ء کو حالت نظر بندی میں مدحت کو قتل کر دیا گیا اس میں کلام نہیں کہ مدحت ترکی میں مطلقیت کے سب سے سخت دشمن اور حریت و عصبيت قومی کے سب سے پہلے علم بردار تھے جنہوں نے سلطان کی مطلقیت کے خلاف قوم پرست جماعت کو منظم کر دیا بلاشبہ ترکی میں مدحت ہی کی جدوجہد اور قربانی سے تحریک آزادی کا نیا دور شروع ہوا اور انہیں کے نصب کئے ہوئے شگ بنیاد پر سید جمال الدین نے قوم پرستی کی عمارت تیار کی۔

۵۔ محمد نامق کمال ہے۔

مشہور ترکی ادیب و شاعر (ولادت ۱۸۴۴ء) اُن کے والد سلطان سلیم ثالث کے چہرلین تھے اُن کا خاندان البانی نسل سے تھا ۱۸ سال کی عمر میں شاعری شروع کی شناسی افندی کے زیر اثر جو یورپ کے تعلیم یافتہ تھے سیاسیات میں دلچسپی لینے لگے بعد کو شناسی کے اخبار "تصویر افکار" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ جب ۱۸۶۴ء میں شناسی حکومت کی تعدی سے تنگ آکر یورپ کو بھاگے نو اخبار نامق کے حوالہ کر گئے۔

حکومت نے دار السلطنت سے اُن کو دور رکھنے کے لیے ارض روم میں ایک سرکاری عہدہ پر اُن کا تقرر کر دیا۔ وہاں ضیا پاشا "نوجوان ترکوں" کی تحریک پیدا کر چکے تھے نامق وہاں پہنچے تو جاتے ہی اُس جماعت میں شریک ہو گئے مگر ان نوجوانوں کا حکومت کے جاسوسوں کی نظر سے بچنا مشکل تھا چنانچہ جب گرفتاری کا خطرہ پیدا ہوا۔ تو ضیا کمال نوری رفعت اور نامق یہ سب کے سب بھاگ کر لندن چلے گئے۔ یہ واقعہ ۱۸۶۶ء کا ہے۔ لندن سے نامق کمال بے نے اخبار مخبر باری کیا بعد کو یہی اخبار حریت کے نام سے پیرس سے شایع کیا جاتا تھا۔

پھر جب ان تارکانِ وطن کو وطن جانے کا موقع ملا تو وہاں جا کر نامق نے اخبار عبرت جاری کیا۔ پھر جب عبدالحمید خاں کی تخت نشینی کے بعد اصلاحات کا چرچہ شروع ہوا تو نامق اور ان کے تمام احباب مدحت اور ضیا پاشا کے ساتھ نیا دستور بنانے میں شریک ہو گئے.....

۱۸۸۱ء میں اُن کا انتقال ہو گیا لیکن جب نوجوان ترکوں کی تحریک بالآخر کامیاب ہوئی اور حکومتِ ترکی کے دروبست میں انقلابِ عظیم پیدا ہوا اور نوجوان ترک اُس پر پوری طرح قابض ہو گئے تو نوجوان پارٹی کے تمام ممتاز اراکین نامق کی قبر پر خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے حاضر ہوئے۔ وہ مرحوم کو ”معارِ عمارتِ آزادی“ کے نقب سے یاد کرتے تھے۔۔۔

نامقِ ترکی کے بہت مشہور مصنف اور مولف تھے انھوں نے بہت سی تاریخی کتابیں اور ڈرامے لکھے جو ”انقلاب“ کے بعد ملک میں بہت مقبول ہو گئے تھے۔۔۔۔۔

۶۔ شیخِ ہادی نجم آبادی۔

ایران کے اکابرِ مجتہدین میں سے بہت معزز و محترم تھے اور بہت آزاد خیال تھے۔ وہ قدیم خیالات کے مقابلہ میں اپنے جدید خیالات کو بہت جرات اور صفائی کے ساتھ بیان کیا کرتے تھے۔ سولائے بادشاہ کے کسی کو تعظیم نہ دیتے تھے حالانکہ اُن کی صحبت میں ایران کے بڑے بڑے امرا اور اراکینِ سلطنت حاضر ہوتے تھے۔ ناصر الدین شاہ کے قاتل رضا خاں کرمانی نے اپنے بیان میں اُن کے متعلق کہا تھا کہ:

”جس دن وہ درختوں کے نیچے بیٹھے تھے تو وہ لوگوں کو آدمی بنانے میں مصروف رہا کرتے تھے اب تک اُنھوں نے ۲۰ ہزار آدمی بنائے ہوں گے جن کی آنکھوں سے اُنھوں نے پردے اٹھا دیے اور وہ سب بیدار ہو گئے اور معاملہ کو سمجھنے لگے“

اُس زمانہ میں جب شیخ نے ایران میں اپنی تحریک شروع کی تو "انقلاب ایران" کے لیے زمیں تیار کرنے والے نجم آبادی ہی تھے۔ اُن کی صحبت میں ہر طبقہ کے لوگ حاضر رہتے تھے۔ شیعہ سنی بابی ارمینی یہودی سب اُن کی تعلیم سے مستفید ہوتے تھے۔

اُس دورِ استبداد کے وہ بہت بڑے حریت پسند اور قوم پرست مجتہد تھے۔ سید جمال الدین سے اُن کے بہت گہرے اور مخلصانہ تعلقات تھے۔ چنانچہ جب شیخ درگاہ حضرت عبدالعظیم میں پناہ گزیں تھے تب بھی راتوں کو چھپ چھپ کر شیخ ہادی سے ملنے طہران جایا کرتے تھے۔ رضا خاں جب ناصر الدین شاہ کو قتل کرنے قسطنطنیہ سے طہران آیا تو اُن ہی کے مکان پر مقیم ہوا تھا۔ چنانچہ ناصر الدین کے قتل کے بعد اُن کو ایران سے خارج البلد کر دیا گیا اور وہ شیخ کے پاس قسطنطنیہ آگئے جہاں اُن کے علم و فضل کی بہت قدر کی گئی۔ شیخ ہادی عوام الناس میں بہت ہرول عزیز تھے۔ اور اسی وجہ

سے دوسرے علما کی ایک جماعت ان کے خلاف رہتی تھی حتیٰ کہ اُن کے خلاف کفر کے فتوے بھی جاری کئے گئے۔ مگر وہ کبھی کسی مخالف کی پروا نہ کرتے تھے۔ بہت بے خوف آدمی تھے۔ نہ صرف شاہی خاندان کے ممتاز اراکین مثلاً نایب السلطنہ اور امین السلطنہ بلکہ خود بادشاہ بھی کبھی کبھی اُن کے مکان پر حاضر ہوا کرتے تھے۔ اخلاقی حیثیت سے عجیب کیریئر رکھتے تھے۔ کسی کا دباؤ نہ ملتا تھے اور کسی کا احسان لینا گوارہ نہ کرتے تھے۔ اور اپنے خیال و وضع میں اس قدر پختہ تھے کہ اپنی اولاد اور مریدوں کو سوائے اہل حلال

کے کچھ نہ کھانے دیتے تھے۔

۶۔ مصطفیٰ کامل

اگست ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے اُس وقت مصر میں خدیو اسماعیل برسرِ حکومت تھا۔ اُن کے والد علی افندی محمد مصری حکومت میں چیف انجینئر تھے۔ اوائل عمر میں مذہبی تعلیم حاصل کی ۱۸۹۵ء میں مشرقی و مغربی تعلیم ختم کی اور پیرس سے قانونی سند لے کر مصر آئے۔ اس کے بعد مصر کی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور ایک سیاسی جماعت احرارِ قائم کی اس وقت ملک میں اُن کا رسوخ و اثر بہت تھا۔ اور سلطانِ ترکی بھی اپنے مخصوص مصالح کی بنا پر درپردہ اُن کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ مصطفیٰ کامل مصر میں برطانوی "دغل" کے سخت خلاف تھے۔ اور اس میں کلام نہیں کہ مصری احرار کی جماعت کو اُنھوں ہی نے منظم و مستحکم کیا۔ یہی وہ جماعت تھی جس سے شیخ نے کام لیا تھا اور اسی سلسلہ کے سب سے بڑے لیڈر بعد کو سعد زانعلول قرار پائے۔ مصطفیٰ کامل بہت با اثر مقرر اور بہت تیز قلم اخبار نویس تھے۔ انھوں نے اخبار نویسی کے ذریعہ سے بہت کچھ کام کیا اُن کا انگریزی اخبار Egyptian Standard انگریزوں کا سخت مخالف تھا اُس کے

علاوہ دو عربی جرائد مجلہ الدر اور الواصر میں بہت مقبول ہوئے اُن کا بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے مصر کی عام آبادی میں جمال الدین اور اعرابی کی تحریکات کو پوری طرح کامیاب بنا کر مصری عوام کے اندر ایک عام بیداری پیدا کر دی

حتیٰ کہ مصر کے بہت سے اکابر اور امرا بھی اُن کی تحریک میں شریک ہو گئے۔ ۱۹۰۵ء میں انتقال ہو گیا۔ اُن کی دو کتابیں بہت مشہور ہیں۔ ”فتح اندلس“ اور ”اعجب ماکان فی الرق عند الرومان“

۷۔ خیر الدین پاشا۔

چرکی نسل سے تھے۔ پہلے تونس میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے مگر صادق پاشا والی تونس سے جھگڑا ہو گیا لہذا پیرس چلے گئے۔ ۱۸۷۷ء میں سلطان عبدالحمید خاں نے پھر اُن کو قسطنطنیہ میں بلایا اور کونسل آف اسٹیٹ کے صدر بنادے گئے۔ ۱۸۷۸ء میں روسی و ترکی کے جنگ کے خاتمہ کے بعد وہ وزارتِ عظمیٰ کے عہدہ پر فائز کئے گئے۔ لیکن چند روز بعد علما کی جماعت سے اُن کا جھگڑا ہو گیا چنانچہ وزارت سے برطرف کر دئے گئے اپنے زمانہ میں وہ اصلاح طلب جماعت کے بہت با اثر رکن تھے ۱۸۸۹ء میں بمقام قسطنطنیہ انتقال ہو گیا۔

۸۔ امیر عبدالقادر ۱۸۰۷ء - ۱۸۸۳ء۔

اُن کے والد محی الدین شمالی افریقہ میں اپنے زہد و اتقا کے لئے مشہور تھے۔ جوانی میں باپ کے ساتھ حج کرنے گئے اور بعد میں شیخ عبدالقادر جیلانی کی درگاہ پر حاضر ہوئے۔ جب فرانس نے الجزائر پر قبضہ کرنا شروع کیا تو عبدالقادر مکارا میں الجزائر کے امیر منتخب کر لئے گئے۔ ۱۵ برس تک وہ فرانس کی فوجوں کا مقابلہ کرتے رہے ۱۸۳۸ء تک اُن کو کامیابی ہوتی رہی لیکن

بعد کو فرانس نے بعض قبائل کو رشوت دے کر اپنے ساتھ ملا لیا اور اس طرح عبدالقادر کی قوت کمزور ہو گئی چنانچہ ۲۱ دسمبر ۱۸۱۷ء کو سیدی ابراہیم کے مقام پر انھوں نے پسپا ہو کر اپنے کو فرانسیسی فوج کے حوالہ کر دیا۔ اُن سے وعدہ کیا گیا تھا کہ اُن کو اسکندریہ جانے کی اجازت دیجائے گی مگر حوالگی کے بعد فرانس نے وعدہ خلافی کی اور ۱۸۱۷ء تک وہ فرانس میں قید رکھے گئے اُس کے بعد نیپولین ثالث نے اُن سے وعدہ لے کر کہ وہ الجبریا کے معاملات میں دخل نہ دیں گے اُن کو رہا کر دیا۔ رہائی کے بعد وہ کچھ عرصہ بروسہ میں رہے اور پھر دمشق میں مستقلاً مقیم ہو گئے ۱۸۶۵ء اور ۱۸۶۷ء میں وہ دو دفعہ پھر یورپ آئے قبیلہ دروز کی بغاوت کے سلسلہ میں انھوں نے فرانس کی کچھ امداد کی جس کے صلہ میں فرانسیسی حکومت نے چار ہزار پونڈ سالانہ اُن کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ ۲۶ مئی ۱۸۸۳ء کو دمشق میں وفات پائی۔

امیر عبدالقادر ۱۹ ویں صدی عیسوی کے اُن ابتدائی مجاہدین میں سے تھے جنھوں نے مشرق پر مغرب کی دست درازی کا مقابلہ کیا۔ زندگی کے آخری زمانہ میں اُن کو تنگ دستی نے فرانس کے دستِ کرم کا احسانمند ہونے پر مجبور کر دیا لیکن اُن کی ابتدائی خدمات اتنی ہیں کہ آخری زمانہ کی یہ ایک لغزش نظر انداز کی جاسکتی ہے بحیثیتِ مجموعی وہ اسلامی حریت و عصیت کے بہت ممتاز داعی تھے۔ وہ جمال الدین کی تحریک کے سلسلہ کی ابتدائی کڑی تھی۔

۹۔ محمد بن عبد الوہاب

بیل Beal نے اپنی کتاب Oriental biographical dictionary

میں سن ولادت ۷۰۵ھ لکھا ہے لیکن ایک دوسری روایت کے مطابق صحیح سنہ ۱۶۹ھ تھا۔ مدینہ منورہ بصرہ اور دمشق میں تعلیم پائی۔ مذہب حنبلی تھا۔ اُن کے عقاید پر زیادہ اثر ابن تیمیہ کی تعلیمات کا تھا۔ شروع میں جب اُنھوں نے عرب قبائل کے سامنے اپنے عقاید پیش کئے تھے تو ان عقاید کی اس قدر شدید مخالفت کی گئی کہ آخر اُن کو محمد بن سعود سلطان نجد کے یہاں دراعیہ میں پناہ لینا پڑی۔ اُن کی تعلیمات کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

(۱) صرف قرآن کی تعلیم کے مطابق اسلامی عقاید کا استحکام ہونا چاہیئے۔

(۲) عثمانی یا کسی دوسری خلافت کو قبول نہ کرنا چاہیئے۔

(۳) درویشوں اور فقرا کا کوئی غیر معمولی احترام نہ کیا جائے۔

(۴) نماز روزہ اور حج وغیرہ کی سختی سے پابندی کی جائے۔

(۵) شراب تمباکو جوا جادو ریشم اور سونا یہ سب ممنوع ہیں۔

(۶) مقبرے اور پختہ قبریں نہ بنائی جائیں۔

(۷) خدا کی تمام صفات صرف اُسی کے لیے مخصوص سمجھی جائیں۔

(۸) اور کسی انسان کو اُس میں شریک نہ بنایا جائے۔

(۹) پیغمبروں کو محض انسان سمجھا جائے اور صفات ربانی سے اُن کی ذات کو نسبت نہ دیکھ جائے۔

(۱۰) جو چیزیں خدا کے قبضہ میں ہیں وہ غیر سے طلب نہ کی جائیں۔

دغیرہ وغیرہ۔ ۱۲۷۱ھ میں محمد بن سعود نے عبدالوہاب کے عقاید کو قبول کر لیا اور وہ نجد کے پہلے وہابی امیر تھے اُس کے بعد اُن کے تمام جانشین وہابی ہوتے رہے۔ محمد بن سعود کے بیٹے عبدالعزیز بن سعود نے تمام نجد میں اپنی کامل حکومت قائم کر لی اور عراق و غیرہ کی طرف بھی پیش قدمی شروع کر دی۔ ایک عرصہ تک نجدیوں اور سلطانی فوجوں سے مقابلے ہوتے رہے۔ کربلا۔ مکہ۔ عراق۔ دمشق وغیرہ پر نجدیوں نے کامیاب حملے کیے۔ اور باوجود سخت کوشش کے عرب میں اُن کے گروہ کو سلطانی فوجیں فتح نہ کر سکیں۔ مگر وہابی تحریک کے متعلق یہ خیال صحیح نہیں کہ وہ تحریک اتحاد اسلام کے طرح کوئی سیاسی تحریک تھی۔ درحقیقت وہ ایک خالص مذہبی اور فرقہ دارانہ تحریک تھی جہاں کہیں وہ تحریک جدید تمدن اور علوم سے ٹکراتی تو کامیاب نہ ہو سکی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ وہابیت میں دوسروں کے عقاید کے ساتھ رواداری کا عنصر بہت کم موجود تھا۔ کربلا اور مکہ و مدینہ میں اُن کے تشدد نے شیعہ اور دیگر اسلامی فرقوں کو اُن کا سخت مخالف بنادیا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ اِس تحریک نے بجائے اتحاد پیدا کرنے کے دنیائے اسلام میں فرقہ وارانہ افتراق کو زیادہ کر دیا ہندوستان میں صرف ایک جماعت عبدالوہاب کی تعلیمات سے متاثر ہوئی تھی اور یہ حضرت اسماعیل شہید کی جماعت تھی جو عرصہ تک سکھوں کے خلاف جہاد کرتے رہے۔

۱۰۔ امام سید محمد بن علی بن السنوسی الخطابی الحسینی الادریسی المہاجر۔
فرقہ سنوسیہ کے بانی اور ۱۹ویں صدی عیسوی کے بہت بڑے اسلامی
مجاہد تھے۔ ۱۸ویں صدی کے آخر یا ۱۹ویں صدی کے شروع میں پیدا ہوئے
تاریخ پیدائش میں اختلاف روایات ہیں۔ چنانچہ سنہ ولادت ۱۱۹۱ھ-۱۱۹۲ھ
۱۱۹۶ھ اور ۱۱۹۷ھ بھی بتایا جاتا ہے۔ الجزائر میں پیدا ہوئے تیس سال کی
عمر تک وہاں مذہب کی اصلاح کا وعظ کہتے پھرے پھر ٹیونس اور
طرابلس گئے پھر قاہرہ آئے۔ قاہرہ میں اُن کے معتقدین کی تعداد
بہت ہو گئی لیکن علمائے اذہر نے مخالفت کی اس لیے مکہ چلے گئے
جہاں ابوقیس میں مکہ کے قریب اپنا دائرہ قائم کیا اور محمد بن ادریسی
کی تحریکات میں شریک ہو گئے اسی زمانہ میں نجد کے وہابیوں سے
بھی کچھ تعلقات پیدا ہو گئے لیکن اس بنا پر مکہ کے علمائے اُن سے
بدگمان ہو گئے چنانچہ وہ سوڈان چلے گئے جہاں امیر سوڈان اور
حاکم وادی اُن کے معتقد تھے۔ سوڈان میں اُن کی تعلیمات بہت
مؤثر ہوئیں۔ ۱۲۳۳ھ میں ورنہ کے پہاڑوں میں دائرے کو نام
سے ایک جماعت قائم کی وہاں معززین طرابلس اور مراشی مسلمانوں
پر بہت اثر قائم ہو گیا۔ لیکن ترک اُن کے بڑھتے ہوئے اثر کو اچھی
نظر سے نہ دیکھتے تھے اس لیے انھوں نے ۱۲۵۵ھ میں اپنا دائرہ
سیوا کے قریب بنایا۔ امام سید محمد کا ۱۲۵۵ھ میں انتقال ہو گیا
اُن کے بعد اُن کے بیٹے ہمدی جانشین ہو گئے گو وہ بہت کم
عمر تھے لیکن دائرہ کا اثر اب مراکش سے قسطنطنیہ اور ہندوستان
تک قائم ہو چکا تھا۔ ہمدی سوڈانی نے چاہا کہ وہ اُن کے خلیفہ

بن جائیں لیکن انھوں نے قبول نہ کیا جب سلطان عبدالحمید خاں نے دیکھا کہ بن غازی اور طرابلس میں ترکی گورنروں سے زیادہ سنوسی دائرہ کا اثر قائم ہو رہا تو وہ بہت متروک ہوئے اسی زمانہ میں فرانسیسیوں نے طرابلس میں پیش قدمی شروع کی۔

مہدی کے انتقال کے بعد اُن کے بھتیجے احمد الشریف اُن کے جانشین ہوئے اُن کے خیالات پر تحریک اتحاد اسلامی کا بہت اثر پڑا اور انھوں نے اپنے لاکھوں معتقدین میں اس تحریک کی بہت زیادہ اشاعت کی۔

سید جمال الدین اور احمد الشریف سے ملاقات یہی ہوئی تھی غالباً قسطنطنیہ میں، اور قرائن یہ ہیں کہ جمال الدین سے ملاقات کرنے کے بعد ہی سنوسی تحریک نے تحریک اتحاد اسلامی کا رنگ اختیار کیا، ۱۸۸۱ء سے ۱۹۰۲ء تک سنوسی جماعت اطالوں سے لڑتی رہی اور اس جنگ میں اُن کی جمیعت کو بہت نقصان پہنچا۔ سنوسی اخوان کے عقاید و ہابیوں کے عقاید سے کچھ زیادہ مختلف تو نہیں ہیں مگر اس فرقہ کے اندر تشدد اور سختی نہیں ہو رہی اور اسی وجہ سے سنوسی تحریک عالم اسلام میں وہابی تحریک سے زیادہ مقبول ہو سکی۔ سنوسی عقاید کم و بیش مالکی فرقہ کے عقاید ہیں۔ وہ قرآن اور حدیث کو تفسیروں سے قطع نظر کر کے مانتے ہیں۔ اور رائج الوقت تفسیروں اور حاشیوں کے پابند ہونا نہیں چاہتے۔ مصری علمائے ان پر تحریف عقاید اسلامی کا الزام لگایا لیکن واقعہ یہ ہے کہ سنوسیوں کی جماعت ایک تبلیغی اور مشنری جماعت ہے۔

اور اُس کا سب سے بڑا مقصد اشاعت اسلام ہو اسی کے ساتھ یہ تحریک جمال الدین کی تحریک اتحاد اسلام سے متاثر ہو گئی یہی لیے سلسلہ کی جنگ طرابلس کو اگر تحریک اتحاد اسلام کی ایک تاریخی کڑی کہا جائے تو بیجا نہیں۔

۱۱۔ الازہر

بارچ سلسلہ میں ایک عبادت گاہ قاہرہ میں تعمیر ہوتی جس میں پانچ سال بعد درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا اور اُس وقت سے آج تک جاری ہے۔ فاطمی سلاطین مصر کو جامعہ سے خاص دلچسپی تھی اور اُن کے زمانہ میں اُس نے بہت ترقی کی۔ خلیفہ العزیز بن المعز نے جامعہ کے لیے ایک بڑا کتب خانہ وقف کیا۔ سلطان صلاح الدین کے قبضہ مصر کے بعد تقریباً ایک صدی تک ازہر کی تعلیمی تحریک مردہ رہی اور اُس کے بجائے مسجد الحاکم تعلیمی مرکز بن گئی مگر سلسلہ ہجری میں ازہر کی تعلیمی تحریک پھر زندہ ہوتی اور اُس کا اثر و اقتدار بہت بڑھ گیا۔ ملک کے سیاسی معاملات میں بھی علمائے ازہر کی آواز مقتدر اور با اثر ہو گئی چنانچہ سلسلہ میں فالفو الغوری کو مصر کا سلطان علمائے ازہر نے منتخب کیا۔ سلسلہ میں جب نپولین مصر آیا تو اُس نے سب سے پہلے ازہر کے شیخ اعظم سے ملاقات کی۔ سلسلہ میں ازہر کے علمائے محمد علی کو خدیو بنایا۔ اسی طرح سلسلہ تک ازہر حکومت کے اثر سے آزاد بلکہ ایک حد تک اُس پر حادی رہتا تھا مگر اس کے بعد خدیو نے

علماء کی ایک کمیٹی قائم کر کے اُس کے انتظامی اور تعلیمی حالات کی جانچ کرائی اور ۱۹۷۶ء میں جامعہ کے متعلق ایک قانون بنادیا گیا۔ بہر حال جامعہ اذہر تقریباً ایک ہزار سال تک تعلیم اور تعلیم کا مرکز بنا رہا ہے

۱۲۔ "جانِ شامی"

جس زمانہ میں ترکی فوج کسی جدید تنظیم کے ماتحت نہ تھی تو اول سلطان ارخان نے ترکمانوں کی ایک فوج مرتب کی مگر وہ فوجی ضبط و نظم کا تحمل نہ کر سکی اس لیے ۱۳۳۷ء میں یہ تجویز کی گئی کہ ہر سال کچھ عیسائی نوجوان اُن کے والدین سے لے لیے جاتے تھے اور اُن کو تربیت دیکر فوج میں داخل کیا جاتا تھا اس فوج کا نام "فوج نو" تھا شروع میں اس فوج کی تعداد ۲۰ ہزار سے زیادہ نہ تھی مگر بعد کو ۱۵۹۱ء میں اُس کی تعداد پچاس ہزار کے قریب ہو گئی اور اس کو مخصوص حقوق دیے گئے۔ مگر سلطان ابراہیم کے زمانہ میں تعداد گھٹا کر ۱۰ ہزار کر دی گئی کچھ روز بعد پھر اس تعداد میں اضافہ ہونا شروع ہوا اور ۱۶۳۶ء میں ایک لاکھ ۳۵ ہزار ہو گئی۔

اس کے زمانہ میں ان سپاہیوں کو تنخواہ نہیں ملتی تھی صرف جنگ کے زمانہ میں ملتی تھی۔ اس کے زمانہ میں ہر سپاہی کوئی نہ کوئی پیشہ کر کے اپنی روزی کماتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس فوج کی قوت میں بہت اضافہ ہو گیا۔ حتیٰ کہ وہ معاملات حکومت میں دخل ہو گئی۔ سلطان احمد خاں کی ۲۸ سالہ عہدِ حکومت میں

انہوں نے ۱۴ مرتبہ حکام سے ناراض ہو کر قسطنطنیہ میں آگ لگائی اور بلوہ کیا۔ ایک دفعہ انہوں نے وزیر اعظم کے محل پر حملہ کر کے اُس کو تباہ کر ڈالا آخر کار سلطان محمود ثانی نے اُن کا قلع قمع کرنے کا تہیہ کر لیا۔ ۱۸۲۵ء میں ایک منظم فوج بھرتی کی گئی۔ مگر جان نثاروں کو نئی فوج کا بھرتی کیا جانا بہت ناگوار ہوا۔ انہوں نے بغاوت کر دی۔ اُس وقت سلطان نے پیغمبر کا جسنڈ نکال کر جہاد کا اعلان کر دیا درخت لڑائی کے بعد وہ لوگ گھبرا گئے اُن میں بہت سے مارے گئے کچھ گرفتار ہوئے اور کچھ جو اپنی بارگاہوں میں موجود تھے وہیں بارگاہوں میں آگ لگا کر جلا دئے گئے۔

۱۳۔ ریاض پاشا

ایک چرکسی خاندان سے تھے مگر یہودی سمجھے جاتے تھے خدیو اسماعیل کے زمانہ میں کمیشن مالیات کے نائب صدر بنائے گئے ۱۸۶۱ء میں وزیر داخلہ مقرر کئے گئے لیکن زیادہ عرصہ نہ ٹھہر سکے مصر چھوڑ کر چلے گئے۔ اسماعیل کے معزول ہونے کے بعد بطانوی سفارت خانہ نے اُن کو پہر بلا لیا اور وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ وہ اعرابی کے سخت مخالف تھے اور انگریزی سفارت خانہ میں بہت مقبول تھے۔ اُن کی رسلے یہ تھی کہ مصری قوم آزاد حکومت خود اختیاری کے قابل ہی نہیں ہے۔ عباس دوم کے زمانہ میں بھی چند روز وزیر اعظم رہے۔ اپریل ۱۸۶۸ء میں اسماعیل دیکر کنارہ کش ہو گئے باوجودیکہ انگریز اُن سے خوش تھے مگر خدیو اسماعیل ناخوش رہتا تھا تعجب ہے کہ شیخ سے اور ریاض پاشا سے

اچھے تعلقات کیونکر قائم رہے غالباً وہ شیخ کے محض علم و فضل کا یقین ہوا ہوگا یا خدیو اسماعیل سے دونوں کی نفرت ایک حد تک اشتراک خیال کا باعث ہوئی ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ اُس کا مصری قوم پرستوں کی جماعت سے کوئی تعلق نہ تھا۔

۱۴۔ ادیب اسحق

۲۱ جنوری ۱۸۵۶ء کو دمشق میں پیدا ہوئے اور کم و بیش ۱۴ سال کی عمر میں ایک ہزار سے زیادہ اشعار کہہ چکے تھے۔ بلا کے ذہین اور صاحب فہم تھے ادبی ذوق بہت بلند اور وسیع تھا تعلیم مکمل نہ ہوئی تھی کہ اُن کو فکر معاش میں مبتلا ہونا پڑا۔ ۵ سال کی عمر میں وہ بیروت چلے گئے اور وہاں کی علمی صحبتوں میں عزت کی نظر سے دیکھے جانے لگے۔ کچھ عرصہ بعد سرکاری ملازمت ترک کر کے جریدہ ”التقدم“ کی ادارت اپنے ہاتھ میں لے لی اور اب اُن کے زور قلم کے چرچے عام ہو گئے اس عرصہ میں علاوہ چند تصانیف کے فرانسیسی قونسل کی فرمائش پر ایک مشہور فریخ ڈرامہ کا ترجمہ عربی میں شایع کیا۔ یہ ڈراما عربی زبان میں جب انشیح پر آیا تو ادیب اسحق کا نام ہر بچہ کی زبان پر آنے لگا اسی کے بعد وہ انجمن ”زہرۃ الادب“ کے صدر منتخب ہو گئے وہ اہل اول مصر میں ایک ادیب اور اہل قلم کی حیثیت سے آئے۔ اسکندریہ میں اُن کے ڈرامے کھیلے جاتے تھے اور قاہرہ کی اعلیٰ صحبتوں میں وہ عزت کے ساتھ شریک کئے جاتے تھے۔ اُسی زمانہ میں سید جمال الدین

مصر آگئے تھے۔ ادیب اسحق جب قاہرہ پہنچے تو جاتے ہی شیخ کے حلقہٴ درس میں شامل ہو گئے۔ شیخ کے فیض صحبت کا یہ اثر تھا کہ اب انھوں نے مصر میں آزاد اخبار نویسی اختیار کی اور **مصر** میں اپنا پہلا عربی اخبار **مصر** کے نام سے جاری کیا۔ جامعہ ازہر میں شیخ جو لکچر دیا کرتے تھے اُن کو ادیب اسحق اپنے اخبار **مصر** میں شائع کیا کرتے تھے۔ کمال یہ تھا کہ اخبار کے لیے اُن کے پاس کوئی سرمایہ نہ تھا جب انھوں نے مصر کا پہلا پرچہ شائع کیا تو اُن کی جیب میں ۲۰ فرانک (گیارہ روپے آٹھ آنے) سے زیادہ نہ تھے۔ لیکن شیخ کی صحبت نے اُن کو تمام مشکلات سے بے پروا ہونا سکھا دیا تھا اور انتہائی تنگدستی کی حالت میں بھی اُن کا ارادہ کمزور نہ تھا۔ اخبار **مصر** چند ہی روز میں اس قدر مقبول ہوا کہ مالی دشواریاں سب رفع ہو گئیں کچھ عرصہ بعد انھوں نے ایک دوسرا روزنامہ ”التجارہ“ کے نام سے جاری کر دیا۔ ان جرائد کا جو اثر ملک کے تمام حالات پر مرتب ہوا اس کو صاحب ”مشاہیر الشرق“ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

”بلکہ میں ایک قسم کی حرکت اور بیداری پیدا ہونے لگی بات چیت اور اظہار خیالات میں حریت اور آزادی کا رنگ جھلکنے لگا۔ جمود اور بے حسی کے بادلوں میں جنبش اور اضطراب کی بری انکڑائیاں لینے لگی۔ اگرچہ یہ چیز عام طور پر ایک نوع کی جدت تھی جس سے قبل ازیں بہت کم دل و دماغ آشنا تھے۔

لیکن سب سے زیادہ حکومت نے اس کو محسوس کیا اور اس کو بہت سے خطرات کا گمان گزرنے لگا۔

چنانچہ دونوں جراید بحکم سرکار بند کر دیئے گئے۔ اس کے بعد ادیب سختی پیرس چلے گئے اور وہاں سے ”التاہرہ“ کے نام سے ایک اخبار جاری کیا ”مصر اور التجارہ“ سے بھی زیادہ ”القاہرہ“ مقبول ہوا۔ پیرس میں بیٹھ کر انھوں نے بیداری مصر کے متعلق اپنی پوری قوت صرف کر دی اور بجائے اس کے کہ اُن کے جراید کو بند کر کے حکومت مصر کچھ اطمینان حاصل کرتی اور زیادہ ترودات میں مبتلا ہو گئی۔ لیکن پیرس کی آب و ہوا سے اُن کی صحت بہت خراب ہو گئی اور نمونیا کے ایک شدید حملہ کے بعد اُن کا قیام وہاں بالکل نامکن ہو گیا۔ چنانچہ وہ پھر مجبوراً بیروت چلے گئے۔ بیروت میں اخبار ”استقدام“ کے مالک نے پھر اس اخبار کے فرائض ادارت اُن کے سپرد کر دیئے۔ ایک سال تک وہ بیروت میں مقیم رہے لیکن ۱۸۷۸ء کے اواخر میں جب وزارت مصریہ میں انقلاب ہوا تو وہ پھر قاہرہ گئے۔ اس مرتبہ ”نظارۃ المعارف“ میں اُن کو ایک عہدہ دیا گیا اور جریدہ مصر کے اجرائی کی اجازت بھی مل گئی۔ چند روز بعد وہ مصری پارلیمنٹ کے مقرر منتخب ہو گئے۔ اس لیے اخبار کی ادارت انھوں نے اپنے بھائی کی طرف منتقل کر دی لیکن وہ خود بھی اکثر مضامین لکھتے رہتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد جب مصر میں فوجی بغاوت شروع ہوئی تو انھوں نے اعرابی پاشا کی تائید کی اور بالآخر اُن کو

بیروت کی طرف بھاگنا پڑا۔ اسکندریہ پر انگریزوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد وہ پھر قاہرہ واپس آئے لیکن آتے ہی گرفتار کر لیے گئے اور بعد کو خایج البلد کر دئے گئے۔

اب تیسری مرتبہ بیروت میں انھوں نے اخبار ”التقدم“ کی عنانِ ادارت اپنے ہاتھ میں لی لیکن جب سے کہ پیرس میں اُن کی صحت بگڑی پھر کبھی نہ سنبھل سکی اور آخر وہ مجبور ہو کر تبدیل آب و ہوا کے خیال سے پھر اسکندریہ آئے، اس کے بعد لبنان چلے گئے اور وہیں ۱۸۸۵ء میں صرف (۲۹) سال کی عمر میں انتقال کیا۔ مرحوم اسلامی عہدِ جدید کے سب سے بڑے جادو نگار اور جادو بیان تھے۔ مزاج کی حدتِ حریت کا جوش ارادوں کی قوت یہ سب چیزیں اُن کے اندر جمال الدین کا ایک صبحِ عکس تھیں۔ ”کتاب الدرر“ مرحوم کے اقوال و مضامین کا ایک مجموعہ ہے جس میں جا بجا شیخ جمال الدینی افغانی کا تذکرہ آتا ہے۔ ادیب اسحق مفتی عبدہ اور اُن کے اُستاد شیخ کی تعلیمات کا سب سے زیادہ موثر نمونہ تھے۔

۱۵۔ جمیس سنا۔

شیخ کے رفقا میں سے ایک مصری یہودی تھے۔ بلنٹ نے ۱۸۸۲ء میں اُن کے حسب ذیل حالات اپنی کتاب میں لکھے تھے۔ جمیس سنا ”عرف ابو نظارہ“ آج کل پیرس میں رہتے ہیں۔ وہ اپنا اخبار ”ابو نظارہ“ شایع کرتے ہیں اور زبانوں کے معلم بھی ہیں۔ وہ مصر کے قوم پرستوں کی جماعت میں شریک ہیں اور (۳۰) سال سے

پیرس میں مقیم ہیں۔ یہاں اخباری دنیا میں وہ عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ آدمی بہت ظریف اور ذہین ہیں اور مصر میں شیخ اور محمد عبدہ کی صحبت میں رہ چکے ہیں۔ ان ہی دونوں نے سب سے پہلے اُن کو اخبار نویسی کی طرف راغب کیا۔ پہلے انہوں نے مصر سے اخبار نکالا اور خدیو اسماعیل کا بہت مذاق اڑاتے رہے۔ آخر وہاں سے نکالے گئے۔ تب پیرس میں قیام کر کے اپنا اخبار جاری رکھا۔ شیخ کی بے تکلف صحبت میں شریک ہوتے تھے اور منلوم ہوتا ہر کہ شیخ کے مخلص احباب میں سے تھے۔

۱۶۔ سعد زاعلول (۱۸۶۰ء - ۱۹۲۶ء)

مصری فلاحین میں سے تھے۔ ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے۔ ازہر میں تعلیم پائی اور مفتی عبدہ کے خیالات سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اوائل عمر میں ایک سرکاری اخبار کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے مگر اعرابی کی بغاوت کے سلسلہ میں معتبوب ہوئے اور جب برطانوی فوج نے اسکندریہ پر قبضہ کیا تو قید کر دیئے گئے۔ ۱۸۸۰ء میں وکالت شروع کی۔ پھر جج ہو گئے اور پھر ۱۹۰۱ء میں وزیر تعلیم اور ۱۹۱۰ء میں وزیر عدلیہ ہو گئے۔ وزیر عدلیہ کی حیثیت سے انہوں نے خدیو عباس پر فہن کا الزام لگایا۔ اس وقت لارڈ کچنر مصر میں برطانوی نمائندے تھے انہوں نے زاعلول کو استعفیٰ دینے کا حکم دیا۔ اس واقعہ کے بعد سے وہ کھلم کھلا انگریزوں کی مخالفت کرنے لگے۔ ۱۹۱۸ء میں جنگ عظیم کے ختم ہونے کے بعد انہوں نے مصر کی آزادی کا مطالبہ شروع کیا چنانچہ ۸ مارچ

۱۹۱۹ء کو گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیئے گئے۔ اُن کی گرفتاری کی وجہ سے مصر میں سخت بلوے ہوئے۔ ۱۹۲۱ء میں آزاد ہو کر پھر مصر آئے مگر پھر چند روز بعد جب انگریزی ”وخل“ کے خلاف بلوے شروع ہوئے تو اُن کو گرفتار کر کے عدن بھیج دیا گیا۔ ۱۹۲۲ء میں الجزار بھیج گئے مگر ۱۹۲۳ء میں پھر آزاد ہو گئے۔ ۱۹۲۴ء میں وزیر اعظم ہو گئے اور اُسی سال برطانوی مدبرین سے سمجھوتہ کرنے کے لیے لندن گئے مگر کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ ۱۹۲۵ء میں جب سردار سوڈان سرلی اٹیک قتل کیے گئے تو زراغلول کے خلاف انگریز بہت برا فردختہ ہو گئے اور ان کو وزارت سے استعفیٰ دینا پڑا لیکن چند ہی روز بعد اُن کو مصری پارلیمنٹ نے اپنا صدر منتخب کر لیا۔ قاہرہ میں ۲۳ اگست ۱۹۲۵ء کو انتقال ہوا۔

سعد زراغلول براہ راست جمال الدین کی تحریک کی ایک کڑی تھے۔ اُنھوں نے جمال الدین کے عقاید اپنے استاد مفتی عبدہ کے حلقہ درس میں حاصل کئے تھے۔ لیکن خود بھی جوانی کے زمانہ میں پیرس میں شیخ سے ملے تھے اور ان کی صحبت میں کچھ وقت گزارا تھا۔ مصری فلاہین کی بیداری کے متعلق شیخ کی مساعی کا نتیجہ یہی دو نمایاں اشخاص تھے۔ ایک اعرابی اور ایک سعد زراغلول۔

۱۰۔ شریف پاشا

مصر کے مشہور مدبر ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے۔ کئی بار وزیر اعظم بنائے گئے اور جب توفیق تخت پر بٹھایا گیا تو اُس وقت وزیر داخلہ اور وزیر خارجہ تھے۔ فرانس میں تعلیم پائی تھی۔ خیالات

زیادہ تر قوم پرستی کی طرف مائل تھے۔ چنانچہ ۱۸۶۶ء میں دستوری اصلاحات کی ایک اسکیم بھی پیش کی تھی مگر خدیو نے اُس کو نامنظور کیا۔ جب توفیق نے چاہا کہ سوڈان کا فیصلہ انگریزوں کے حسبِ منشاء کر دیے تو انھوں نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی اور اسی بنا پر استعفیٰ دیدیا۔ اعرابی نے اپنی بغاوت کے موقع پر یہ مطالبہ کیا تھا کہ شریف پاشا کو بھر وزیر اعظم مقرر کیا جائے۔ مصری قوم پرست ان کی عزت کرتے تھے۔

انھوں نے مصر میں سب سے پہلے ایک قومی پارٹی بنائی تھی جس کو برطانوی حکام پسند نہ کرتے تھے۔ آخری دفعہ وہ ۱۸۸۲ء میں وزیر اعظم بنائے گئے مگر اعرابی پاشا کی شکست کے بعد وہ برطانیہ کی پالیسی سے بیزار ہو کر دست کش ہو گئے اور ۱۸۸۶ء میں انتقال ہو گیا۔

۱۸۔ اعرابی پاشا

احمد اعرابی (۱۹۱۱ء - ۱۸۳۹ء) خلاصین کے ایک خاندان میں پیدا ہوئے ۱۸۶۲ء میں فوج کا کمیشن ملا۔ اُس زمانہ میں مصر کے قوم پرستوں میں یہ تحریک پیدا ہو رہی تھی کہ مصری حکومت اور فوج سے ترکی عنصر کو خارج کیا جائے۔ اس تحریک کے لیڈر علی ردبی تھے۔ اعرابی بھی اُن کی خفیہ انجمن میں شریک ہو گئے۔ جب اسماعیل کی معزولی کے بعد توفیق خدیو بنائے گئے اور فرانس و انگلستان نے مصری حکومت کے اہم شعبوں پر قبضہ کر لیا تو اعرابی نے حکومت مصر کی کمزوری اور غیر لگیوں کی مداخلت کے خلاف آواز بلند کرنی شروع کی۔ اُن کے ساتھ پس پردہ اور

بھی بہت سے مصری قوم پرست شریک تھے۔ سلسلہ میں اعرابی
 کے خلاف کورٹ مارشل بٹھایا گیا مگر وہ فوج کے سپاہیوں میں
 اس قدر ہر دل عزیز تھے کہ فوج اُن کو زبردستی جھڑا کرے گئی۔
 خدیو نے گھبرا کر محمد سامی کو وزیر جنگ بنایا اور کوشش کی کہ
 کسی طرح اعرابی کو گرفتار کرایا جائے۔ ۸ ستمبر سلسلہ کو اعرابی
 نے قصر عابدين کے سامنے ایک فوجی مظاہرہ کرایا اور خدیو کو
 مجبور کر کے ریاض پاشا کے بجائے شریف پاشا کو وزیر اعظم
 بنوایا۔ فوج کی تنخواہوں میں اضافہ کرایا اور دارالامرا کا اجلاس
 منعقد کرنے کی اجازت حاصل کی۔ اس وقت اعرابی کا اثر و نفوذ
 اس قدر زیادہ تھا کہ خدیو کی مجال نہ تھی کہ اُن کی خواہش
 کے خلاف کوئی عمل کرتا۔ چنانچہ سلسلہ میں اُن کو معتمد صیغہ
 جنگ مقرر کیا گیا۔ فروری سلسلہ میں جب شریف پاشا نے
 استعفیٰ دیدیا تو محمد سامی بے جو اعرابی جماعت کے رکن تھے وزیر
 اعظم بنائے گئے مگر اعرابی کے اس بڑھنے ہوئے اثر کو دیکھ کر
 برطانوی حکومت بہت بے چین ہو گئی۔ اور یہ ارادہ کر لیا گیا
 کہ اب فوجی کارروائی کر کے مصر میں برطانوی ”دخل“ کو مستحکم
 کر دینا چاہیے۔ برطانوی اور فرانسیسی مدبرین کے اس ارادہ کو
 معلوم کر کے اہل مصر کے اندر سخت ہسجان پیدا ہوا۔ اور اسکندریہ
 میں کئی دن تک سخت بلوے ہوتے رہے۔ ۱۱ جولائی سلسلہ
 کو برطانوی بیڑے نے اسکندریہ پر گولہ باری کی اور اپنی فوجوں
 کو ساحل پر اتار دیا۔ بہت کشت و خون ہونے کے بعد بلوہ فرو کیا گیا۔

اور اس کے بعد برطانوی فوج نے طل الکبیر پر اعرابی کی فوج کو شکست دی۔ کہا جاتا ہے کہ اعرابی کی فوج نے بعض افسروں کو رشوت دے کر نوڑ لیا گیا تھا۔ دسمبر میں اعرابی پر مقدمہ چلایا گیا اور سزائے موت کا حکم صادر کر دیا گیا۔ یہ مقدمہ مصری قوم کی نظر میں خاص اہمیت رکھتا تھا۔ بلٹ نے اس موقع پر مصری قوم پرستوں کے ساتھ اپنی غلصہ ہمدردی کا اعلیٰ ثبوت دیا اور اعرابی کی سزا کے خلاف ہر قسم کی کوشش جاری رکھی حتیٰ کہ بہت سارے پیہ اپنی جیب سے خرچ کیا اور ان ہی کی کوششوں کا یہ نتیجہ تھا کہ اعرابی کی سزائے موت کو جلا وطنی سے بدل دیا گیا۔ وہ سیلون بھیج دیے گئے اور ۲۰ برس تک وہ سیلون میں جلا وطن رہے۔ مئی ۱۹۱۷ء میں خدیو عباس دوم نے ان کو وطن آنے کی اجازت دی اور وہ مصر آ گئے۔ ۲۱ ستمبر ۱۹۱۷ء کو قاہرہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

مصر کی قومی تحریک میں اعرابی کا نام بہت نمایاں ہے گو کہ وہ براہ راست جمال الدین کی تعلیمات کے زیر اثر نہ آئے تھے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کا دامن اُسی تحریک سے بندھا ہوا تھا جو جمال الدین اور مفتی عبدہ نے مصر میں پیدا کی تھی۔ شیخ کے مصر سے چلے جانے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان سے اور اعرابی سے براہ راست تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔

اعرابی کی قوم پرستی کے متعلق خود لارڈ کرومر اپنی ایک کتاب میں حسب ذیل اعتراف کرتے ہیں:-

” اعرابی یورپ کی نظر میں جس تحریک کے نمایندے
تھے اس تحریک کے لیڈروں کی نیت کچھ بھی ہو
مگر وہ بلاشبہ ملک کی بد نظمی کے خلاف ایک حقیقی

احتجاج کی صورت تھی “ (Modern Egypt)

اعرابی کی سیاسیات خالص ملکی تھیں وہ ترک انگریز فرامشی
اور تمام غیر قومی اور غیر ملکی عناصر کے خلاف تھے اور یہ چاہتے
تھے کہ مصر صرف مصریوں کے لیے آزاد رہے۔

۱۹۔ ہمدی سوڈانی محمد احمد ابن سید عبداللہ (۱۸۸۵ء - ۱۹۰۵ء)

مارچ ۱۸۸۵ء میں ایک کشتی ساز کے گھر میں بمقام ڈنگولا پیدا
ہوئے۔ خرطوم کے شمال میں بود باش اختیار کی اور خضہ طریقہ پر دیہاتی
آبادی میں ٹیکسوں اور محاصل کے خلاف بددلی پیدا کرنی شروع کی۔
۱۸۸۵ء میں قاہرہ گئے جہاں اُن کی جمال الدین افغانی سے
ملاقات ہوئی اور بیان کیا جاتا ہے کہ آزادی سوڈان کے مسئلہ پر
اُن سے اور شیخ سے بہت کچھ مشورہ اور تبادلہ خیالات ہوا۔
قاہرہ سے واپس آنے کے بعد ہمدی نے جنگ آزادی کا نقشہ
بنانا شروع کیا اور بالآخر ۱۸۸۸ء میں اپنے ہمدی موعود ہونے کا
اعلان کر دیا۔ سوڈانی ہزار ہا کی تعداد میں ان کے جھنڈے کے
نیچے جمع ہونے لگے اور جب مصری فوجیں اس بغاوت کو فرو
کرنے کے لیے بھیجی گئیں تو ہمدی کی فوج نے اُن کو پی در پی
شکستیں دیں۔ ۱۸۸۸ء میں کہیں پاشا کے دس ہزار سپاہی قتل
کر دیے گئے۔ اُن کے خاص پیرو دغنے مشرقی سوڈان میں

ہل چل بچا دی۔

جس زمانہ میں مصر میں اعرابی کی شورش پیدا ہو رہی تھی تو سوڈان میں ہمدی کے معتقدین شدت کے ساتھ جہاد کر رہے تھے۔ سلسلہ میں جب برطانوی فوجیں مصر میں داخل ہوئیں تو اس واقعہ نے ہمدی کی فوجوں میں سخت غصہ اور جوش پیدا کر دیا۔ سلسلہ میں برطانوی حکومت نے مصری حکومت کو حکم دیا کہ سوڈان کا تصفیہ کر دیا جائے مگر جب مصری جنرل عبدالقادر پاشا کو ہدایت کی گئی کہ وہ سوڈان سے مصری حکام اور فوجوں کو واپس لائیں تو انہوں نے اس حکم کی تعمیل کرنے سے انکار کر دیا۔ تب جنرل گارڈن کو خرطوم بھیجا گیا اور خدیو نے جنرل موصوف کو سوڈان کا گورنر جنرل بنا دیا۔ خرطوم میں گارڈن کو ہمدی کی فوجوں نے گھیر لیا اور وہ وہیں مارے گئے اس کے بعد ہمدی کا انتقال ہو گیا۔ مگر دغنه برابر جہاد کرتا رہا۔ سلسلہ میں کچنر خرطوم بھیجے گئے اور ان کے مقابلہ میں دغنه کو ہٹنا پڑا۔ جنگ سلسلہ تک جاری رہی لیکن ۱۹ فروری سلسلہ کو دغنه نے آخری شکست کھائی اور اُس کے بعد سے ہمدی کی تحریک کا تقریباً خاتمہ ہو گیا۔

یہ واقعہ ہو اور شیخ نے خود بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ ہمدی کی تحریک میں شیخ کی تحریک کے اکثر کارکن شریک تھے اور فی الحقیقت یہ تحریک آزادی مصر کی وہی ایک تحریک تھی جس کا مظاہرہ مصر میں اعرابی نے کیا تھا۔ ہمدی سوڈان کے معاملات سے شیخ کا جو تعلق عرصہ تک قائم رہا اُس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چونکہ مصر کے علما عوام کے جوش کو ٹھنڈا کرنے

کے لیے ہمیشہ اس عقیدہ کی تبلیغ کیا کرتے تھے کہ ظہور مہدی سے پہلے جہاد حرام ہے۔ اس لیے وقتی مصالح کی بنیاد پر مہدی نے اپنے مہدی ہونے کا اعلان کرنا ضروری سمجھا تھا تاکہ جہاد میں مندرجہ بالا عقیدہ سدِ راہ نہ ہو۔ مجاہدین سے جس عہد نامہ پر دستخط کر لے چکے تھے اُس کی عبارت حسبِ ذیل تھی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”ہم نے اپنے آپ کو خدا اور رسول کے لیے بیع کر دیا ہے۔ ہم خدا کی توحید پر استقامت کے ساتھ ایمان لاتے ہیں۔ خدا کی مبودیت میں کسی چیز کو شریک نہیں کریں گے۔ بہتان نہیں باندھیں گے اور معرفت کی اطاعت سے روگردانی نہیں کریں گے۔ ہم نے اپنے کو ترک دنیا کر کے تمہارے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ اور جہاد سے نہیں بھاگیں گے“

۲۰۔ شاہ عبدالعظیم۔

یہ خانقاہ طہران سے آٹھ دس میل کے فاصلے پر ہے۔ طہران کے شمال میں کوہِ دماوند کی چوٹیاں نظر آتی ہیں۔ جنوب کی طرف بہت سے پرانے ٹیلے نظر آتے ہیں جو کسی زمانہ میں کربلا کے قافلوں کے راستہ پر نشانِ راہ کا کام دیتے تھے۔ ان ہی کے قریب سرسبز درختوں کے سایہ میں شاہ عبدالعظیم کی

چھوٹی سی بستی ہو اور اُسی کے قریب قدیم شہر رے کے آثار موجود ہیں۔ ایک زمانہ میں ایران میں بعض مقامات مجرموں کے لیے جائے پناہ سمجھے جاتے تھے۔ اور کوئی مجرم اگر ان مقامات میں پناہ لے لے تو گرفتار نہیں کیا جاسکتا تھا یہ ایک قدیم رسم تھی حتیٰ کہ شاہ کا صیقل بھی ایک جائے پناہ تھا اور اگر کوئی مجرم شاہ کے گھوڑے کی دم پکڑے تو وہ بھی گرفتاری سے محفوظ ہو جاتا تھا۔ اسی طرح یہ مشہور درگاہ تھی جہاں مجرم گرفتار نہیں ہو سکتے تھے اس پناہ کو حالت "بست" کہا جاتا تھا۔

۲۱۔ مرزا رضا خان کرمانی

ایرانی معتقدین میں سے شیخ کے خاص آدمی تھے۔ شیخ کے ساتھ اُن کی عقیدتمندی کا حال ان کے بیان سے جو گزشتہ صفحات میں درج ہو رہا ہے۔ پہلے تمباکو کے ٹھیکہ کے خلاف جو بلوے ہوئے اُن کے سلسلہ میں گرفتار کئے گئے۔ اُن کے والد کا نام ملا حسین عرف بہ ملا حسین بدر تھا۔ تمباکو کے بلوہ میں گرفتاری کے بعد اُن کی تمام جائیداد ضبط کر لی گئی اور بعض عمال حکومت نے اُن پر سخت مظالم کئے۔ ایک موقع پر مرزا کو اس قدر مارا پیٹا گیا کہ اُنھوں نے تنگ آکر اپنے پیٹ میں چاقو مار لیا۔ عرصہ تک جیل خانہ میں بند رہے پھر قسطنطنیہ میں شیخ کے پاس چلے گئے اور وہاں سے آخر دفعہ طہران آکر یکم مئی ۱۲۸۷ کو ناصر الدین شاہ کو قتل کر ڈالا۔

۲۲۔ ارنسٹ رینان - (۱۸۹۲-۱۸۲۳ء)

مشہور فرانسیسی فلاسفر و مستشرق، ابتدائی تعلیم زیادہ تر مذہبی ہوئی تھی۔ اور طبیعت کا رجحان بھی یہی تھا۔ مگر ۱۸۴۳ء میں انقلاب فرانسیس کا طبیعت پر بہت اثر ہوا۔ اسی زمانہ میں ایک کتاب مستقبل سائنس Future of Science لکھی۔ ۱۸۴۹ء میں فرانسیسی حکومت نے مختلف سائنٹفک تحقیقاتوں کا کام اُن کے سپرد کیا وہ اکثر Journal de کتاب میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ ۱۸۵۲ء میں انھوں نے اپنی مشہور کتاب Avarroes لکھی جس میں انھوں نے ابن رشد اور اُن کے فلسفہ سے بحث کی۔ اس کتاب کی وجہ سے اُن کو علمی اعزاز دیا گیا۔ اُن کا فلسفہ یہ تھا کہ خوشحالی کے مقابلہ میں کوئی چیز بھی کم قیمت نہیں اکثریت کا زیادہ سے زیادہ فائدہ محض ایک دھوکہ دینے والا اصول ہے اور اُن کا دعویٰ یہ تھا کہ انسان محض خوشحال ہونے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ ہر روز اُس کو یہ محسوس کرنا چاہیے کہ وہ گزرے ہوئے دن سے کچھ آگے بڑھ کر ایک منہاتے خیال پیدا کرتا ہے بعد کو Origine of Chemistry میں کلدانی اور یونانی زبان کے پروفیسر ہو گئے لیکن پادریوں نے اُن کے تقرر کی اس بنا پر مخالفت کی کہ اُن کے مذہبی عقائد خراب تھے۔ مگر بادشاہ ان سے بہت خوش تھا۔ ۱۸۶۰ء میں وہ ملک کے باہر علمی تحقیقات کرنے کے لیے بھیج دیے گئے۔ واپس آکر وہ پھر کالج میں پروفیسر ہو گئے۔ لیکن پہلے ہی لیکچر میں انھوں نے مسیح کو ایک عدیم المثال انسان کے الفاظ سے یاد کیا جس سے کیتھولک

پارٹی بہت برافروختہ ہوئی اور اس لکچر کو قابل اعتراض قرار دیکر اُن کو معطل کر دیا گیا۔ اس کے بعد وہ محض اپنے قلم سے معاش پیدا کرنے لگے۔ انھوں نے قدیم مسیحی مذہب کے نظریات کے پرچے اڑا دئے اور اپنے مباحث میں عقل و درایت کو حکم قرار دیا جس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ اُن کو اسلام کے خالص اصول توحید کو قبول کرنا پڑا۔

مذہب اور فلسفہ کے متعلق وہ بہت آزاد خیال تھے لیکن اسلام کے متعلق اُن کی رائے بحیثیت مجموعی اچھی نہ تھی۔

تاریخ وہ اسلامی عمومیت کے نظم سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ چنانچہ ایک موقع پر انھوں نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ: ”اپنی زندگی میں جب کبھی میں مسلمانوں کی مسجد میں داخل ہوا ہوں میں نے اپنے اندر اسلام کی طرف ایک خاص کشش محسوس کی ہے بلکہ مجھے اپنے مسلمان نہ ہونے پر افسوس ہوا ہے۔“ ابن رشد کے فلسفہ سے وہ بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے۔

چنانچہ اپنے ایک مضمون میں انھوں نے لکھا ہے:-

ہمارے پاس ابن رشد کو ایک مخلص مسلمان نہ تسلیم کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ اسلام کے متعلق جو کچھ تھوڑی بہت معلومات ہمیں حاصل ہیں اُن کو اسلام کے خالص عقاید اور تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں اور خود اسلام بھی ان باتوں کو غیر معمولی اور لغو قرار دیتا ہے۔ اسلام کے عقاید تو نہایت صاف ستھرے

اور صحیح خیالات کا مجموعہ ہیں۔“

اُن کا اور سید جمال الدین کا عرصہ تک علمی مقابلہ ہوتا رہا۔
اُن کا یہ مشہور مقولہ تھا کہ ”مذہب اور علم کا اتحاد اتنا ہی ناگزیر
ہے جس قدر کہ دنیا کی زندگی جس کے لیے وہ باعثِ افتخار ہیں۔“

ان کی تصانیف میں Origine of Chemistry اور تاریخ بنی اسرائیل

بہت مشہور ہیں۔

۱۲ اکتوبر ۱۸۹۱ء کو انتقال ہو گیا۔

۲۲۔ مرزا باقر ایرانی

ایران میں پیدا ہوئے۔ ہندوستان۔ چین۔ بخارا۔ اٹھ تان اٹلی
و فرانس کا سفر کیا۔ بغداد و عراق ہو کر لندن گئے۔ وہاں کچھ
دنوں رہنے کے بعد بیروت آئے یہاں شادی کر لی اور تین سال
تک مقیم رہے اس کے بعد ترکی حکومت کے خلاف کسی سیاسی
سازش میں متہم ہونے کی وجہ سے طہران چلے آئے اور وہیں
انتقال کیا۔ عملی سیاسیات میں بہت کم حصہ لیتے تھے مگر یہ عقیدہ
رکھتے تھے کہ مذہبی اختلافات دنیا سے مٹ جانے چاہئیں۔ بغیر
اس کے ترقی نہیں ہو سکتی۔

پروفیسر براؤن مریم کے استاد تھے۔ براؤن نے اُن کے صاحبزادے
مرزا محمد ابن باقر مدیر ”مجلتہ المقدر“ کو ایک خط میں لکھا تھا کہ

”میری اُن کی درزا باقر کی پہلی ملاقات ۱۲۸۵ یا ۱۲۸۶ء میں

ہوئی تھی میں نے اُن سے قرآن مجید کا درس لیا اور فارسی زبان
میں خود اُن کی منظوم تفسیر اُن ہی سے پڑھی اُن کی دوسری تصنیف

”شمسیہ لندنیہ“ ابھی شایع نہیں ہوئی ہے۔ بہت مشکل کتاب ہے اس کے اشعار بہت دقیق ہیں۔ مرحوم کو علوم دینیہ اور السنہ قدیم میں خاص درجہ کمال حاصل تھا۔ عربی۔ یونانی۔ انگریزی۔ فارسی اور ہندی کے عالم و ماہر تھے۔ پرنس ملکم خاں پر ان کا بہت اثر تھا جس زمانے میں پیرس سے ”عزودہ الوثقی“ جاری تھا تو مرزا باقر لندن میں تھے اور وہاں سے ”عزودہ الوثقی“ کے لیے مضامین اور خبریں بھیجا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ تک بلنٹ کے سکرٹری بھی رہے۔

۲۴۔ ملکم خاں

اصفہان کے امینی النسل باشندے تھے۔ ابتدائی زندگی میں طہران کے ایک مدرسہ میں درس تھے۔

پھر رقی کرتے کرتے لندن میں ایرانی سفیر مقرر ہوئے۔ اس زمانہ میں جب کہ وہ لندن میں تھے انھوں نے کوشش کی کہ شاہ ایران کو نظم سلطنت کی اصلاح پر آمادہ کریں۔ مگر بجائے اس کے کہ ان کا مشورہ قبول کیا جاتا وہ معنوب ہو گئے اور انھوں نے سفارت کے فرائض سے سبکدوشی حاصل کر کے ایران میں اصلاح اور آزادی کی تحریکات پیدا کرنی شروع کیں۔ سن ۱۸۹۸ء میں انھوں نے لندن سے ایک اخبار جاری کیا جس کا نام ”قانون“ تھا۔ اس اخبار کو خفیہ ذرائع سے ایران میں تقسیم کراتے تھے۔ اسی زمانے میں شیخ سے ملکم خاں کے تعلقات بہت گہرے ہو گئے ”قانون“ کے صفحات پر شیخ کے مضامین بھی شایع ہوا کرتے تھے جن میں بہت شدت کے ساتھ شاہ ایران پر حملے کئے جاتے تھے۔ ملکم خاں زیادہ ایسے

کے شروع ہونے سے پہلے وہ تجارتی کاروبار میں مشغول رہتے تھے
 ۱۸۸۳ء سے ۱۸۹۱ء تک وہ مشرقی سوڈان میں مہدی کی
 فوجوں کے سپہ سالار رہے اور سنہ ۱۸۹۱ء تک لارڈ کچنر کی فوج
 کا مقابلہ کرتے رہے۔ اس انقلابی تحریک میں اُن کا بڑا کارنامہ
 یہ ہے کہ سات برس تک انھوں نے سواکن اور بربر کے درمیان
 دشمن کا راستہ بند رکھا اور اسلیب کے مقام پر مصری فوج کو
 سخت شکست دی (سنہ ۱۸۸۵ء)۔ پھر طارپ پر مصری فوج کو
 تباہ کر دیا اس کے ایک سال بعد بیکر پاشا کی فوج کو
 شکست دی۔ ۱۸۹۱ء میں اُن کو اسمتھ پاشا نے شکست
 دی اور اس کے بعد وہ پہاڑوں میں پناہ گزیں ہو گئے۔
 لیکن جب سنہ ۱۸۹۴ء میں لارڈ کچنر نے بربر پر قبضہ کر لیا
 تو عثمان پھر میدان میں آ گئے مگر ہمدوی فوج کی شکست
 کے ایک سال بعد (سنہ ۱۸۹۵ء) انھوں نے پسا ہو کر بحر احمر
 عبور کرنے اور حجاز جانے کی کوشش کی۔ لیکن ایک مقامی
 شیخ کی دغا بازی کی وجہ سے سواکن میں مصری حکام کے ہاتھ
 میں گرفتار ہو گئے۔ اس کے بعد بہت عرصہ تک وہ قید رہے
 مگر سنہ ۱۹۲۴ء میں جب کہ اُن کی عمر بہت زیادہ ہو چکی تھی
 وہ قید سے آزاد ہو کر مکہ معظمہ آئے اور پھر وہاں سے واپس
 جا کر (سنہ ۱۹۲۶ء) وادی حیفہ میں انتقال کیا۔

سوڈان و مصر کے متعلق شیخ کے جدوجہد کے حالات سے
 بہت چلتا ہے کہ شیخ اُن سے خاص تعلقات رکھتے تھے اور

مہدی کی تحریک کے سلسلہ میں غالباً اُن کے اور شیخ کے درمیان خفیہ پیام و سلام بھی ہوتے رہے۔

۲۶۔ اعتماد السلطنہ

محمد حسین خان شیخ کے خاص اجاب میں سے تھے۔ کچھ عرصہ ایران میں وزیر مطالع بھی رہے اور صاحب تصنیف بھی تھے۔ اُن کی کتاب "المعاصر والعصر" بہت مشہور ہے جو طہران میں سنہ ۱۳۱۵ء میں شائع ہوئی۔

۲۷۔ حاجی مرزا حسن شیرازی

ایران کے مشہور مجتہدین میں سے تھے۔ سمارا میں رہتے تھے۔ ایران میں اُن کا بہت اثر تھا۔ ۱۸۹۵ء میں انتقال ہو گیا۔

۲۸۔ حاجی سید علی اکبر شیرازی۔

ایران کے مشہور قوم پرست مجتہد تھے۔ ناصر الدین شاہ کے سخت مخالف تھے اُن کو اُس نے خارج البلد کیا تو شیراز میں سخت بلوے ہوئے۔ اُس وقت اُن کا یہ قصور بتایا گیا تھا کہ وہ یورپین اقوام کے خلاف تعصب رکھتے ہیں۔ ایران سے خارج البلد ہو کر انھوں نے بصرہ میں اقامت اختیار کی اور وہیں سے شیخ کی تحریک پر حجت الاسلام کو خطوط لکھ کر ناصر الدین شاہ کے خلاف علماء کا حملہ شروع کرایا۔

۲۹۔ شیخ علی قزوینی۔

اول انقلاب ایران کے زمانہ میں بہت نمایاں قوم پرست تھے۔ اور پہلی ایرانی مجلس کے زمانہ میں قاضی عدلیہ بنائے گئے۔ جب شاہ نے پہلی مجلس کو شکست کیا تو اُن پر بھی سخت عتاب نازل ہوا۔ اور بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ باغ شاہ میں گرفتار کر لئے گئے۔

بعد کو قتل کرادیے گئے۔

۳۰۔ مرزا آقا خاں۔

اصلی نام عبدالحسین تھا۔ مرزا عبد الرحیم کے بیٹے تھے۔ ریاضی۔ سائنس اور فلسفہ کے بڑے ماہر تھے۔ ترکی۔ فرانسیسی اور انگریزی خوب جانتے تھے۔ شاہ کے مظالم سے تنگ آکر شیخ احمد روحی کرمانی کے ساتھ قسطنطنیہ چلے گئے۔ وہاں اخبار "اختر" کے نائب مدیر بن گئے۔ عرصہ تک شیخ کی خدمت میں حاضر رہے۔ آخر شاہ نے ترکی حکومت کو رضامند کر کے گرفتار کرا لیا۔ اور شیخ احمد کرمانی کے ساتھ تبریز میں قتل کر ڈالے گئے۔

"آئینہ سکندری" اُن کی ایک مشہور تصنیف ہے۔ شاہنامے کے طور پر ایک "نامہ بستان" بھی لکھا تھا اُن کے مرنے کے بعد یہ کتاب "سالاریہ" کے نام سے شائع ہوئی۔ تاریخ بیداری ایران میں اُس کے بعض دلچسپ حصے نقل کیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں شاہ ایران کو مخاطب کر کے ایران کی تباہی کا نوہ پڑھا گیا تھا۔ پروفیسر براؤن نے بھی اپنی کتاب "انقلاب ایران" کا دیباچہ ان ہی اشعار سے شروع کیا ہے:-

کہ کشور بہ بیگانگاں اوفست	بہ ایراں مباداں چناں روزید
بہ افتد بزیر جوانانِ روس	نہ خواہم زمانے کہ ایں نوعروں
شود ہم سرلردی انگلیس	بہ گیتی مباداں کہ ایں حوروں
کے جذبات سے بھری ہوئی تھیں۔	اُن کی تمام نظمیں اسی قسم
نہ گشتم بگرد کم و کاستی	بہ گیتی نہ جستم بجز راستی

ہمہ خیر اسلامیاں خواستم دلم را بہ نیکی بیاراستم
ہمیں خواستم تاکہ اسلامیاں بہ وحدت بہ بندند یکسریاں
ہمہ دوستی باہم افزوں کنند ز دل کین دیرینہ بیرون کنند

در اسلام آمد بعزیمید یکے اتحاد سیاسی پدید
شدہ ترک ایران و ایران ترک مانند دوی در شہاں سترگ
ہماں نیز دانند گاہ عراق بسلطان اعظم کنند اتفاق
زد ہماں ز دانیہ این کینہ زود بگویند سنی و شیعہ کہ بود

گزاریم قانون بیگانگی بہ گیریم آئین فسرزائی
ازیں بس ہمہ کفر سازیم پست بیاریم جھتی سراسر بدست
پہر ناصر الدین شاہ کا ذکر کرتے ہیں۔

دلے از مسلمانیش بود بہر بہ نیکی مرا شہر کردی بہ دھر
چو در خون او جوہر شرک بود نہ توحید اسلام خشمش فزود
پیشینرے بہ از شہر یارچین کہ نے کیش دار و نہ انیں دیں

ز کشتن نہ ترسم کہ آزادہ ام ز مادر ہمیں مرگ را زادہ ام
بجوش از سر و تنم بے مژدہ است دلم گنج گوہر قلم از دہاست
۳۱۔ شیخ احمد روحی کرمانی

شیخ الاسلام مرزا محمد جعفر کے دوسرے بیٹے تھے۔ ۱۸۵۵ء میں پیدا ہوئے۔ بہت قابل مقرر اور عالم و فاضل اور شاعر بھی تھے۔ رومی

تخلص تھا۔ سلسلہ میں اپنے دوست مرزا آقا خاں کے ساتھ کرمان سے اصفہان گئے پھر طهران آئے۔ پھر رشت گئے۔ چونکہ ناصر الدین شاہ اُن سے ناخوش تھا اس لئے قسطنطنیہ چلے گئے۔ بہت پُر جوش قوم پرست تھے۔ اور اسی لیے شیخ کے خاص احباب میں سے تھے۔ قسطنطنیہ میں اُنھوں نے تحریک اتحاد اسلام کے متعلق بہت جدوجہد کی۔ اسی غرض سے ترکی۔ انگریزی۔ فرانسیسی زبان سیکھی اور درس دینے لگے۔ یہی اُن کا وسیلہ معاش تھا۔ شیخ کی ہدایت کے مطابق اُنھوں نے اور مرزا حسن خاں خیر الملک اور مرزا آقا خاں نے کربلا و نجف کے مجتہدین کو شاہ کے خلاف خطوط لکھے۔ شیخ احمد کی مہر میں یہ مصرعے کندہ تھے کہ

داعی اتحاد اسلام احمد روحی آمدہ تائم

ناصر الدین کے اشارہ سے سلطان نے ان تینوں دوستوں کو نظر بند

کر دیا۔ اور یہ قیدی میں تھے جب مرزا رضا خاں نے طهران جا کر ناصر الدین کا کام تمام کیا۔ اس قتل کے سلسلہ میں مظفر الدین شاہ نے کوشش کر کے سلطان کی اجازت حاصل کی اور ان تینوں کو گرفتار کر کے ایران بلا لیا۔ اور یہ الزام لگایا کہ یہ تینوں ناصر الدین شاہ کے قتل کے مشورہ میں شریک تھے۔ ۱۱ جولائی کو تبریز میں یہ قیدی امین السلطنہ کے سامنے پیش کیے گئے اور محمد علی مرزا دلی عہد ایران کی موجودگی میں اُن کے سر کی کھال اتار لی گئی اور اُس میں ٹھس بھر دیا گیا۔ پھر یہ سر طهران بھیج دیئے گئے۔

شیخ کے یہ تینوں رفیق ایران کے شہدائے آزادی میں شمار کئے جاتے ہیں۔

۳۲۔ شیخ الرئیس ملائے طالقانی

ایران کے مشاہیر قوم پرستوں میں سے تھے۔ شیخ کی تعلیمات سے بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ ۱۲۹۰ھ کے ایرانی انقلاب تک زندہ رہے۔ شاعر بھی تھے جس وقت سسے میں دستور کا اعلان کیا گیا ہی تو اُن کی ایک نظم پڑھی گئی تھی۔ مشہور کتاب "اتحاد اسلام" کے مصنف تھے۔ ۳۳۔ عالی پاشا

محمد امین، ولادت ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۰ء) رشید پاشا کے بیٹے تھے جو محکمہ تنظیمات کے رئیس تھے۔ ۱۲۸۵ھ میں وزیر اعظم ہوئے۔ اُس زمانہ کی ترکی قوم پرستوں کی جماعت سے بہت ہمدردی رکھتے تھے۔ اُن ہی کی کوشش سے "خط ہمایونی" جاری ہوا تھا۔ اور اُن ہی کی تحریک اصلاح کو مدحت پاشا اور مدحت کے بعد آنے والے ترکی احرار نے تقویت دی۔ کچھ عرصہ لندن میں ترکی سفیر بھی رہے۔ پانچ دفعہ وزیر اعظم ہوئے ۱۲۸۷ھ میں انتقال ہوا۔

۳۴۔ فواد پاشا

والد کا نام عزت ملا تھا۔ ولادت ۱۲۸۲ھ میں ہوئی۔ سلطان عبدالعزیز کی تخت نشینی کے بعد ہائیکورٹ کے صدر مقرر ہوئے۔ پھر وزیر خارجہ ہو گئے بعد کو وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز کیے گئے۔ سیاسی اصلاحات کے بہت بڑے حامی تھے۔ اور مدحت پاشا کے خاص شرکار کار میں سے تھے۔

.....



عُرُوۃُ الثَّمَنِ کے چار مقالے

پہلا مقالہ

العُرْوَةُ الْوُثْقَى لَا انْفِصَامَ لَهَا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہر انسانِ حقّیٰ اَحَبُّ النَّاسِ اَنْ يَّتَرَكُوْا اَنْ يَّعُوْا اَمَنًا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلْيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلْيَعْلَمَنَّ الْكَافِرِيْنَ کیا ان لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ اتنا کہنے پر جھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لے آئے اور اُن کو آزمایا نہ جائے گا۔ ہم تو اُن لوگوں کو بھی آزمایا ہے جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ سو اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو جان کر رہے گا جو سچے تھے اور اُن کو بھی جو جھوٹے ہیں۔ لوگ بلکہ اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے (اور ایمان کی کچھ نشانیاں ہوتی ہیں) پھر یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ انہیں یونہی چھوڑ دیگا اور اُن کے اس دعوے سے کوئی تعرض نہ کرے گا حالانکہ یہ غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ حاکم عدل ہے قبل اس کے کہ لوگوں کے بہترین عمل کی آزمائش کرے یہاں تک کہ خود اُن پر اُن کی حقیقت آشکارا ہو جائے، وہ اُن کے اس گمان کی عملی جانچ کر لے گا اور لوگ خود بھی جان لیں گے کہ آیا وہ حقیقت میں مومن ہیں یا یہ اُن کے نفس کا گھڑا ہوا دعوے، اُمیدوں کا فریب اور ادھام کا دھوکا ہے کہ وہ اپنے آپ کو کچھ سمجھتے ہیں

حالاں کہ وہ کچھ نہیں ہیں۔ وَلَمَّا يَدْحُلُ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِهِمْ۔ اور ابھی تک ایمان اُن کے دلوں میں داخل نہیں ہوا، آگاہ رہو کہ یہ لوگ اپنے اس گمان میں غلطی پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ مغرور کو اس کی گمراہی میں ہرگز نہ چھوڑے گا۔ وہ اس کے دعوتِ ایمان کی ضرورت جانچ کرے گا لِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّادِقِينَ تاکہ اللہ جہاد کرنے والوں اور صبر کرنے والوں کو جان لے کہ لَانْ لَا تَكُونُ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّتًا۔ تاکہ اللہ پر لوگوں کے لیے حجت باقی نہ رہے)

بے شبہ حکیم مطلق نے کتابیں نازل فرمائیں۔ رسول بھیجے وعدے وعید کیے۔ ڈرایا۔ بشارت دی۔ اُس کا فرمایا ہوا سچ اور اُس کا وعدہ حق ہو کہ وہ ہر شخص کو سزا دے گا جس نے اپنا عقیدہ ایسے خیال پر قائم کیا ہو جس کا کوئی اثر نہ ہو یا ایسے گمان کو بنائے اعتقاد سمجھا ہو جس سے سعادتِ سرمدی و نعیمِ ابدی کو کوئی لگاؤ نہ ہو۔

جو شخص اپنے زعم سے مبتلا ہے فریب ہو اپنے ادہام کی ٹاپکیوں میں سرگرداں ہو اُس کے لئے ایمان جیسی چیز جو خدا کی راہ میں مشقتوں اور دشواریوں کے برداشت کرنے کا نام ہی آسان نہیں اور ایسا شخص ان منافقوں کے گروہ سے کچھ علیحدہ نہیں جن کے لیے ابدی شقاوت اور دائمی عذاب کا حکم بارگاہِ خداوندی سے صادر ہو چکا ہے۔

ایمان ہر خواہش کو مغلوب کرتا اور ہر آرزو کو دبا تا ہے۔ وہی نفس کو بغیر کسی اور رہنما کے اللہ کی رضامندی طلب کرنے کے لیے رجوع کرتا ہے۔ اللہ جو سب سے زیادہ راست گفتار ہے فرماتا ہے: لَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ يَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ

وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِٱلْمُتَّقِينَ ؕ اٰمَنَّا بِسْتَاذِنِكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَٱلْيَوْمِ ٱلْآخِرِ وَارْتَابَتْ
 قُلُوْبُهُمْ ذَمُّهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ؕ جو لوگ اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان
 لاتے ہیں وہ مجھے اس بات کی اجازت نہیں طلب کرتے کہ وہ اللہ کے راستہ میں
 اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ جہاد کریں گے۔ اللہ پر ہیزگاروں کو جانتا ہو
 مجھے تو وہی لوگ اجازت طلب کرتے ہیں جو اللہ اور قیامت پر
 ایمان نہیں لاتے اور اُن کے دل مشکوک ہیں اور اس لیے وہ اپنے
 شبہ میں سرگرداں ہیں۔

یہ ہو اللہ کا فیصلہ اور حکم اُن لوگوں کے خلاف جو فریضہ ایمان
 کے ادا کرنے میں جانوں اور مالوں کے صرف کرنے کی نسبت طالب
 اذن ہوتے ہیں۔ اُن کے متعلق صاف ارشاد ہو کہ ایسے لوگ ایمان نہ
 لائیں گے۔ بیشک خدا کا ارشاد بالکل صحیح ہو۔ اس کی کتابیں درست
 کہتی ہیں۔ اور رسولوں نے سچ کہا ہو۔ یقیناً عقایدِ راستہ کی کچھ نشانیاں
 ہیں۔ جن کا ظہور عزائم و اعمال میں ہوتا ہو اور انکار و واردات میں
 اُن کی تاثیر نمایاں ہوتی ہو۔ معتقدین جب تک معتقدین کے زمرہ میں
 رہیں گے ان نشانیوں سے الگ نہیں رہ سکتے۔ یہی حال ایمان کا
 اُس کی تمام نشانوں اور صورتوں میں ہو اس کی خاصیتیں۔ صفتیں اور
 خصوصیتیں بھی اس سے جدا نہیں ہوتیں نہ اخلاقِ عالیہ و عادات
 حسنہ میں اور ایمان میں کوئی بتاؤں ہوتا ہو۔ صدر اسلام میں مومنین
 اس صفت میں ممتاز تھے اور جو لوگ عقیدہ میں اُن کے خلاف
 تھے وہ بھی اُن کے عزم و علو مرتبت کے معترف تھے۔

بیشک اُن ہی لوگوں نے اللہ کی آزمائش و ابتلا کی آگ میں صبر و

پامردی دکھائی یہاں تک کہ اُن کا ایمان ہر کھوٹ اور ملاوٹ سے کندن کی طرح صاف اور خالص ہو کر چمکنے لگا۔ یہ اُن کے صبر ہی کا انعام تھا۔ اللہ کی آزمائش اور اُس کا امتحان اِس خصوص میں کتنا سخت ہوتا ہے اور اُس کی حکمت کس درجہ دقیق اور اہم ہوتی ہے لَیْسَیْزَ اللّٰہُ الْحَنِیْیْتُ مِنَ الطَّیِّبِ۔ تاکہ اللہ پاک اور ناپاک کو الگ کر دے،

بیشک اللہ تعالیٰ کی آزمائش میں عادتوں کا ترک۔ مشقوں کا تحمل اموال کا صرف اور جانوں کا سودا سبھی کچھ شامل ہے۔ ہر خطرہ جو ہلاکت کا باعث ہو اُس سے دور رہنا چاہیے مگر ایمان اِس سے مستثنیٰ ہے۔ اِس میں ہر مہلکہ نجات اور وہ موت جو تحفظِ ایمان کے سلسلہ میں ہو بقائے ابدی اور ہر وہ مصیبت جو حقوقِ ایمان کے ادا کرنے میں پیش آئے سعادتِ سرمدی ہے۔ مومن اپنا مال مقتضائے ایمان کے موافق صرف کرتا ہے اور فقر و افلاس سے نہیں ڈرتا وَإِنْ كَانَ الشَّیْطَانُ یَعِدُّهُ الْفَقْرَ۔ اگرچہ شیطان اِس سے فقر کا وعدہ کرتا ہو یعنی دھمکی دیتا ہو، ایمان کا حق ادا کرنے میں جو کچھ صرف کیا جائے اُس میں کوئی اسراف نہیں۔ خواہ اُس میں تمام دولت کیوں نہ اٹھ جائے۔

بلاشبہ اِس زندگی کے مادرا مومنین کے لیے ایک اور بھی زندگی ہے جس کی لذتیں اِس زندگی سے مختلف ہیں۔ اِس زندگی میں جو سعادت ہے وہ شیطان کی سجائی ہوئی سعادت سے الگ ہے۔ اِس باب میں مومن کا نقطہ نظر یہی ہے۔ اگر اُس کے دل سے ایمان من بھی کر گیا ہے تو وہ معاملات کو اسی نظر سے دیکھے گا۔ خواہ غایتِ کمال کو نہ پہنچا ہو۔

ایمان میں اللہ تعالیٰ کی محنت و آزمائش سے بھاگنا ابدی رسوائی کا

باعث ہو مگر اہی کے لشکر سے ٹکرانے میں گریز کرنا دائمی شقاوت کا موجب ہے۔ خواہ وہ تصور سے زیادہ پُر خطر کیوں نہ ہو۔ سعادت صرف دینی سعادت کا نام ہے اور دین کی حفاظت جان جو حکم کا معاملہ ہے۔ ایمان کے لیے سخت تکالیف اور دشواری سے ادا ہونے والے فرائض معین ہیں اَلَا عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا اللَّهُ قُلُوبُهُمْ لِتَقْوَىٰ مِمَّنْ لَّوْگُوں پر جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقوے کے لیے آزمایا ہے۔

فرائضِ ایمان کے ادا کرنے کا کام مصائب و کمزوریاں سے گھرا ہوا ہے اور کیوں نہ ہو ایمان کے لیے سب سے پہلے جو چیز واجب ہے وہ انسان کا نفس مال اور شہوت کی قیود سے نکل آنا ہے اور ان سب کو اپنے رب کے احکام کے ماتحت رکھنا ہے۔ کوئی مومن اُس وقت تک ہرگز مومن نہیں ہو سکتا جب تک خدا اور رسول اُسے اپنی جان سے زیادہ عزیز و محبوب نہ ہوں۔

مومن کے نفس کو سب سے پہلے جو احساس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ اس دنیا میں ایک دوسرے گھر کا سفر کرنے کے لیے مسافر کی حیثیت سے آیا ہے اور وہ گھر اس دنیا سے بہتر اور زیادہ پائیدار ہے۔ صاحبِ ایمان کا پہلا قدم جاں نذر کرنا ہے جب کہ داعیِ ایمان صرفہ جان کی طرف بلائے۔ اور کوئی دعوت اللہ کے نبیوں کی زبان سے جاری ہونے والی ندائے حق سے زیادہ قوی الحجت اور بلند بانگ نہیں۔ اللہ ایمان کی حفاظت میں کسی عذر کو قبول نہیں کرتا اور نہ کسی علت کو جب تک کہ آدمی کے پاؤں چلتے آنکھیں دیکھتی اور ہاتھ کام کرتے ہیں۔ مومن کے لیے اللہ کا امتحان اُس کے اُن قاعدوں میں

سے ہر جن کی بنا پر صادقین اور منافقین کا امتیاز ہوتا ہے۔ ہر صدی میں اللہ تعالیٰ مومنین کو ایک سخت اور ہیبت و دبدبہ والی قوم کی طرف بلاتا ہے۔ فَإِنْ تُطِيعُوا يُؤْتِكُمُ اللَّهُ أَجْرًا حَسَنًا لَّئِنْ تَتَوَلَّوْا كُفَرْتُمْ فَعَذَابُ اللَّهِ عَظِيمٌ۔ اگر وہ اطاعت کریں گے تو اللہ انہیں اچھا بدلہ دے گا اور اگر بھرجائیں گے تو دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا۔ اللہ کے انصاف کی میزان قیامت تک کھڑی رہے گی اور نہایت کافی صلہ ملے گا۔ اس لیے جو لوگ اپنے خیالی اور رسمی ایمان پر قانع ہوں وہ ہرگز یہ گمان نہ کریں کہ اللہ کا عدل انہیں اور اُن کے گمانوں کو یونہی چھوڑ دے گا كَلَّا لَآتِيهِمْ فِي كُلِّ عَاصٍ يُفْتَنُونَ۔ ہرگز نہیں وہ تو ہر سال آزمائے جاتے ہیں، جو لوگ اپنے جان و مال کے ڈر سے دین کے معاملہ میں کمی کرتے ہیں۔ انہیں سوچنا چاہیے کہ اللہ کے علم میں اُن کی حیثیت و منزلت کیا ہوگی آیا وہ کچھوں میں شمار ہوں گے یا جھوٹوں میں۔ اللہ تعالیٰ ایمان داروں کو اُن کی بھلائی کے وسائل دکھائے اور اُن کے مالِ کاری کی خوشخبری دے۔

دوسرا مقالہ

مشاہدہ گواہ ہے کہ بعض انسانی افراد سے ایسے امور ظہور میں آچکے ہیں جن سے عقلیں دنگ اور فہم و قیاس کی قوتیں حیران ہیں۔ کمزور عقل کے لوگ ان امور کو دیکھتے اور انہیں معجزہ سمجھنے لگتے ہیں۔ اگرچہ اُن کا ظہور زمانہ نبوت سے تعلق نہیں رکھتا۔ وہ انہیں خوارقِ عادات کا درجہ دیتے ہیں۔ گو انبیاءِ رسل سے اُن کا صدور نہیں ہوا۔ بعض کم عقل انہیں افلاک اور ارواح کو اکب کی حرکات کا نتیجہ خیال کرتے ہیں۔ یا ستاروں کی موافق رفتاروں کا بعض ایسے بھی ہیں جو صحیح بات کے سمجھنے اور اسباب کے دریافت کرنے سے قاصر رہ کر انہیں اتفاقی امور قرار دیتے ہیں۔

اعمال و اسباب کی وابستگی :-

مگر جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے حکمت و ہدایت عطا کی ہے وہ خوب جانتا ہے کہ حکیم و خیر خدا نے ہر حادثہ کو ایک سبب اور ہر فعل کو ایک عمل سے وابستہ کر دیا ہے۔ اور تمام کائنات میں صرف انسان کو عقل اور روحانی قدرت کا مخصوص انعام عطا کیا ہے تاکہ وہ ان دونوں کی بدولت عجائبِ امور کا منظر اور مکالیف (فرائض) شرعیہ کا سزاوار

بن جائے۔ یہی دو چیزیں ہیں جن کی بنا پر انسان عقلاً کے نزدیک مدح و ذم کا مستحق اور خدا کے نزدیک ثواب و عذاب کا مورد بنتا ہے۔ حصول کمال کی فطری استعداد

جس وقت کوئی صاحب بصیرت صحیح قیاس کی طرف رجوع کرتا ہے تو اسے بشری فطرت اور انسانی قوتوں کے تشابہ میں یہ حقیقت واضح طور پر نظر آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو حصول کمال کی استعداد عطا کی ہے اور اس میں وہ خاصے و دیوتے فرمائے ہیں جن کی بدولت خفیف سے تفاوت کے ساتھ کم و بیش تمام انسان فضائل اعمال کا مصدر بن سکتے ہیں۔

حقیقت میں یہ مقام سخت حیرت میں ڈالنے والا ہے کہ جب انسانی خلقت میں کمال کی فطری استعداد ہے۔ ہر فرد میں فخر و امتیاز کے حصول کی پوری رغبت موجود ہے۔ ہر شخص اللہ تعالیٰ کے اس فضل عام کی بدولت بڑے بڑے کام کر کے ممتاز اور مفتخر بننے کا آرزو مند نظر آتا ہے۔ اور ایسے فضل و عطا سے مستفید ہو سکتا ہے۔ جو کسی طالب کو نامراد اور کسی سائل کو ناکام نہیں رہنے دیتا بشرطیکہ ارادہ میں صداقت اور سعی میں خلوص ہو۔ تو انسانی جنس کے ایک بہت بڑی اکثریت کے ہمیشہ پستیوں میں پڑے رہنے اور خداداد استعداد کے باوجود کمال مقصود تک پہنچنے سے قاصر رہنے کی کیا وجہ ہے۔ اس حیرت میں خصوصیت سے اس وقت اور اضافہ ہو جاتا ہے جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ لوگ اللہ کے عدل پر ایمان رکھتے ہیں اس کے وعدہ و وعید کی تصدیق کرتے۔ باقیات صالحات پر

ثواب کے امیدوار ہوتے اور برائیوں کے ارتکاب پر اُس کے عذاب سے خوفزدہ رہتے ہیں اور قیامت جیسے زبردست اور اٹل دن اَلْیَوْمَ تَجْزِي كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ۔ جب کہ ہر نفس اپنے کیے کا بدلہ پائے گا، مَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ۔ جو ذرہ برابر بھلائی بازہ برابر برائی کو لگا اسے دیکھ اور اس کی سزا و جزا پائے گا، کے برحق ہونے کا بھی اعتراف کرتے ہیں۔

پستی و بے عملی کا اصل سبب :-

آخر وہ کیا چیز ہے جو نفوس کو عمل سے باز رکھتی ہے۔ انسان کن وجوہ سے مذلتوں کے عمیق غار میں پڑے ہوئے ہیں۔ جب مسببات کو اسباب کی طرف رجوع کر کے حقائق کا انکشاف کیا جاتا ہے تو ہمیں اس کا ایک سبب نظر آتا ہے جو تمام اسباب کی جڑ ہے اور ایک ایسی علت محسوس ہوتی ہے جو تمام خللوں کی اصل ہے اور وہ جہن (بزدلی) ہے۔

جہن ہی وہ چیز ہے جس نے بڑے بڑے ملکوں کے ستونوں کو کھوکھلا کر کے انہیں مہدم کر دیا ہے۔ اسی نے اقوام کے رشتے منقطع کر کے اُن کا شیرازہ نظم منتشر کیا اور اسی نے بڑے بڑے بادشاہوں کے عزائم میں سستی پیدا کر کے اُن کے تحت الٹ۔ یہ۔ عالی رتبہ اشخاص کے دل ضعیف کیے اور اُن کے فلک فرسا محلات کو زمین بوس بنا دیا یہی طالبانِ خیر کے لیے خیر و سلوک کے دروائے بند کراتا اور سب کی نگاہوں سے ہدایت کو معدوم کرتا ہے۔ اسی کی بدولت نفوس ذلت و مسکنت کا بوجھ آسانی سے اٹھاتے ہیں اور

غلامی کا بھاری جوا گردن پر رکھنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ شے ہے جو اہانت کو صبر سے اور ذلت کو استقلال سے برداشت کرنے کی تلقین کرتی ہے اور دہم و گمان سے زیادہ وزنی مصائب کے تحمل پر آمادہ کر دیتی ہے۔ ایسے وزنی مصائب کہ شجاعت و پامردی کی صفت سے آراستہ ہونے کی صورت میں اُن کا خیال بھی نہیں کیا جاسکتا۔ بزدلی نظر کو ننگ و عار کا لباس پہناتی ہے۔ بزدل دلتوں کی ناہمواریوں کو سہل و ہموار اور سختی و شدت کی زندگی کو خوشگوار سمجھنے لگتا ہے۔

نہیں بلکہ وہ ہر گھڑی موت کی تلخی کا مزہ چکھتا ہے پھر بھی ہر حال میں راضی رہتا ہے۔ اس کی نظر صرف دشمنوں کو دیکھتی ہے دوستوں کو نہیں۔ اُس کا نفس صرف سختی کا اور احساس صرف اذیت کا اور اک کر سکتا ہے۔ غرض اس طرح وہ زندگی بھر ہر چیز کو بغیر کسی شے کے ضائع کرتا رہتا ہے اور گمان یہ کرتا ہے کہ بامراد ہے اور مقصد کے حصول میں کامیاب ہے۔

جہن کی تعریف اور اس کا سبب :-

جہن نفس کے ہر ایسے واقعہ سے بچنے کی سعی کا نام ہے جو اُس کے مناسب حال نہ ہو۔ اور اُس کا شمار اُن روحانی امراض میں ہے جو وجود کی اُس محافظ قوت کو تباہ کر دیتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے جہات طبعی کا ایک رکن بنایا ہے۔ جہن کے یوں تو بہت سے اسباب ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ مرض صرف موت کے خوف سے پیدا ہوتا ہے۔

موت :-

موت ہر زندہ کا مال اور ہر ذی روح کا مرجع و مآب ہے۔ موت کے لیے کوئی جانا پہچانا وقت ہے نہ معلومہ ساعت۔ تاہم آغازِ پیدائش کے وقت سے کابل بڑھاپے کے درمیان ہر گھڑی اس کا ٹھکا لگا رہتا ہے ہر لمحہ اس کا انتظار کیا جاتا ہے مگر اس کے آنے کا یقینی وقت سوائے اللہ کی ذات کے کسی کو معلوم نہیں۔ وَمَا تَذَرْنِي نَفْسٌ مَّاذَا لَكَ يَسْبَغُ غَدًا وَ مَا تَذَرْنِي نَفْسٌ بَآئِي أَصِي قَمُوتُ۔ (آیت) کوئی نفس نہیں جانتا کہ کل وہ کیا مکاتے گا نہ کسی کو یہ معلوم ہے کہ وہ کہاں اور کس سرزمین میں مرے گا۔

جب موت کا خوف بڑھ جاتا ہے اور حتمی انجام کی طرف غافل ہونے اور سعادتِ دنیا و آخرت کی خدا داد استعداد کو فراموش کر دینے کی وجہ سے اس خوف میں شدت پیدا ہو جاتی ہے تو یہ ہلک مرضِ نفس میں جڑیں مضبوط کر لیتا ہے اور انسان اللہ کی عطیہ قوتوں کا مصرف بدل دیتا ہے۔

بیشک یہ انسان کی غفلت ہی کا ثمرہ ہے کہ جو چیز زندگی کو بچانے والی ہے یعنی شجاعت و جسارت اُسی کو وہ فنا کا سبب خیال کرنے لگتا ہے۔ نادان ہر قدم پر خطرہ محسوس کرتا ہے۔ حالانکہ اگر وہ اپنے انسانی آثار پر نظر کرے۔ طالبانِ ترقی و عظمت کے فوزِ مرام اور اُن کی زیرِ کردہ مشکلات کا تصور کرے تو ایک ہی نظر میں معلوم ہو سکتا ہے کہ ان تمام خطرات کی حقیقت وہموں اور شیطانی وسوسوں سے زیادہ نہیں۔ یہی دوسو سے اُس پر چھا جاتے

ہیں۔ اسے اللہ کے راستے سے دور ہٹا کر ہر نیکی سے محروم کر دیتے ہیں۔
جبن کے نتائج و ثمرات :-

جبن زمانہ کی گردشوں اور غولوں کا بچھایا ہوا ایک جال
 ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے انسانی نفوس کو پھانسا اور اقوام کو
 ہڑپ کر لیا جائے۔ وہ ایک شیطانی کندہ ہے جس سے شیطان
 خدا کے بندوں کو اسیر کرتا اور اُس کے راستے سے ہٹا دیتا ہے۔
 وہ ہر رذالت کی علت اور ہر بُری خصلت کا مبداء و منشا ہے۔ دنیا
 میں کوئی بد بختی ایسی نہیں جو اس سے نہ پیدا ہوئی ہو۔ کوئی فساد ایسا
 نہیں جس کے جراثیم اس میں نہ ہوں وہ ہر قسم کے کفر کا باعث
 و موجب ہے جماعتوں کا درہم برہم کرنا اور مربوط و محکم بنیادوں کو
 توڑ دینا اس کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ یہ لشکروں کو شکست دیتا جھنڈوں
 کو داڑگوں کرتا اور بادشاہوں کو عظمت و رفعت کے آسمان سے
 ذلت و رسوائی کی خاک پر پھینک دیتا ہے جو چیز وطنی جنگوں میں
 خائنتوں کو خیانت پر اکساتی ہے کیا اسی کا نام جبن نہیں ہے۔ جو
 خیال کم حوصلہ اور کمینہ لوگوں کے ہاتھ رشوت لینے کے لیے دراز
 کرتا ہے کیا اسے جبن نہیں کہتے۔

غور کیجئے تو معلوم ہو جائے گا کہ فقر سے جو خوف پیدا ہوتا
 ہے وہ بھی حقیقت میں موت ہی کے خوف کا ثمرہ ہوتا ہے اور یہی
 جبن کی علت ہے۔ اب اُس کا کذب و نفاق اور میشتِ انسانی
 میں فساد پیدا کرنے والے تمام امراض سے تعبیر ہونا بالکل واضح
 ہو گیا۔ حقیقت میں جبن ہر انسانی فطرت رکھنے والے کے لیے ننگ

و عار ہر خصوصاً اُن لوگوں کے لیے جو اللہ رسول اور یوم قیامت پر ایمان رکھتے اور یہ توقع رکھتے ہیں کہ انھیں اُن کے اعمال کا اچھا بدلہ ملے گا۔

ابنائے ملتِ اسلام سے مخاطب :-

ابنائے ملتِ اسلام کو چاہیے کہ اپنے دینی حالات کے مقتضا کو ملحوظ رکھتے ہوئے جن جیسی ناقص صفت سے سب سے زیادہ دور بھاگیں۔ کیونکہ ابنائے ملت (یعنی مسلمان) کو اللہ کی رضامندی کے سوا اور کسی چیز کی تلاش نہیں اور یہ (جن) اللہ کے پسندیدہ فرائض کے ادا کرنے میں سب سے بڑا مانع ہے۔

قرآن کریم کی تلاوت کرنے والے خوب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے موت کی محبت کو ایمان کی علامت قرار دیا ہے۔ اور اسی سے دشمنوں کے دلوں کو آزمایا ہے۔ وہ ان لوگوں کے متعلق جو مومن نہیں ہیں فرماتا ہے (الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا يَدَيَكُمْ وَاقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيقٌ مِنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللَّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً أَوْ قَالُوا رَبَّنَا لِمَ كُتِبَتْ عَلَيْنَا الْقِتَالُ لَوْ لَا أَخَّرْتَنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ۔ کیا تو نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکو نماز قائم کرو زکوٰۃ دو۔ پھر جب اُن کے لیے لڑائی مقرر ہوئی تو اُن میں سے ایک گروہ انسانوں سے اس طرح ڈرنے لگا جس طرح خدا سے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اور اس گروہ نے کہا کہ اے رب ہمارے تو نے ہمارے لیے لڑائی (کی شرکت) کیوں مقرر کر دی تو نے ہمیں تھوڑی مدت تک اور کیوں نہ رکھا)

حق کے راستے میں قدم بڑھانا اور اُس کے کلمہ کو بلند کرنے میں اموال و ارواح کو صرف کر دینا مومنین کی پہلی نشانی ہے۔ کتاب الہی نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کی ہے کہ نماز قایم کی جائے زکوٰۃ ادا کر دی جائے اور ہاتھ روکے جائیں ان چیزوں کو تو اُن امور میں شمار کیا ہے جن میں مومن کافر اور منافق بظاہر مشترک ہیں۔ بلکہ اس نے ایمان کی واحد دلیل عدل الہی اور اعتدال کلمتہ حق میں جان نشاری کو قرار دیا ہے اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ اسے دجان نشاری کو، ایک بے بدل رکن شمار کیا ہے۔ اسلام اور ہزدلی کا اجتماع ناممکن ہے:-

کوئی یہ نہ گمان کرے کہ ایک ہی دل میں دین اسلام اور جہن دونوں کو جمع کرنا ممکن ہے۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے جب کہ اس دین کا ہر جزو شجاعت و اقدام کا تصور پیش کرتا ہے خدا کے لیے اخلاص اس کا رکنِ عظیم ہے اور اُس کی رضا کے حصول کے لیے اس کے سوا ہر چیز کو چھوڑ دینا سرمایہ سے بڑا فرض قرار دیا گیا ہے۔

مومن تو وہ ہے جو یقین رکھتا ہو کہ موت کا وقت اور تقدیر اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے وہ اُنہیں جس طرح چاہتا ہے کام میں لاتا ہے اور ادائے فرض میں تاخیر کرنا موت کے وقت کو بڑھا نہیں سکتا نہ اس میں پیش قدمی کرنا موت کے وقت کو گھٹا سکتا ہے۔ ہر صورت میں موت بغیر ایک لمحہ کی تاخیر کے مقررہ وقت پر آپہنچتی ہے۔

مومن وہی ہر جو اپنے نفس کے لیے دو میں سے ایک نیکی کا متوقع رہتا ہر یا سردار اور باعزت بن کر زندہ رہے یا شہید بن کر مر جائے کہ اُس کی رُوح اعلیٰ علین میں ملائکہ مقربین کا ساتھ دے سکے۔ جو شخص اس دہم میں پڑا ہر کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے ایمان اور جہن کو ایک ساتھ جمع کیا جاسکتا ہر وہ شخص اپنے نفس کو دھوکا دے رہا ہر۔ عقل کو فریب میں ڈالے ہوئے ہر۔ اُس کی ہوس اُسے بہلا رہی ہر اور حقیقت میں اس میں ایمان کا شائبہ تک نہیں۔
 علما کو نصیحت :-

قرآن کریم کی ہر آیت بزدل کے دعوتی ایمان کو جھٹلا رہی ہر اسی لیے ہم ورثہ انبیا (علما) سے توقع کرتے ہیں کہ وہ علانیہ طور پر حق کا اظہار کریں۔ آیاتِ الہی کو یاد کریں۔ اُن میں اعلائے کلمتہ اللہ کے لیے قدم بڑھانے کا جو حکم اور اُس کے مقررہ واجبات و فرائض کے ادا کرنے میں سستی و تاخیر کی جو ممانعت ہر اُسے یاد دلائیں۔

گمان غالب ہر کہ اگر علما اس فریضہ کی ادائی اپنے ذمہ لے لیں یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تکلیف تھوڑے دن گوارا کریں۔ معافی قرآن سب کو سمجھائیں۔ اور مومنین کے نفوس میں اس کی عظمت دوبارہ زندہ کر دیں تو اُس کا اثر اس قوم میں اتنا مستقل اور پائیدار ہو جائے گا کہ قیامت تک اُس کا

ذکر باقی رہے گا۔

در اصل مومنین نے جو صفات اپنے اسلاف سے ورثہ میں پائی ہیں اور عقائد کے جو آثار اُن کے قلوب میں متمکن ہیں وہ اُنہی کا کافی ہیں کہ اُن کے لیے تھوڑی سی تنبیہ اور ایک ذرا سا اشارہ ہی بہت ہے جس کے نتیجہ میں وہ شیروں کی طرح بپھریں گے۔ اور جو کچھ کھو چکے ہیں اُسے پالیں گے۔ جو موجود ہے اُس کی حفاظت کریں گے اور اللہ کے یہاں مقام محمود حاصل کر سکیں گے۔ فقط

❖ ❖ ❖

❖ ❖

❖

تیسرا مقالہ

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

مسلمانوں کے دین میں ایسی قوت و شدت اور اُن کے یقین میں اس درجہ ثبات و استقامت پائی جاتی ہے کہ وہ اس کی بدولت دوسری قوموں پر فخر کرتے ہیں اور اُن کا یہ فخر بالکل بجا ہوتا ہے۔ اُن کا عقیدہ ہی ایسا ہے کہ اُس میں ایک دوسرے سے ربط پیدا ہونے کے مضبوط ترین اسباب مہیا رہتے ہیں۔ یہ اعتقاد اُن کے نفوس میں نہایت رسوخ کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے کہ اللہ اور اُس کے رسول کے لاتے ہوئے احکام پر ایمان رکھنے میں سعادت و ابرین کی کفالت ہے اور جو شخص ایمان سے محروم رہتا ہے وہ دونوں جہان کی سعادتوں سے بے نصیب رہ جاتا ہے۔ وہ کسی شخص کے دین سے منحرف ہو جانے پر اتنا افسوس کرتے ہیں کہ اگر وہ مرجاتا تو اتنا افسوس نہ کرے۔ یہ حالت صرف علما ہی میں نہیں پائی جاتی عوام میں بھی اسی درجہ کا احساس موجود ہے۔ کوئی شخص خواہ وہ روئے زمین کے کسی حصہ میں ہو عالم ہو یا جاہل ہو اگر دنیا کے کسی شخص اور کسی قوم کے آدمی کے متعلق بھی یہ سُن لیتا ہے کہ وہ مذہب اسلام

سے بھر گیا تو اُسے انتہا درجہ کا قلق اور بے حد صدمہ ہوتا ہے وہ اس خبر پر بے اختیار اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھتا ہے اور اس واقعہ کو اپنے اور تمام ہم مذہبوں کے لیے بہت بڑی مصیبت خیال کرتا ہے۔ پھر یہی نہیں اگر تاریخ میں بھی اسی قسم کے واقعہ کا ذکر آجاتا ہے اور کوئی مسلمان مطالعہ کرنے والا دو سو برس کے بعد اس کا تذکرہ پڑھتا ہے تب بھی اُس کا دل قابو سے باہر ہو جاتا ہے خون میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ غصہ کے آثار چہرہ سے نمایاں ہو جاتے ہیں اور وہ ہر واقعہ کا ذکر ایک عجب اور نئی بات کی طرح کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ مسلمان شریعت اور اُس کے صریح دلائل و احکام کے لحاظ سے اپنی ولایت میں داخل ہونے والے لوگوں کی حفاظت کے ذمہ دار اور خدا کے نزدیک جواب دہ ہیں اس باب میں قریب و بعید کا کوئی فرق نہیں نہ اختلاف جنس و قوم کا کوئی اثر ہے ہر شخص ہر جگہ یکساں طور پر مامور ہے۔ یہ چیز ایک فرض عین ہے۔ اگر کوئی قوم اپنے زیر حفاظت اشخاص کی حفاظت نہ کرے گی تو سب کو بہت بڑا گناہ ہوگا۔

مسلمانوں پر جو اُمور اعانت نفوس و حفاظت بلاد کے سلسلہ میں فرض ہیں اُن میں حسب ذیل خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ جانا و مال صرف کرنا ہر سختی کو جھیلنا خواہ کوئی حادثہ پیش آتے اُس کا دلیرانہ مقابلہ کرنا۔ اس کام میں مسلمانوں کو ان لوگوں سے جو کسی اعتبار سے اُن پر غالب ہوں اُس وقت تک صلح کرنا مباح نہیں جب تک وہ اپنا مخصوص ملک اُن سے نہ حاصل کر لیں۔

بیاد و سروری کے حصول میں شریعت نے اس حد تک مبالغہ کیا ہے کہ اگر کوئی مسلمان غیر کے تسلط سے رہائی حاصل کرنے میں عاجز رہے تو اُس پر دارالحرب سے ہجرت کرنا واجب ہے۔ وہ فائدے ہیں جو شریعت اسلامیہ میں بالکل ثابت و واضح ہیں۔ اہل حق اُن سے خوب واقف ہیں۔ ہوا پرستوں اور غرض کے بندوں کی تادیلات کسی زمانہ میں بھی انہیں تبدیل نہیں کر سکتیں۔

ہر مسلمان اپنے ضمیر سے ایک آواز سنا اور محسوس کرتا ہے جو اسے شریعت کے مطالبہ کو یاد دلاتی ہے اور فریضہ ایمان کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ یہ وہی آواز ہے جو مسلمان کے دینی الہامات میں سے اس کے لیے اب تک باقی ہے اور باقی رہے گی۔ مگر ان سب کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل اس مذہب کے پیروں میں سے بعض لوگ ایک دوسرے کی مصیبت سے بے پروا اور بے خبر ہیں۔ مثلاً اہل بلوچستان اپنی آنکھوں کے سامنے افغانستان کے حالات دیکھتے رہے۔ اُن میں کوئی حرارت و جوش پیدا نہ ہوا اور انہوں نے اپنے افغانی بھائیوں کی حمایت کے لیے ذرا بھی حمیت محسوس نہ کی۔ یا دوسری طرف افغانی بلادِ فارس میں غیروں کی مداخلت کا تماشا دیکھا کیے اور اُن میں بے چینی اور اضطراب و ناگواری کا کوئی اثر نہ دیکھا گیا۔ انگریزی فوجوں نے مصر میں آتے جاتے خوب کشت و خون اور قتل و غارت سے کام لیا مگر اُن کو خوزری کی سیر دیکھنے اور اُن کے حلقوں سے دردناک صدائیں سننے والے بھائیوں میں زرا غیبت نہ پیدا ہوئی۔

حقیقت میں ان عقیدوں کا حامل ہونے اور اپنے نفوس ہیں جذبہ حق کا احساس رکھنے کے باوجود مسلمانوں کی یہ حالت نہایت تعجب و حیرت کا باعث ہے اور ہمیں مجبور کرتی ہے کہ اُس کے اسباب بھی بیان کریں۔ اس لیے مختصراً کچھ اسباب بیان کئے جاتے ہیں۔ بلاشبہ عقلی افکار دینی عقاید اور تمام معلومات و مدرکات اور نفسی و جہدانیات سب تقدیر الہی سے صدور میں آتی ہیں۔ اگرچہ یہ اعمال پر اکساتی ہیں۔ لیکن بعد میں اعمال بھی انھیں قوی و پائیدار بناتے ہیں جہاں تک کہ انہیں بلکہ اور خلق سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اُن پر اُن کے مناسب آثار مترتب ہوتے ہیں۔ بالیقین انسان اپنے افکار و عقاید ہی کی بدولت انسان ہے۔ جو چیز اس کے آئینہ عقل میں نظر کے مشاہدات اور حواس کے مدرکات سے منعکس ہوتی ہے اس میں نہایت شدید اثر پیدا کرتی ہے۔ اس صورت میں ہر مشاہدہ سے ایک خیال اور ہر خیال سے خواہش میں ایک اثر پیدا ہوتا ہے۔ پھر ہر خواہش سے عمل رونما ہوتا ہے اور عمل سے دوبارہ فکر و خیال کی طرف رجعت ہوتی ہے۔ اس طرح جب تک جسموں میں رو میں باقی رہتی ہیں اعمال و افکار کے درمیان فعل و انفعال کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔

عقل کے نزدیک اخوت اور وسائل نسب و قرابت کی بھی ایک صورت معین ہے۔ اگر ضرورت و حاجت حصول منافع میں رشتہ داروں اور وارثوں کے تعاون پر اور دفع ضرر میں اُن کی اعانت و تقویت پر آمادہ نہ کرتی اور اس معادنت پر ایک زمانہ

گزرنے کے بعد قلبی نسبت ایک ایسا ماخذ اختیار کر سکتی جس سے یہ نسبت زندگی پھر برانگیختہ ہوتی رہے اور رشتہ کی مدد اور قلب کی بنیاد سے نفس میں انبساط رونما ہوتا رہے تو جو نکتہ و نقصان و جدائی کی طرح محسوس ہوتا رہتا ہی قرابت درشتہ کو کبھی لاحق نہ ہوتا بلکہ اس کا معاملہ اتنا شبہ میں ڈال دیتا کہ بعض اہل نظر اسے طبعی خیال کرنے لگتے۔

پس اگر صلہ نسب کو اس کے علم و استواری کے بعد چھوڑ دیا جائے اور ضروریات زندگی کسی وقت اس صلہ کے امکان و تائید کی دعوت نہ دیں یا مقصد اعانت نسب کے علاوہ کسی دوسری شکل سے حاصل ہو سکے تو اس نسبی رابطہ کا اثر جاتا رہے گا اور عقل میں اس کی صورت صرف روایات و منقولات کے طور پر باقی رہے گی۔ نسبی رابطہ انسانوں کے درمیان قوی ترین رابطہ ہے جو مثال اس کی بیان کی گئی وہی شان اعتقادات کی ہے جن کا اثر انسانی اجتماع میں ایک دوسرے سے ارتباط کا باعث ہونے کی وجہ سے مسلم ہے۔ اس اصول کے بیان کرنے اور اُس پر نگاہ فراست سے نظر ڈالنے کے بعد اس کا سبب اچھی طرح واضح ہو جائے گا کہ مسلمانوں میں اتنی مذہبی شدت کے باوجود جمود کیوں ہے اور وہ اپنے عقاید میں سب سے زیادہ مستقل و ثابت قدم ہونے کے باوجود کس لیے اپنے بھائیوں کی مدد سے دور ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے مابین اب وہ پہلی سی جامعیت باقی نہیں صرف دینی عقیدہ ہے جو اپنے لوازم یعنی اعمال سے خالی ہے۔

حقیقت میں ان عقیدوں کا حامل ہونے اور اپنے نفوس میں جذبہ حق کا احساس رکھنے کے باوجود مسلمانوں کی یہ حالت نہایت تعجب و حیرت کا باعث ہے اور ہمیں مجبور کرتی ہے کہ اُس کے اسباب بھی بیان کریں۔ اس لیے مختصراً کچھ اسباب بیان کئے جاتے ہیں۔ بلاشبہ عقلی افکار دینی عقاید اور تمام معلومات و مدرکات اور نفسی وجدانات سب تقدیر الہی سے صدور میں آتی ہیں۔ اگرچہ یہ اعمال پر اکساتی ہیں۔ لیکن بعد میں اعمال بھی انھیں قوی و پائیدار بناتے ہیں جہاں تک کہ انہیں بلکہ اور خلق سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اُن پر اُن کے مناسب آثار مترتب ہوتے ہیں۔ بالیقین انسان اپنے افکار و عقاید ہی کی بدولت انسان ہے۔ جو چیز اس کے آئینہ عقل میں نظر کے مشاہدات اور جو اس کے مدرکات سے منعکس ہوتی ہے اس میں نہایت شدید اثر پیدا کرتی ہے۔ اس صورت میں ہر مشاہدہ سے ایک خیال اور ہر خیال سے خواہش میں ایک اثر پیدا ہوتا ہے۔ پھر ہر خواہش سے عمل رونما ہوتا ہے اور عمل سے دوبارہ فکر و خیال کی طرف رجعت ہوتی ہے۔ اس طرح جب تک جموں میں روئیں باقی رہتی ہیں اعمال و افکار کے درمیان فعل و انفعال کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔

عقل کے نزدیک اخوت اور دسائل نسب و قرابت کی بھی ایک صورت معین ہے۔ اگر ضرورت و حاجت حصول منافع میں رشتہ داروں اور وارثوں کے تعاون پر اور دفع ضرر میں اُن کی اعانت و تقویت پر آمادہ نہ کرتی اور اس معادنت پر ایک زمانہ

گزرنے کے بعد قلبی نسبت ایک ایسا ماخذ اختیار کر سکتی جس سے یہ نسبت زندگی پھر برانگیختہ ہوتی رہے اور رشتہ کی مدد اور قلب کی بشاشت سے نفس میں انبساط رونما ہوتا رہے تو جو نکتہ و نقصان و جدائیات کی طرح محسوس ہوتا رہتا ہو قرابت درشتہ کو کبھی لاحق نہ ہوتا بلکہ اس کا معاملہ اتنا شبہ میں ڈال دیتا کہ بعض اہل نظر اسے طبعی خیال کرنے لگتے۔

پس اگر صلہ نسب کو اس کے علم و استواری کے بعد چھوڑ دیا جائے اور ضروریاتِ زندگی کسی وقت اس صلہ کے امکان و تائید کی دعوت نہ دیں یا مقصد اعانت لب کے علاوہ کسی دوسری مشکل سے حاصل ہو سکے تو اس نسبی رابطہ کا اثر جاتا رہے گا اور عقل میں اس کی صورت صرف روایات و منقولات کے طور پر باقی رہے گی۔ نسبی رابطہ انسانوں کے درمیان قوی ترین رابطہ ہو جو مثال اس کی بیان کی گئی وہی شان اعتقادات کی ہو جن کا اثر انسانی اجتماع میں ایک دوسرے سے ارتباط کا باعث ہونے کی وجہ سے مسلم ہو۔ اس اصول کے بیان کرنے اور اُس پر نگاہ فراست سے نظر ڈالنے کے بعد اس کا سبب اچھی طرح واضح ہو جائے گا کہ مسلمانوں میں اتنی مذہبی شدت کے باوجود جمود کیوں ہو اور وہ اپنے عقاید میں سب سے زیادہ متقل و ثابت قدم ہونے کے باوصف کس لیے اپنے بھائیوں کی مدد سے دور ہیں۔

واقعہ یہ ہو کہ مسلمانوں کے مابین اب وہ پہلی سی جامعیت باقی نہیں صرف دینی عقیدہ ہو جو اپنے لوازم یعنی اعمال سے خالی ہو۔

ان میں باہم تعارف کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور وہ ایک دوسرے سے غیر مستحق طور پر جدا ہو گئے خود علما جو عقاید کی حفاظت اور لوگوں کی ہدایت پر قائم ہیں باہم راہ رسم اور مراسلت روا نہیں رکھتے پھر عوام کا کیا ذکر ہے۔ ترکی عالم مجازی عالم کے حال سے نااہل ہے۔ ہندی عالم افغانی سلطنت کے احوال سے ناواقف ہے اسی پر دوسروں کو قیاس کر سکتے ہیں۔ بلکہ ایک ہی ملک کے علما میں آپس میں رشتہ ارتباط اور وجہ اتحاد نہیں پائی جاتی۔ اگر کہیں ہو تو اس کی وجہ عام افراد کے خاص وجہ مثلاً دوستی یا آپس کی قرابت سے مختلف نہیں۔ غرض ان کی ہمت کئی یہی نظر آتی ہے کہ نہ ان میں کوئی وحدت پائی جاتی ہے نہ کوئی مناسبت۔ ان میں سے ہر ایک اپنی طرف نظر رکھتا ہے اور اپنے ہی مقصد کو سراہتا ہے۔

جیسا افراق و اختلاف علما میں نظر آتا ہے ویسا ہی مسلمان حاکموں اور بادشاہوں میں دیکھا جاتا ہے۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ عثمانی (ترکی) بادشاہوں کی کوئی سفارت مراکش میں موجود نہیں نہ مراکش کی سفارت عثمانیوں کے یہاں قائم ہے۔ کیا یہ حیرت کا مقام نہیں ہے کہ دولت عثمانیہ کے صحیح تعلقات افغانیوں یا مشرق کے اور مسلمان جماعتوں سے نہیں ہیں۔ ان ہی بے ربطی اور قطع تعلق پیدا کرنے والے امور سے یہ نوبت آگئی ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ مسلمانوں کی ایک قوم سے دوسری قوم میں اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں کوئی علاقہ نہیں ہے تو بالکل صحیح ہوگا۔ صرف ایک تھوڑا سا احساس اس بات کا باقی ہے کہ بعض قومیں ہمارے دین پر

ہیں اور ہمارے جیسا عقیدہ رکھتی ہیں۔ یا کبھی کبھی حج کے زمانہ میں ایک دوسرے سے اتفاقاً مل لیتے ہیں تو کچھ اُس کے خیالات معلوم ہو جاتے ہیں۔

اس نوع کا احساس نہایت تاسف و ملال کا باعث ہے۔ ایک مسلمان اپنی ملت سے بیگانہ۔ اجنبی شخص کے ہاتھوں دوسرے مسلمان کا حق ضائع ہوتا دیکھتا ہے مگر اپنے ضعف کی وجہ سے اس کی مدد کو تیار نہیں ہوتا۔ پہلے ملت اسلام قوی البیان صحیح المزاج زبر دست جسم کی طرح تھی پھر اُس پر ایسے عوارض نازل ہو گئے کہ اُس کے اجزا میں پیوند و التیام کی قوت کمزور ہو گئی اور وہ نوبت آگئی کہ ہر جزو الگ الگ ہو کر جسم کی ہیئت بھی مضمحل ہو جائے۔

ملت اسلامیہ کے روابط میں یہ ضعف و ضللال اُسی وقت سے شروع ہو گیا جس وقت خلفائے عباسیہ نے شرف علم فقہانہ فی الدین اور مذہب کے اصول و فروع میں اجتہاد کی فضیلت سے قطع نظر کی اور صرف "خلافت" کے نام پر قانع ہو گئے۔ اس طرح انھوں نے علمی مرتبہ کو خلافت کے مرتبہ سے جدا کر دیا اور خلفائے راشدین کے خلاف جو دونوں کے جامع تھے ایک نیا طریقہ اختیار کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بکثرت مذاہب پیدا ہو گئے اور تیسری صدی ہجری سے اس قدر اختلاف شروع ہو گیا کہ کسی دین میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ پھر خلافتِ فاطمیہ اور اطرافِ اندلس میں خلافتِ امویہ۔ اس طرح اتحادِ ملت کے بجائے افتراق امت کی بنا پڑ گئی اور منصبِ خلافت گھٹتے گھٹتے بادشاہی بن کر رہ گیا۔ خلافت کی

ہیبت دلوں سے بھل گئی حکومت و سلطنت کے طلبکاروں نے قوت و شوکت کے وسائل سے کام لینا شروع کیا اور منصب خلافت کی رعایت ترک کر دی۔ اختلاف سختی کے ساتھ بڑھ گیا۔ اس کے بعد چنگیز خاں تیمور لنگ اور اُن کی اولاد کے ظہور اور مسلمانوں پر اُن کے حملوں نے انہیں اتنا ترتر بتر کر دیا کہ وہ اپنے آپ ہی کو بھول گئے۔ اتفاق و اجتماع بالکل رخصت ہو گیا۔ بادشاہوں اور عالموں سب کے مابین پیوند و ارتباط کے تعلقات قطعاً منقطع ہو گئے۔ ہر ایک نے اپنے اغراض سامنے رکھے۔ جماعت اکائیوں میں اور لوگ فرقوں میں تبدیل ہو گئے۔ ہر ایک نے ایک مبلغ یا داعی کا اتباع اختیار کیا۔ بادشاہ ہو یا مذہب۔ ان وجوہ سے وہ عقاید جو وحدت کی دعوت دیتے تھے اُن کے آثار ضعیف ہو گئے۔ اور عقلوں میں صرف اُن کی ذہنی صورتیں باقی رہ گئیں۔ جنہیں خیالات احاطہ کیے ہوئے ہیں اُن کو قوتِ حافظہ صرف اس وقت یاد دلاتی ہے جس وقت اُسے اپنی معلومات پیش کرنا ہوں۔ اب اُن کی نشانیوں میں سوائے حسرت و افسوس کے کچھ باقی نہیں رہا۔ حسرت و افسوس بھی اُس وقت طاری ہوتا ہے جب بعض مسلمانوں پر مصائب کا نزول ہو چکتا ہے اور ایک مدت کے بعد اس کی اطلاع پہنچتی ہے۔ یہ افسوس اسی قسم کا ہے جیسا کہ فوت شدہ چیز پر یا اعزہ و اقارب کی وفات پر رونما ہوتا ہے اور کوئی ایسی تحریک نہیں کرتا جس سے مصیبت کا تدارک ہو سکے۔

شارع علیہ السلام کی زبان سے جو حق وراثت علما کو حاصل ہو اُس کا حق ادا کرنے کے لیے علما کا فریضہ ہے کہ وہ رابطہ دینی کے احیاء کے لیے اپنے اس اختلاف کا تدارک کریں۔ جو ابنائے دین میں پیدا ہو چکا ہے اور اس اتفاق کو قائم کریں جس کی طرف دین بلاتا ہے۔ مساجد میں اور اپنے مدارس میں اس اتفاق پر عہد لیں یہاں تک کہ ہر مسجد اور ہر مدرسہ رُوح وحدت کی منزل اور ہر فرد ایک ہی زنجیر کی کڑی کی طرح بن جائے کہ جب اُس کے ایک سرے کو ہلایا جائے تو اُس کے ہلانے سے دوسرا سرا بھی ہلنے لگے۔ علما۔ خطبا۔ ائمہ۔ واعظین تمام روئے زمین میں ایک دوسرے سے مرتبط و متحد ہو جائیں اور مختلف ممالک میں اپنے مرکز بنالیں کہ مواقع اتحاد پر اُس کی طرف رجوع ہو سکیں۔ عوام کی رہنمائی قرآن کریم اور اثر صحیح (حدیث) کے مطابق کریں۔ مختلف مقامات کے مرکوزوں کا ایک مرکز کلی قرار دیں۔ جس پر سب کو جمع کرنے کی سعی کریں یہ مرکز مقامات مقدسہ میں ہو۔ جن میں سب سے اشرف و انسب حرم کعبہ ہے۔ اس طریقہ سے وہ دین کو مضبوط و محفوظ بنا سکیں گے۔ اور دشمنوں کے حملوں سے بچا کر آفات و حوادث کے مواقع پر اُمت کی ضروریات پوری کر سکیں گے۔ اغیار و اجانب کی مداخلت کا خطرہ کم ہو جائے گا اور اشاعتِ علوم اجلائے عقل اور بدعات سے دین کی حفاظت کا مقصد بھی بدرجہ اتم پورا ہوگا۔ چونکہ روابط کا استحکام علمی مدارج کی تعین اور فرائض کی تقسیم و تجدید سے وابستہ ہے۔ اس لئے اگر کوئی بانی بدعت ظلم و بدعت کا آغاز

کرے تو عوام میں اُس کی ترویج سے پہلے مختلف طبقوں سے مل کر اُس کی بدعت کو مٹایا جاسکتا ہے اور اُس کا تدارک کیا جاسکتا ہے۔ یہ طریقہ اُمت کی قوت و اتحاد اور حوادث کے دفیعہ کی قدرت کے لیے جتنا بہتر و مکمل ہے اہل بصیرت سے مخفی نہیں۔ مگر ہمیں یہ دیکھ کر انتہائی افسوس ہوتا ہے کہ مسلمان علما و مفکرین کے خیالات اس وسیلہ کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ حالانکہ یہ قریب ترین وسیلہ کامیابی ہے۔ غنیمت ہے کہ بعض ارباب غیرت کا ایک گروہ اس کی طرف ملتفت نظر آتا ہے۔

ہمیں اہل حق اور باحیث مسلمان بادشاہوں اور عالموں سے توقع ہے کہ وہ اس گروہ کی تائید کریں گے۔ اور اُن کے افتراق و اختلاف کو دور کرنے والی اور اُن کی جماعتوں میں مرکزیت پیدا کرنے والی صورت بہم پہنچانے سے دریغ نہ کریں گے۔ تجربات اُنہیں کافی سے زیادہ سمجھا چکے ہیں۔ اب اس کا وقت ہے کہ وہ دور والوں کے پاس اپنے داعی بھیجیں۔ قریب والوں سے مصافحہ کریں۔ ایک دوسرے کے اُن حالات سے واقف ہوں جن سے اُن کے دین و ملت کا فائدہ متعلق ہو یا کسی خطر و ضرر کا اندیشہ ہو۔ یقیناً وہ اس قابلِ عزت طریقہ پر عمل کر کے اپنا فرض ادا کریں گے اور دینی و دنیاوی سعادت کی طلب میں کامیاب ہوں گے۔ اُمیدیں ہمارے سامنے ہیں۔ اور خدا ہی کی طرف ہماری بازگشت ہے۔

چوتھا مقالہ

وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَعَشَلُوا وَإِنْ تَدْرِكُكُمْ

اور تم اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں لڑو نہیں ورنہ تم کم ہمت

ہو جاؤ گے اور تمہاری ہمت جاتی رہے گی،

اسلام کی حکومت مغربِ اقصیٰ کے مرکز سے تو نکلان حد و چین تک وسیع

ہو گئی تھی جس کے درمیان شمال کی طرف قازان اور سراندرپ کے مابین

خط استوا کے نیچے بے شمار مسلسل و متصل شہر تھے۔ جن میں مسلمانوں

کی سکونت تھی اور انھیں ناقابلِ تسخیر غلبہ حاصل تھا۔ بڑے بڑے بادشا

مسلمان بادشاہ کا لوہا ملتے تھے۔ مسلمانوں نے اپنی شان و شوکت سے

کرہ ارض کو ہلا ڈالا تھا۔ اُن کی فوجیں کبھی شکست نہ کھاتی تھیں۔ اُن

کے جھنڈے کبھی سرنگوں نہ ہوتے تھے۔ نہ اُن کی بات کا الٹ کر

جواب دیا جاتا تھا۔ اُن کے قلعے نہایت مستحکم اور قابلِ دید ہوتے تھے

اُن کی چراگاہیں اور سبزہ زار باغ وغیرہ ہموار و وسیع میدانوں میں

نہایت سرسبز و شاداب اور طرح طرح کے نباتات اور اشجار سے مالا مال

نظر آتے تھے جنھیں مسلمانوں کی کاریگری نے عجیب و غریب رنگ

دے رکھے تھے اُن کے شہر آباد و مردم خیز تھے۔ اور اُن کی تعمیر ایسی

مضبوط اور قواعدِ مدنیت کے مطابق ہوئی تھی کہ دُنیا کے بڑے سے بڑے شہروں کے باشندوں کی صناعی پر فخر کرتے تھے۔ ان اسلامی شہروں کو ان عالی مرتبہ اشخاص کی بدولت افتخار و امتیاز حاصل تھا۔ جو فضیلت و علمیت کے آفتاب و بدرِ کامل اور ہدایت و ادب کے درخشاں ستارے تھے۔ مشرق میں اُن کے حکما میں ابن سینا فارابی اور رازی مرجعِ علوم بنے ہوئے تھے۔ اور مغرب میں ابن ماجہ ابن رشد اور ابن طفیل یا اُن کے ماثل اصحاب کے تفلسف و تفقہ کا ڈھکا بچ رہا تھا۔ درمیان میں جو شہر تھے اُن میں قدم قدم پر حکمت طب ہیئت ہندسہ اور تمام علوم عقلیہ کے متبحر فاضل موجود تھے۔ علم و فضل کی یہ افراطِ علومِ شرعیہ کے علاوہ تھی۔ ورنہ علومِ شرعیہ تو اُس زمانہ کے تمام طبقات میں عام تھے۔

ادھر اُن کے عباسی خلیفہ نے ایک حکم دیا اُدھر تکفورِ چین (دفعفورِ چین) نے سہرِ اطاعت خم کیا یہی حال یورپ کے بڑے بڑے بادشاہوں کا تھا۔ کہ ایسے مواقع پر اُن کے بند بند لرز اُٹھتے تھے اُن کے نامور بادشاہوں میں قرونِ متوسطہ میں محمود غزنوی ملک شاہ سلجوقی صلاح الدین ایوبی یا مشرق میں تیمور گورکان مغرب میں سلطان محمد فاتح سلطان سلیم اور سلطان سلیمان عثمانی جیسے باجبروت بادشاہ ہو گزرے ہیں۔ جو اگرچہ مرچکے ہیں لیکن ابھی زمانہ اُن کو بھولا نہیں نہ اُن کے آثارِ نحو ہوئے۔

مسلمانوں کے بیڑے اتنے زبردست تھے کہ بحرِ امیض و اُدھر اور بحرِ ہند میں کسی کا بیڑا ان کا حریف و ہمسرہ نہ تھا۔ تھوڑے ہی دن

پہلے تک ان سمندروں میں اسلامی بیڑے کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ ان کے حلیف جہاں ان کی سطوت و دبدبہ کے آگے سر جھکاتے تھے وہیں ان کے فضل و کمال کے بھی مداح و معترف تھے۔

آج بھی مسلمان اپنے آبا و اجداد سے ورثہ میں پائے ہوئے ملکوں میں بھرے پڑے ہیں۔ ان کی تعداد دوسو ملین سے کم نہیں ہے۔ ہر ملک میں ان کے افراد ان دینی عقاید کے لحاظ سے جو ان کی گتھی میں پڑے ہوئے ہیں موت کی طرف قدم بڑھانے میں اپنے ہمسایوں سے زیادہ تیز اور زیادہ بہادر ہیں۔ اسی لیے وہ تمام انسانوں سے زیادہ زندگی اور اُس کی باطل زیب و زینت کو حقیر سمجھتے ہیں۔ اور سب سے کم اس کی پروا کرتے ہیں۔

قرآن کریم کی حکم آیات ان پر اس شان سے نازل ہوئیں کہ انھوں نے عقاید کو دلائل کے ساتھ اختیار کرنے کا مطالبہ کیا اور شکوک و ادھام سے بہرے ہوئے۔ عقیدوں کی برائی کی فضایل اور اخلاق اور معقول صفات کی طرف بلایا۔ ان کے خیالات و افکار میں حق کے جراثیم و دلیعت کیے۔ ان کے نفوس میں فضیلت کے بیج بوئے۔ اس لیے اُصول دین کے لحاظ سے ان کی عقلیں سب سے زیادہ روشن ان کے ذہن سب سے زیادہ بیدار اور کمالاتِ انسانی کے حصول میں نہایت قوی الاستعداد ہیں۔ استقامتِ اخلاق میں بھی ان کا رتبہ برتر ہے۔

چونکہ اپنے آپ کو ایک مخصوص شرف سے مشرف پاتے ہیں اور اس وعدہ کا احساس رکھتے ہیں جو قرآن کریم جیسی سچی کتاب نے

تمام عالم کے مقابلہ میں اُن کے اظہارِ شان کی نسبت کیا ہو خواہ بطل پرستوں کو ناگوار کیوں نہ ہو اس لیے وہ بجز اپنے کسی غیر کا تسلط نہیں مانتے۔ اور اُن میں سے ایک کے خیال میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ اپنے سوا کسی اور صاحبِ سطوت کی اطاعت گوارا کرے خواہ وہ صاحبِ سطوت کتنا ہی زبردست کیوں نہ ہو۔

چونکہ اُن کی اخوت عقاید کے رشتوں سے جکڑی ہوئی ہو اس لیے اُن میں کا ہر ایک یہ گمان رکھتا ہو کہ ابنائے قوم میں سے کسی جماعت کا اجنبیوں کے زیرِ اثر عاجز و محکوم ہونا خود اُن کے عجز و محکومیت کے مرادف ہو۔

یہ وہ احساس ہو جس کا شعور وجدانی طور پر ہوتا ہو۔ پھر چونکہ اُن کے نفوس میں اُن کے دین کی تعلیم کے معلومات جڑ پکڑے ہوئے ہیں اور وہ اپنے عفوانِ اقبال کے دور میں اُن کا بہت بڑا حصہ حاصل کر چکے ہیں۔ اس لیے وہ اپنے آپ کو علم و فضل میں بھی اور لوگوں سے اولیٰ و اعلیٰ خیال کرتے ہیں۔

مگر ان سب باتوں کے باوجود اب وہ اپنی رفتار میں سست پڑ گئے ہیں۔ بلکہ علموں اور صنعتوں میں دوسروں سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ حالانکہ پہلے ہی دنیا بھر کے اُستاد تھے۔ اُن کے مالک کی وسعت میں کمی اور اُن کے شیرازہ میں اتری پیدا ہونے لگی ہو۔ حالانکہ اُن کا مذہب اُن کو حکم دیتا ہو کہ وہ اپنے مخالف کا غلبہ قبول نہ کریں جو استبداد اور خودداری کے ساتھ اُن پر حکومت کرنا ہو۔ بلاشبہ اُن کے دین و استقلال کو نظر لگ گئی ہو اور اب اُن صفات میں

کی آ رہی ہے۔

کیا وہ اللہ کے وعدہ کو بھول گئے ہیں کہ اگر نیک اور صالح رہے تو زمین کے وارث ہوں گے۔ کیا انھوں نے اللہ کی اس ذمہ داری کو کہ وہ تمام شانوں پر انھیں کی شان کو نمایاں کرے گا فراموش کر دیا ہے۔ کیا وہ اس بات کو بھلا بیٹھے ہیں کہ اللہ نے اُن کی عظمت بڑھانے کے لیے اُن سے اُن کی جان و مال کو خرید لیا ہے۔ اور جنت اُن کے لیے مخصوص کر دی ہے۔

ترقی، علوم میں کوتاہی اور قوت میں ضعف پیدا ہونے کے متعدد اسباب ہیں۔ جن میں سب سے بڑا سبب طالبانِ حکومت کا اختلاف ہے گو مسلمانوں میں جنسیت صرف مذہب میں ہے تاہم باہمی اختلافات نے ایک ایک قبیلہ میں کئی کئی سردار اور ایک قوم میں کئی بادشاہ پیدا کر دیے۔ جن کی اغراض و غایات ایک دوسرے کے بالکل خلاف ہیں۔ ان سرداروں اور بادشاہوں نے عوام کے خیالات کو اپنے اپنے حریفوں اور دشمنوں کے مقابل مظاہرات پر مبذول کر دیا۔ اور جذباتِ عالیہ کو غلبہ اور تفوق کے وسائل بہم پہنچانے میں استعمال کیا تاکہ ایک فریق دوسرے فریق کو دبا سکے۔

ان مقابلوں نے جن سے ایک کا دوسرے پر غلبہ حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے اور جو نزاعوں سے زیادہ مشابہ ہیں اُن کے حاصل کردہ علوم و صنائع کو بھلا دیا اور جو انھوں نے نہ سیکھا تھا اس کی تحصیل میں قصور و کوتاہی پیدا کر دی۔ یہ امور اُن کی ترقی میں حائل ہو گئے اور اُن سے فقر و فاقہ اور افلاس و احتیاج جیسے نتائج برآمد ہوئے ساتھ ہی قوت

میں ضعف اور نظم و انتظام میں خلل پیدا ہو گیا۔ امرا کے ان باہمی تنازعات نے عام مسلمانوں پر اختلاف و تفریق کا وبال نازل کر دیا جس کی وجہ سے وہ نہ صرف اپنے آپ سے بلکہ اجنبی مداخلت سے بھی غافل ہو گئے۔ یہ ہر امرائے مسلمین کی تباہ حالت۔ اس حالت میں بمقابلہ سابق کتنا نمایاں نقصان رونما ہو پہلے وہ بڑے بڑے معرکوں اور جنگ کے میدانوں میں مقرر تھے۔ ان کے سوا کوئی قوم ان کا مقابلہ نہ کرتی تھی مگر اب مرور زمانہ سے امرا کے نفوس میں فساد پیدا ہو چکا ہے۔ طبائع میں حرص اور طمع باطل گھر کر چکی ہے۔ حرص و ہوا کے ساتھ وہ بھی بدل چکے ہیں۔ لایعنی تعریف عظمت کے حصول اور دوسروں کے لیے بہترین مثال بننے کا شوق ان کے دلوں سے نکل چکا ہے۔ اب وہ امارت کے القاب اور سلطنت کے ناموں پر قانع ہیں یا اسی قبیل کے خطابات پر راضی ہیں جن سے نام نہاد عزت و تمول کا اظہار ہوتا ہے۔ اس ادنیٰ مقصد کے حصول کے لیے وہ ایسی اجنبیوں کی عادتوں کو اختیار کئے ہوئے ہیں جو قومیت اور مذہب میں ان کے خلاف ہیں۔ اپنے ہی ابنائے ملت پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے ان اغیار سے مدد کی بھیک مانگتے ہیں اور اُس میں ذرا نہیں شرماتے حالانکہ یہ عارضی عزت و تفوق نہایت سریع الزوال نعمت ہے :

❖ ❖ ❖

❖ ❖

۵

نسب و وطنیت کے متعلق ایک جداگانہ بیان

حسب ذیل خلاصہ ایک کتاب کے مسودہ سے حاصل کیا گیا ہے جو سید عبد الجبار شاہ صاحب سابق والی ریاست صوات مرتب کر رہے ہیں۔ صاحب موصوف سے سید جمال الدین افغانی کی وطنیت اور خاندانی حالات کے متعلق کئی بار جو گفتگو ہوئی اُس کا ماحصل یہ سطور ہیں۔

میں نے ان اوراق کو بطور ضمیمہ شایع کرنا اس لیے ضروری سمجھا کہ اس سرگزشت کے بعض ایسے پہلو بھی جو میری تحقیقات کے دائرے میں شامل نہیں ہیں، واضح ہو جائیں۔

میں موصوف کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے میری اس جدوجہد میں گہری دلچسپی کا اظہار فرمایا۔

.....

دادی کٹر کے خاندان سادات کا حال جس کے مورث اعلیٰ سید علی ترمذی ہیں، سید عبد الجبار شاہ صاحب نے اپنے مسودہ میں اس طرح بیان کیا ہے:

”قطب الاقطاب حضرت سید علی ترمذی قدس سرہ غوث بنویر بن امیر نظر بہادر سید قمر علی مرزا بن سید احمد نور۔ بن سید یوسف نور“

بن سید محمد نور بخش ترمذی بن سید احمد بیغم بن سید احمد بدایق بن سید احمد مشتاق - بن سید شاہ ابوتراب - بن سید حامد بن سید محمود - بن سید اسحاق - بن سید عثمان - بن سید جعفر - بن سید عمر - بن سید محمد - بن سید حسام الدین - بن سید شاہ ناصر خسرو - بن سید جلال گنج العلم بخاری قدس سرہ العزیز بن ابو الموید - حضرت امیر علی جن کانسب پانچویں پشت میں حضرت علی نقی امام اہم ائمہ اہل بیت سے ملتا ہے جو فرزند تھے حضرت امام محمد تقی کے اور وہ فرزند حضرت امام علی رضا کے تھے اور وہ حضرت امام موسیٰ کاظم کے فرزند تھے اور وہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے فرزند تھے اور وہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے فرزند تھے اور وہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے فرزند تھے اور وہ حضرت امام ابو عبد اللہ الحسین شہید دشت کربلا علیہ السلام کے فرزند تھے اور آپ حضرت امیر المومنین اسد اللہ الغالب علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ اور حضرت سیدۃ النساء فاطمۃ الزہری بنت محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے فرزند تھے رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین -

حضرت سید علی ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کا خود فرمودہ بیان آپ کے مادون اخوند درویشہ علیہ الرحمۃ نے اس طور سے لکھا ہے کہ آپ اصلاً ترمذی ہیں اور وطناً قندز کے باشندے اور خواہر زادگان سلطان ظہیر الدین میں سے ہیں - فرمایا کرتے تھے کہ ”اُن کے والد بزرگوار مرزا سید قمر علی بہ سبب لبت نسب داری ہمراہ سلاطین دنیوی منصب اختیار کر چکے تھے - لیکن جد بزرگوار

امام المسلمین سید الدین والدین سید احمد بن سید یوسف اپنے آباؤ اجداد کے طریقہ مرضیہ پر نسباً اور سجادہٴ سلسلہ کبریہ پر اذناً مستقیم رہ کر دنیوی امور سے بے تعلق رہے۔ والد کو شہنشاہ کی طرف سے لقب امیر نظر بہادر کا ملا ہوا تھا۔ اور آباؤ اجداد کے طریق زہد و ریاضت کو ترک کیے ہوئے تھے۔ اس لیے جد بزرگوار کی نظر انتخاب اُس وراثتِ آباہی کی سپردگی کی نسبت اپنی تمام اولاد میں سے بچپن سے حضرت ترمذی پر مبذول رہتی تھی۔

ان روایات اور اسناد کے بموجب جو زیرِ نظر مسودہ میں پیش کی گئی ہیں حضرت سید علی ترمذی سے سید جمال الدین افغانی تک سلسلہٴ نسب اس طرح قائم ہوتا ہے:-

سید علی ترمذی
 سید مصطفیٰ
 سید عبد الوہاب
 سید جمال الدین عرف سید جمال
 سید ظہیر الدین
 سید زین العابدین
 سید رضی الدین
 سید اعلیٰ
 سید صفدر
 سید جمال الدین افغانی

اس طرح شیخ کے نسب نامہ کی ساتویں پشت میں سید جمال الدین کا

نام آتا ہے جو وادی کنڑ میں آباد ہوئے اور جن کے خاندان سادات کا مرتبہ اتنا بلند تھا کہ بقول عبد الجبار شاہ صاحب سلاطین کابل اپنی لڑکیوں کا اُس خاندان سے رشتہ کرنا اپنے لیے باعثِ شرف و افتخار سمجھا کرتے تھے۔ چنانچہ اُس زمانہ میں جس کی کوئی مستند اور مفصل تاریخ میسر نہیں آتی، کہا جاتا ہے کہ حدودِ حیراں سے لے کر ضلع ننگر ہار تک کنڑ پر خاندانِ سادات کی خود مختارانہ حکومت قائم تھی اور اُس خاندان کے اِس دور میں بڑے بڑے علما فضلا گزرنے ہیں جن میں سے سید جمال الدین شیخ الاسلام کا نام آج تک مشہور ہے۔ امیر حبیب اللہ خاں کے زمانہ میں اِس خاندان میں شاہی خاندان کی لڑکیاں بیاہی جاتی رہی ہیں۔ چنانچہ شیخ پادشاہ میر صاحب جان سے جو اخوند صاحب ہڑہ کے جانشین بھی تھے، امیر حبیب اللہ خاں نے اپنی دو لڑکیوں کی شادی کی تھی۔

اِس خاندان کے موجودہ حالات بیان کرتے ہوئے فضل مؤلف نے اپنے مسودہ میں بعض دلچپ تفصیلات بیان کی ہیں مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ :-

”سید جمال الدین افغانی، کانسبی معاملہ اس قدر روشن اور واضح ہے کہ اُس کا چھپانا یا اُس کے متعلق کسی مغالطہ میں پڑنا ناممکن ہے۔ ابھی اسی زمانہ کا واقعہ ہے جب کہ اُن کی وفات پر صرف ۴۴ سال گزرے ہیں کہ اُن کا عظیم المرتبت خاندان اب بھی وادی کنڑ میں اور بونیر دھوات میں ہزار ہا نفوس پر مشتمل موجود ہے جو سلاطین کابل کے تعلقداران اور شریک رشتہ مانند سید محمود شاہ پاشا اور

میر صاحب جان شیخ پاشا کے ہوتے ہیں۔ وادی کنٹر میں سادات کی آبادی دو جگہ ہے۔ ایک گاؤں سادات کا موضع پشت ہے جو سید مصطفیٰ بن سید علی ترندی کا گاؤں ہے جس کے متصل دوسرا محلہ سادات کا سید آباد نام اب بھی موجود ہے جس کو ایران کا سید آباد بنالیا گیا ہے۔ دوسرا مستقر سادات کا کنٹر کے جنوب مغرب میں اسلام پور نام ہے۔ جس میں میر صاحب جان شیخ پاشا کے خاندان کی شاخ مقیم ہے پشت والا خاندان فرمانروائے ملک تھا اور افغانستان کا لشکر ان کا ماتحت تھا۔ امرائے کابل کے زیر حکومت یہ لوگ پورے محکوم نہ تھے بلکہ درجہ سادات کا رنگ تھا جب ہی تو سید محمود پاشاہ کے ساتھ امیر دوست محمد خاں نے رشتہ دے کر وحدت پیدا کی تھی۔ سید محمود پاشا کا ویران شدہ قلعہ اب بھی پشت میں موجود ہے جو ویران پڑا ہے جس کو اُس ملک کے لوگ عقل تمام قلعہ کہتے ہیں۔ اور اسی پشت کے مرکز کے ایک محلہ کا نام سید آباد ہے جس میں سید افغانی کی ولادت ہوئی مگر ان کے والد کو مانند سید محمود شاہ پاشا کے امرائے کابل کنٹر سے جلا وطن کر کے کابل لے گئے۔

وطنیت اور نسب کی اس بحث میں فاضل مؤلف نے ایک دلچسپ دلیل یہ بھی پیش کی ہے کہ :-

”اسی شجرہ میں سید علی ترندی سے اوپر ان کے اجداد کی اٹھارہویں پشت میں ایسا ہی عظیم الشان شخصیت کا مالک سید جلال گنج العلم بخاری بن ابوالموئذ امیر علی پایا جاتا ہے جس کی ابویت پر حضرت سید علی ترندی کو ایسا ہی فخر و افتخار تھا جیسا کہ سید علی ترندی کی اولاد کو سید علی پر

فخر ہے۔ وہ اپنے عہد کا عظیم الشان انسان گزرا ہے جس کا ذکر بے شمار کتبِ تصوف و تذکراتِ مشائخِ کبار میں ہے۔ بلکہ تاریخِ فرشتہ میں بھی سید جلال الدین بخاری کا ذکر نہایت مفصل ہے اور سلسلہ میں اُن کے موجود ہونے کا ذکر ہے۔ اس سید جلال الدین گنجِ العلم کی مملکت افغانستان میں دس بارہ مقامات پر نشست گاہیں موجود ہیں جہاں ہر جگہ قبر بنی ہوئی ہے اور ہر جگہ یہ دعویٰ موجود ہے کہ یہاں وہ مدفون ہیں مگر درہل وہ نشست گاہیں ہیں۔ زمانہ آپ کا سنہ ۷۰۰ کا تھا۔ آپ کی والدہ سلطان محمود خدا بندہ شاہ بخارا کی ہمشیرہ تھی۔ پھر آپ کے ماموں نے اپنی بیٹی بھی آپ سے بیاہ دی جس سے آپ کے دو فرزند توران میں رہ گئے۔ آپ پھر افغانستان و ہندوستان و کشمیر وغیرہ ممالک میں چلے آئے۔ اُن دونوں فرزندوں کی اولاد میں سے سید محمد نور بخش ترمذی جدِ سید علی ترمذی ترمذی میں تھے۔ الغرض بوجہ بعدِ مملکت دُور کے لوگ اس سلسلہ سے تو بے خبر ہیں مگر افغانستان میں کُل اہلِ علم اس حقیقت سے آگاہ ہیں۔ ایسا ہی مغالطہ مفتی محمد عبدہ کو ترمذی کے نام سے لگا ہے کہ وہ صاحبِ مصتف جامع ترمذی ہے۔ اس بارہ میں نہ تو سید افغانی کی طرف ایسی فاش بے علمی منسوب کی جاسکتی ہے اور نہ ہی مفتی عبدہ کی طرف کہ وہ علمِ حدیث کے اُن اعظمِ مصنفین کے نام اور نسب حسب سے بے خبر تھے یا اُن کو معلوم نہ تھا کہ مصتف جامع ترمذی جس کا نام محمد بن عیسیٰ اور جس کو ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ بن موسیٰ حافظ لکھا ہوا ہے، ان سید علی ترمذی سے جدا ہیں...

معلوم ہوتا ہے کہ بے خبری میں کسی نے مرزا لطف اللہ کی مانند یہ غلطی بھی کر دی ہے۔ میں نے ایک جید عالم سے سنا ہے کہ یہ غلطی جرجی زیدان ایک مسیحی عالم سے ہوئی ہے اور قرین قیاس ہے کہ ایسا ہی ہوا ہو کیونکہ کوئی مسلمان عالم تو ایسی غلطی ایک درسی کتاب کے مصنف کے متعلق نہیں کر سکتا۔ ثابت یہ ہوتا ہے کہ لطف اللہ سات پشت سادات کنٹر کی صحیح شمار کر کے جو سالہ ہجری تک ہے پھر سید علی ترمذی کی روایت سے کو د کر ایک دم ستمہ ہجری میں سید جلال گنج العلم تک جا پہنچتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سید افغانی کا ساتواں جد سید اہیل الدین سید جمال الدین اول کا بیٹا تھا جو سید عبد الوہاب بن سید مصطفیٰ بن سید علی ترمذی کا فرزند تھا۔

مرزا لطف اللہ نے مقالاتِ جمالی میں مذکورہ غلطیوں سے بڑھ کر ایک غلطی کا ارتکاب کیا ہے کہ سید کے خط کا عکس ایک جگہ دیا ہے جس کی طرزِ تحریر کابلی طرزِ تحریر ہے مگر ایک عربی شعر لکھ کر دستخط کے علاوہ لکھا ہے کہ یہ شعر خود سید کا تصنیف کردہ ہے حالانکہ وہ ایک تاریخی شعر نذیر بن معاویہ - قاتل اہل بیت کا ہے۔

اس کے بعد موصوف نے اپنے بیان میں بعض دوسرے مکانات کو بھی مسترد نہیں کیا ہے بلکہ اس امکان کو تسلیم کرتے ہوئے کہ "شیخ کے والدین نے کنٹر سے جلا وطنی کے بعد اسد آباد جا کر سکونت اختیار کر لی ہوگی"۔ اس امر پر اصرار کیا ہے کہ "سید صفدر کا اپنے خاندان سادات کنٹر سے تعلق منقطع نہیں ہوا تھا اور سلاطین افغانستان بھی اُن کو اکابر سادات کنٹر میں سے ہی یقیناً جانتے پہچانتے

ہیں۔ ممکن ہو کہ سید کی ولادت ایران میں ہوئی ہو اور بعدِ بلوغ وہ اپنے ملک میں آگئے ہوں.....“

محترم مؤلف نے اپنے مسودہ میں سید علی ترندی کے خاندانی حالات کے سلسلے میں اُن تعلقات کا بھی ذکر کیا ہے جو اس خاندان کے زمانہ قدیم میں افغانستان اور ہندوستان سے قائم تھے چنانچہ وہ لکھتے ہیں :-

”جدِ بزرگوار حضرت سید علی ترندی نے میدانِ پانی پت میں شہنشاہِ بابر کی سلطانِ ابراہیم لودی پر فتحیابی کے بعد اُن ہی دنوں میں ترک تعلقات دنیوی کر کے طلبِ راہِ مولیٰ میں مجاہدات اختیار کیے۔ مذکورہ واقعہ فتحِ ہند ماہ اپریل ۱۵۱۹ء مطابق ۱۲۳۹ھ ہجری میں ہوا تھا۔ اس حساب سے آپ کی ولادت تخمیناً ۱۵۱۹ء مطابق ۱۲۳۹ھ کے درمیان یعنی ہر دو صدیوں کے ابتدائی دو چار سالوں میں ہوئی ہوگی۔ آپ کا مولد شہر قندز ملک ترکستان و بدخشاں تھا اور ۱۵۹۲ء میں آپ نے وفات پائی۔ اس حساب سے حضرت کی عمر کل دسویں صدی ہجری اور سوطویں صدی عیسوی پر عادی تھی۔ اور ایک صدی سے آٹھ نو سال ہی کم تھی۔ اس طرح ابتدائے حالات کی جن تاریخوں سے ہوئی وہ بھی معلوم ہیں اور قریب ایام کی تاریخیں خود بوجہ قریب زمانہ معلوم ہیں۔“

اس مسودہ میں سید علی ترندی کے بعد اُن کے جانشینوں کے حالات بھی مثل سید مصطفیٰ و دیگر اکابر کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ اور شجرہ نسب کو قدم بقدم سید جمال الدین افغانی تک پہنچا دیا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ میرے مسودہ کی طباعت شروع ہو چکی ہے

اس لیے میں سید عبد الجبار شاہ صاحب کے بیان کے ہر پہلو پر بحث نہیں کر سکتا تاہم یہ میں نے ضروری سمجھا کہ اس بیان کے بعض اجزا کو ان اوراق کے ساتھ منسلک کر دوں۔ ممکن ہو کہ میرے بعد مجھ سے زیادہ وسیع النظر ارباب ذوق اس بیان کے مختلف گوشوں میں مزید تحقیق و جستجو کے راستے پیدا کر سکیں۔

✽ ✽ ✽

✽ ✽

✽

کتاب

رجن سے ترتیب کتاب کے دوران میں مدد ملی گئی

عربی، فارسی و اردو

علم اور اسلام - طبع معارف پریس - انٹرم گڈ ۱۹۳۹ء

الذکر - طبع مصر

آثار جمال الدین افغانی - ۱۹۱۰ء

المآثر والآثار

دائرة المعارف - ۱۸۸۵ء

شہر مشاہیر الشرق

تمتہ البیان فی تاریخ افغان - طبع مصر - ۱۹۱۰ء

مضامین عروۃ الوثقی - طبع مصر - ۱۹۱۰ء

تاریخ دینی حیات خان افغان

جمال الدین افغانی

تاریخ سلطان محمد خاں بارکزئی افغانی

حاضر العالم الاسلامی

تاریخ الاستاذ الامام (مفتی عبیدہ)

البیان (قاہرہ)

احمد میان اختر (قاضی)

ادیب سختی -

اصمعی

اعتماد السلطنۃ

بطروس البستانی

جرجی زیدان

جمال الدین افغانی

حسین محی الدین الجبال

حیات خاں

سعید پاداش

سلطان محمد خان

شکیب ارسلان

رشید رضا (علامہ)

عبدالرحمن قروقی

علی فکری	سُبل النجاح - جلد ۲
فرید دجیدی	دائرة المعارف - طبع مصر - جلد ۳
لطف الله	شرح حال و آثار سید جمال الدین - طبع برلن ۱۳۱۵ھ
محمد عبده مفتی	دیباچه - رد علی الدہرین
محمد علی توفیق بک	رسمدار (استانبول)
محمد محلاتی	مغفنا رخوش یار قلی - طبع مطبع علویہ نجف ۱۳۱۴ھ
مصطفیٰ عبدالرزاق	دیباچه مضامین عرودة الوثقی - طبع مصر - ۱۳۱۶ھ
ناظم الاسلام کرمانی	تایخ بیداری ایران - جلد اول
	تمت البیان - از صاحب جریة العلم - مصر - ۱۳۱۵ھ
	سوانح جمال الدین (برلن)
	بیوک ادم لر - از جمعیتہ علمی توڑک - طبع استانبول
	خزانة الایام (امریکہ)

❖ ❖ ❖

❖ ❖

❖

جراید و رسائل

عربی، فارسی، آذربائی

اگست ۱۸۸۴ء
شماره ۳۶۶، امور و ۲۴ محل ۱۳۱۲ھ
۲۹ فروری ۱۸۸۳ء
۲۵ دسمبر ۱۹۲۳ء جلد ۳

۱۸۸۴ء
۸ اکتوبر ۱۹۲۳ء
اکتوبر و نومبر ۱۹۲۳ء
شماره ۱۰-۲-۳-جلد ۳-شماره ۸ جلد ۶

۱۸۸۴ء
۶ جولائی ۱۸۹۱ء

اخبار - م - لاہور
الہرام - مصر
ابوظہارہ - پیرس
المقطف - قاہرہ
الہلال - - مصر
اودھ اخبار - بکشتو
ایران شہر - برلن
آئینہ - کلکتہ
ترک یوردی قسطنطنیہ
جہان اسلام - قسطنطنیہ
نیل المتین - کلکتہ
دار السلطنت - کلکتہ
سراج الاخبار - کابل
صویر اسرافیل - طهران

عُرُوة الوثقى - پیرس

کابل - (مجله) کابل

کاده - برلن

مشیر قصیر - لکهنؤ

مصر - اسکندریه

مصور دجریده، استنبول

معارف - اعظم گڑھ

معلم - حیدر آباد دکن

معلم رفیق - حیدر آباد دکن

ملت - قسطنطنیہ

وطن - قسطنطنیہ

، رجولائی ۱۹۳۱ء

۱۱ جنوری ۱۹۲۱ء و ستمبر ۱۹۲۱ء

۱۸۸۴ء

۵ جمادی الاول ۱۲۹۶ھ ہجری

۱۹۲۶ء

مئی ۱۹۲۲ء

۱۹۲۶ء

۳۱ اگست ۱۹۲۲ء -

✽ ✽ ✽

✽ ✽

✽

اشاریہ

۱

- ابراہیم - ۴۹ - ۱۹۱ - ۲۰۲ - ۲۰۳
 ابراہیم - مولوی - ۱۲۲
 ابراہیم الاغانی - شیخ - ۸۵ - ۹۲
 ابراہیم پاشا - ۲۶۸
 ابراہیم جودت - ۲۰۳
 ابراہیم علاء الدین بک - ۱۸
 ابوالحسن مرزا - شیخ الرئيس - ۲۷۸
 ابوالقاسم - حاجی - ملا - ۲۵۵
 ابوتراب - ۳ - ۱۱ - ۱۲
 ابوتراب خان - ناظم الدولہ - ۲۸۵
 ابوالقاسم - شیخ - ۲۵۸ - ۲۵۹
 ابوسعید العزنی - ۲۹۲ - ۳۰۴
 ابو الہدیٰ - ۲۶۲ - ۲۸۵ - ۲۸۶ - ۲۸۷ - ۲۸۸
 ایلارڈ - ۱۶۳
 اتاترک - ر -

اٹلسی - ۱۸۶

اجل الدین - محمد الحینی - ۲

اجل خاں - حکیم - سیح الملک - ت - ۸

احسان بے - ۱۰۶

احمد بے عقایف - ل -

احمد - شیخ - رومی کرمانی - ۲۶۵ - ۲۶۸ - ۳۶۳

احمد پاشا - سید - ۱۰۶ - ۲۶۰

احمد پاشا - ط

احمد خاں - سلطان - ۳۴۱

احمد الشریف - ۳۳۹

ازربایجان - ۲۴۹ - ۲۵۱

ارباب - آقامرزا - ۲۶۵

ارسطو - ۳۰۵

ارفع الدولہ - ۲۲۶

آزاد - مولانا ابوالکلام - ت

ازہر - ۱۴ - ۵۹ - ۸۲ - ۸۴ - ۸۵ - ۸۶ - ۱۱۲ - ۱۸۲ - ۲۱۴ - ۳۳۸ - ۳۴۰

اسٹنڈرڈ - ن - ۳۰۸

استنبول - اسلامبول - ۶۰ - ۶۲ - ۱۳۳ - ۲۳۶ - ۲۶۹ - ۲۸۹

استحق - ادیب - ۸۵ - ۱۰۵ - ۳۴۳

اسد آباد - ۲ - ۳ - ۴ - ۶ - ۳۲ - ۳۳

اسد اللہ - سید - خرقانی - ۳

اسد فواد بے - ش -

اسکندریہ - ۹۲ - ۱۵۱ - ۱۵۲ - ۱۸۳

اسلم - محمد - ۴۶

اسمعیل - شہید - ۳۳۷

اسمعیل - حدیو - ۶۴ - ۷۸ - ۷۹ - ۹۴ - ۱۰۲ - ۱۱۲ - ۱۱۳ - ۱۸۲ - ۲۳۱ - ۳۴۹

اسود - بحر - ۲۶۹

اصفہان - ۲۱۸ - ۲۲۱

اعتماد السلطنہ - محمد حسن خاں - ۲۱۸ - ۲۲۳ - ۲۲۷ - ۲۵۰ - ۲۶۵ - ۳۶۲

اعرابی پاشا - ۱۱۵ - ۱۱۶ - ۱۱۹ - ۱۲۸ - ۱۴۸ - ۱۴۹ - ۱۵۰ - ۱۵۱ - ۱۵۲ - ۱۵۳ - ۱۸۲

۱۸۳ - ۱۹۰ - ۱۹۸ - ۱۹۹ - ۲۲۱ - ۳۲۴ - ۳۳۳ - ۳۴۹ - ۳۵۳ -

اعظم خاں - امیر - ۷ - ۱۳ - ۳۰ - ۴۶ - ۴۷ - ۴۸ - ۴۹ - ۵۰ - ۵۱ - ۵۲ - ۵۳ - ۵۸ - ۱۵۴

اعظمی - غلام جیلانی - ۹ - ۱۰ - ۳۴ - ۲۶۶ -

اغناطیف - ۳۰ - ۵ -

آقا حسن - حاجی - ۲۵۶ -

آقا حسین دانش - ۳۰۷ - ۳۱۳ -

آقا خان - مرزا - کرماتی - ۲۵۸ - ۲۶۵ - ۲۷۸ - ۳۰۵ - ۳۶۳ -

افضل خاں - ابر - ۴۷ - ۴۸ - ۴۹ -

افضل الملک رومی - ۲۷۸ -

افغانستان - ۱ - ۴ - ۶ - ۷ - ۸ - ۱۳ - ۱۴ - ۱۸ - ۲۷ - ۲۸ - ۲۹ - ۳۰ - ۳۳ - ۳۸ - ۴۳ -

۴۴ - ۴۵ - ۴۶ - ۵۰ - ۵۱ - ۵۲ - ۱۰۱ - ۱۵۴ - ۶۳ - ۱۹۰ - ۱۹۱ - ۱۹۲ - ۱۹۴ - ۱۹۷ - ۱۹۸ -

۱۹۹ - ۲۰۵ - ۲۰۶ - ۲۰۷ - ۲۰۸ - ۲۰۹ - ۲۱۶ - ۲۲۴ -

افلاطون - ۳۰۵

اکبر خاں - محمد - ۲۹ -

البانیا - ۲۴۰

البرنس - ۱۶۳ -

البحر اتر - ۲۴۰ - ۲۴۹ -

البحیریا - ۲۶ - ۳۳۴ -

الکونین - ۱۶۳

امریکہ - ۱۵۳ - ۱۵۴

امین - محمد - ۴۶ - ۴۸ -

امین الدولہ - ۲۶۵

امین السلطنت - ۲۲۹ - ۲۳۰ - ۲۳۳ - ۲۳۴ - ۲۴۰ - ۲۴۳ - ۲۴۸ - ۳۳۲ -

امین الغرب - محمد حسین خاں - ۲۱۹ - ۲۲۳ - ۲۲۴ - ۲۳۰ - ۲۶۵ -

اناطولیہ - ۲۴۴ -

اندلس - ۱۶۴ -

انزلی - ۲۴۹ -

انصاری - ڈاکٹر مختار احمد - ت -

انگلستان - ۲۹ - ۱۵۱ - ۱۸۳ - ۱۹۰ - ۱۹۱ - ۱۹۲ - ۱۹۶ - ۱۹۸ - ۱۹۹ - ۲۰۱ - ۲۰۴ - ۲۰۸ -

۲۱۳ - ۲۱۵ - ۲۶۹ - ۲۷۱ - ۲۷۲ - ۲۷۵ -

اپہواز - ۲۳۲

ایقہننر - ۲۶۹

ایران - ۱ - ۴ - ۱۱ - ۱۲ - ۱۴ - ۲۵ - ۲۷ - ۳۳ - ۳۹ - ۴۳ - ۵۳ - ۷۷ - ۱۰۰ - ۱۶۲ - ۱۶۹ -

۱۹۹-۲۰۴-۲۰۸-۲۰۹-۲۱۱-۲۲۰-۲۲۱-۲۲۲-۲۲۶-۲۲۶-۲۲۸

۲۲۹-۲۳۳-۲۳۴-۲۳۵-۲۳۶-۲۳۷-۲۴۰-۲۵۱-۲۵۲-۲۵۷-۲۶۰

۲۶۵-۲۶۶-۲۶۷-۲۶۸-۲۶۹-۲۷۰-۳۱۲-۳۲۱

آئرلینڈ - ۳۲۵ -

ایرو چیف - جنرل - ۲۳۰-۲۳۶ -

ایسٹ انڈیا کمپنی - ۲۵ -

ایلیٹ - سرہنری - ۳۲۹ -

ب

باب المندب - ۱۳۳ -

بادشاہ - سید محمد - ۵-۱۴ -

بارکری - ۳۰ -

باز نویف - ۲۲۵ -

باسفورس - ۶۲-۶۳-۶۴ - ۲۷۰ -

باگدانوو - ۴۴ -

بایزید - ۲۷۵ -

بچہ سقہ - ۳۰ -

بخارا - ۲۵-۲۷-۳۸-۵۳-۵۹-۱۰۲-۲۱۳-۲۱۵ -

براؤن - پروفیسر - ت - ث - ۱۵-۳۳-۳۷-۵۹-۷۵-۸۱-۱۷۰-۱۸۸-۲۵۸ -

۲۸۱-۲۹۲-۲۹۳-۳۰۳-۳۱۹-۳۲۰-۳۵۸ -

برائیڈن - ڈاکٹر - ۲۹ -

بربر - ۲۱۱

برطانیہ - ۸۰ - ۲۱۱ - ۲۳۱ - ۲۷۱ -

برلن - ۱۰ -

برہان الدین - ۲۷۸ - ۲۹۳

بسمارک - ۲۰۴ -

بصرہ - ۹۹ - ۲۲۵ - ۲۳۶ - ۲۵۰ - ۲۵۱ - ۲۶۶ -

بغداد - ۲۶۶ -

بلغ - ۲۸ - ۲۱۳ -

بلغاریہ - ۲۷۲ -

بلغارست - ۲۱۳

بلغرامی - سید علی - ۱۲۴

بلنٹ - ث - ۵ - ۱۵ - ۱۷ - ۱۸ - ۷۵ - ۱۲۱ - ۱۲۳ - ۱۲۶ - ۱۲۷ - ۱۲۹ - ۱۳۹ - ۱۵۲ -

۱۵۳ - ۱۸۳ - ۱۸۹ - ۱۹۱ - ۱۹۲ - ۱۹۳ - ۱۹۹ - ۲۰۶ - ۲۰۷ - ۲۰۸ - ۲۶۴ -

۲۶۷ - ۲۸۱ - ۲۹۰ - ۳۰۴ - ۳۰۵ - ۳۲۲ - ۳۲۴ -

بلنٹ - لیڈی این - ۱۲۴ - ۱۲۸ - ۱۷۰ - ۱۷۵ - ۱۸۰ -

بنی - ۳۲ - ۱۵۴ -

بندرلو - ۲۸۷ -

بنگال - ۱۰۱ -

بوشہر - ۳۲ - ۲۱۷ - ۲۱۸ -

بھوپال - ۱۵۴ - ۱۵۵ -

بیت المقدس - ۳۸ - ۶۴ -

بیرم - شیخ محمد - ۲۶
بیورہ - ۱۵۴

پ

پامرسٹن - ی -
پٹروگراو - پیٹربرگ (پتروغ) ۲۶ - ۲۲۵ - ۲۲۶ - ۲۲۵ - ۲۳۹ -
پشاور - ۱۹۵
پنجاب - ۴۶ - ۱۰۱
پنجہ - ۱۹۶ - ۲۰۵ - ۲۰۶
پورٹسمتھ - ۱۹۹
پیرس - ۲۶ - ۶۴ - ۹۴ - ۱۵۹ - ۱۶۰ - ۱۶۹ - ۱۶۶ - ۱۸۰ - ۱۹۱ - ۱۹۲ - ۱۹۴ - ۲۱۵ -
۲۱۶ - ۲۲۶ -

ت

تاسکرمان - ۴۷
تبریز - ۲۵۱
تحسین افندی - ۶۷ -
ترکستان - ۲۶ - ۲۷
ترکی - ۱۴ - ۲۶ - ۴۳ - ۶۲ - ۶۳ - ۶۴ - ۶۵ - ۶۶ - ۱۶۹ - ۲۰۲ - ۲۰۴ - ۲۰۶ - ۲۰۷ -
۲۲۶ - ۲۶۸ - ۲۶۰ - ۲۶۱ - ۲۶۲ - ۲۶۵ -
ترندی - سید علی - ۳ - ۸ - ۱۸ - ۴۰۱ - ۴۰۲ - ۴۰۵ - ۴۰۶ - ۴۰۸ -

- تقی زادہ - ۷ - ۱۷
تنظیمات - ۲۷۱ - ۲۷۲ -
توفیق پاشا - ۱۰۳ - ۱۱۳ - ۱۵۰ - ۱۸۲ - ۳۳۹ -
تونس - ۲۶ - ۸۰ - ۱۳۳ -
تیمور - ایز - ۱۸

ط

- طیپو سلطان - ۹۹
ٹیورن - ۱۸۶

ج

- جاپان - ۱۶۳
جارجی بے - ۲۹۳
جبل الطارق - ۱۳۳
جرجی زیدان - ۳۰۹
جرمنی - ۲۱۱ - ۲۳۷
جلال آباد - ۹ - ۳۸ - ۴۱
جمال الدین - واعظ اصفہانی - ۲۶۵
جمال الدین بانی - ۱۸
جمیل پاشا - ۲۸۹ - ۲۹۰
جواد - حاجی مرزا - ۲۵۵

جواہر زادہ - اصفہانی - ۲۷۸

جیرس - موسیو - ۲۱۳

چ

چرچل - ریڈلف - ۱۹۲-۱۹۳-۱۹۷-۲۰۰-۲۰۱-۲۰۲-۳۱۱

چمن - ۴۹

چندر وارکر - ۲۰۵

چنگیز - (الف)

ح

حاجی خان - ۲۱۷

حبیب اللہ حاجی - ۲۵۵

حجاز - ۳۷-۵۹-۶۱-۶۲-۱۲۰-۲۷۹-

حام الملک - ۲۴۲

حسن فہمی افندی - ۶۹-۷۴-۷۶

حسن خاں مرزا - ۲۵۸-۳۰۳

حسن علی مرزا - ۲۶۵

حسن صابری - ۲۹۰

حسین سلطان - ۹۸

حسین - شریف - ۲۰۴

حلب - ۲۷۰

حیدرآباد - ۹ - ۱۰۶ - ۱۱۶ - ۱۲۲ - ۱۲۳ - ۱۲۶ - ۱۲۹ - ۱۳۰ - ۱۵۲ - ۱۹۰ -

خ

خالقین - ۲۴۱ - ۲۴۲ - ۲۵۰ - ۲۶۶

خیرالملک - مرزاخان - ۲۶۸

خراسان - ۳۳ - ۲۲۳ - ۲۴۹

خسرو - ۲۱۸

خرطوم - ۱۸۳ - ۱۸۴ - ۱۸۹

خیبر - ۱۳۳

خیرالدین پاشا - ۲۶ - ۳۳۳

خیوا - ۲۵

س

داؤدخان - مرزا - ۲۶۵

دانش - مرزا - ۳۰۶ - ۳۰۸

دکن - ۱۰۱

دمشق - ۲۶۰

دوست محمدخان - امیر - ۵ - ۹ - ۲۸ - ۲۹ - ۳۰ - ۳۱ - ۳۳ - ۳۵ - ۳۸ - ۳۹ - ۴۰

۴۱ - ۱۰۰ - ۱۰۱

دوسی محمد - ۳۱۰

دو صد - ۲۱۱

دوگیرس - ۲۳۰

ط

ڈفرن - لارڈ - ۲۱۳ - ۲۱۴

ڈوزی - ریہنہارو - ۱۶۴

ڈولگری - پرنس - ۲۳۲

ڈینیوب - ۲۷۳

ذ

ذکاء الملک - ۲۶۵

ذوالفقار - ۱۹۶

س

راشفو - ہمنزی - ۳۰۶

راغب - سید - ۱۹۸

راماسوامی - ۲۰۵

راناتیت - ۲۳۶

رپن - لارڈ - ۱۲۷

رستم پاشا - ۲۶۸

رسول یار جنگ - ۱۲۲ - ۱۲۳ - ۱۲۴ - ۱۲۵

رشت - ۲۴۹

رشید پاشا - ۲۶ - ۶۳ - ۶۴

رشید رضا - ۳۰۳

رضا - امام - ۳۳

رضا خان کرمانی - ۲۳۴ - ۲۵۰ - ۲۵۴ - ۲۵۸ - ۲۶۴ - ۳۳۱ - ۵۵

رضا شاه پهلوی - ر -

رفیق محمد - ۴۰ - ۴۲ - ۴۳ - ۴۶ - ۴۹ -

رنجیت سنگھ - ۱۰۱

۱۱۶ - روس - ۳۹ - ۴۳ - ۴۴ - ۴۵ - ۱۹۶ - ۱۹۷ - ۲۰۳ - ۲۰۶ - ۲۰۷ - ۲۰۸ - ۲۰۹ -

۲۱۱ - ۲۱۲ - ۲۱۳ - ۲۱۵ - ۲۱۶ - ۲۲۰ - ۲۲۱ - ۲۲۲ - ۲۲۳ - ۲۲۴ - ۲۲۸ -

۲۳۰ - ۲۳۲ - ۲۳۵ - ۲۳۶ - ۲۳۷ - ۲۳۸ - ۲۴۰ - ۲۴۹ - ۲۶۹ -

۲۶۰ - ۲۶۱ - ۲۶۲ - ۲۶۳ - ۲۶۴ - ۲۶۵ -

رؤف پاشا - ۱۸۲

روما - ۱۶۳

۱۲۰ - رومانی - ۲۴۲ - ۲۴۴

رومی - ۲۸۰

روسیلیا - ۲۴۵

ریاض پاشا - ۸۱ - ۱۱۳ - ۱۳۲

رینان - ۱۵۹ - ۱۶۰ - ۱۶۱ - ۱۶۸ - ۳۱۱ - ۳۵۶ -

رینووف - ۲۳۰ - ۲۳۵

ز

زار - ۲۱۵

زاغلول - سعد - ع - ۱۰۶ - ۱۶۹ - ۳۰۵ - ۳۴۷
 زین الدین - میر - حسینی - ۲

س

سالار جنگ - ۱۲۳ - ۱۲۶ - ۱۲۷

سالسبری - لارڈ - ۲۰۴

ساموہ - ۲۲۲ - ۲۲۵ - ۲۶۱

سلیکس - ۵

سرخس - ۲۱۴

سرکاشیا - ۱۹۵

سرویہ - ۶۳ - ۲۴۳ - ۲۷۱

سعید پارس - ۲۶۴

سقراط - ۳۰۵

سقوطہ - ۱۳۳

سکینہ بیگم - ۲

سلاطین پاشا - ۱۹۸

سلطان احمد خان - ۳۹ - ۴۱

سلطان محمد خان - ۸ - ۴۱

سلطان خان - ۳۲

سلیم - سلطان - ۶۲ - ۶۳ - ۳۳۰

سیلمان بلخی - ۶۷

- سنا - جیس - ۹۳ - ۹۴ - ۱۸۱ - ۱۹۰ - ۳۴۶
 سنوسی - امام - سید احمد - ک - ۳۳۸ - ۳۵۲
 سواکن - ۱۸۹
 سوڈان - ۱۸۲ - ۱۸۳ - ۱۸۶ - ۱۸۷ - ۱۸۸ - ۱۸۹ - ۱۹۱ - ۱۹۲ - ۱۹۵ - ۱۹۹ -
 - ۲۰۲
 سوربون - ۱۶۱
 سویز - ۷۹
 سهام السلطنت - مصطفیٰ قلی خاں - ۲۱۸
 سیلر - ۱۵۴ -
 سید احمد خاں - ق - ۱۲۲ - ۱۲۴ - ۱۲۵
 سید حسن خاں - اقا - ۲۱۹ - ۲۲۱
 سید حسین - اقا - عدالت - ۲۲۵ - ۲۲۷ - ۳۱۳
 سید علی قطغنی - ۸
 سپہور - ۱۵۴

ش

- شام - ۳۸ - ۱۳۳ - ۲۷۰ - ۲۷۹
 شاذلی - شیخ طریقت - ۲۸۷
 شجاع - شاہ - ۲۸ - ۳۰
 شجاع الملک - ۹
 شرف الدین - الحینی القادری - ۲

- شریف پاشا - ۱۱۴ - ۳۴۸
 شکیب ارسلان - امیر - ۷
 شیخ رئیس - ابوالحسن مرزا - ۲۷۶ - ۲۷۸
 شیخ المرغانی - ۱۸۶
 شیراز - ۲۱۸
 شیرپور - ۴۶
 شیر علی - ۳۹ - ۴۰ - ۴۲ - ۴۳ - ۴۴ - ۴۶ - ۴۷ - ۴۸ - ۴۹ - ۵۰ - ۵۱ - ۵۲ - ۵۳ -
 ۱۹۴ -
 شیر گڑھ - ۷
 شیر محمد خاں - غلزائی - ۸

ص

- صابونچی - ۱۸۰ - ۱۸۱ -
 صادق - سید - ۳۲
 صادق النصرانی - ۲۹۰
 صفدر - سید - ۲ - ۳ - ۶ - ۷ - ۹ - ۳۱ - ۳۳ - ۳۵ - ۴۰
 صالح - سید - ۲
 صمدی بک - ۲۷۸
 صنحا - امام - ۲۰۴ - ۲۰۵

ص

- ضیاء الدین - میر - ۲

عباس پاشا - خدیو - ۲۸۴

عباس مرزا - ۹۸

عبدالجبار شاہ - ۴۰۱ - ۴۰۴ - ۴۰۵

عبدالمجید خاں - سلطان - ل - ع - س - سی - ۱۳ - ۱۲۹ - ۲۴۶ - ۲۶۶ - ۲۶۸ - ۲۶۰

۲۴۴ - ۲۴۵ - ۲۴۶ - ۲۴۹

عبدالرحمن حسن - ۱۹۸ - ۲۸۱ - ۲۸۳ - ۲۸۸ - ۲۸۹ - ۲۹۰ - ۲۹۲ - ۲۹۳ - ۳۲۸

۳۲۹ - ۳۳۴

عبدالرحمن خاں - ۴۷ - ۴۸ - ۴۹ - ۵۰ - ۵۲ - ۵۳ - ۵۸ - ۱۵۴ - ۱۹۴ - ۲۰۶ - ۲۱۴

عبدالصمد - ۱۲۳

عبدالعزیز سلطان - ۶۴ - ۶۵ - ۱۰۲ - ۲۴۲ - ۲۴۵ - ۲۴۶ - ۲۴۷ - ۲۴۸ - ۳۲۶ - ۳۲۹

عبدالعظیم شاہ - ۱۱ - ۱۷ - ۲۳۳ - ۲۳۹ - ۲۴۰ - ۲۴۱ - ۲۵۰ - ۲۵۷ - ۲۵۹ - ۳۵۴

عبدالعظیم - ہراتی - ۲۶۵

عبدالکریم - حاجی شیرازی - ۳۲ - ۱۵۳

عبدالکریم بک - ۲۷۸

عبدالفتاح - ۳۰۵

عبدالقادر - امیر - ل - ۲۶ - ۲۳۴

عبداللہ - سید - ۲۶ - ۲۸۶

عبداللہ پاشا - ۱۰۶

عبداللہ ندیم (خدیم) - ۲۸۵

عبداللہ مرزا - خراسانی - ۲۶۵

عبدالمجید - سلطان - ۶۳ - ۶۷ - ۲۰۴ -

عبدالنبی - حاج - ۳۲

عبدالوہاب - ۲۷

عبدہ - مفتی - ۷ - ۱۷ - ۵۹ - ۶۱ - ۸۵ - ۹۲ - ۱۰۶ - ۱۱۳ - ۱۱۶ - ۱۱۹ - ۱۶۹ - ۱۷۵ -

۱۷۶ - ۱۹۴ - ۱۹۸ - ۳۰۴ - ۳۰۵ - ۳۰۶ -

عثمان ڈگنا - ۱۸۴ - ۳۶۰

عثمان غالب - ۱۱۵

عدن - ۱۹۷ -

عراق - ۲۷

عزت پاشا - ۲۴۶

عبدالملک تبریزی - ۲۲۶ - ۲۵۸

عبدالملک محمود خاں - ۲۷۹

علی - ابن علی طالب - ۶

علی شیخ علی - قزوینی - ۲۲۲ - ۲۲۴ - ۶۶۵ - ۳۶۲

علی اصغر خاں - ۲۴۱ - ۲۴۲

علی اکبر - مشہدی - ۵

علی اکبر شیرازی - ۲۴۵ - ۲۴۹ - ۲۵۵ - ۳۶۲

علی اکبر - آقامرزا - ۲۶۵

علی سعاری - ۲۶

علی یوسف - ۱۹۸

عمر پاشا - ۲۶

عون شریف - ۲۰۴

عیسیٰ خاں - سید - ۲۹۲ - ۳۱۰

غ

غزالی - امام ابو محمد - ۷۱

غلزائی - ۲۸ - ۲۹ - ۳۰

ف

فتح علی شاہ - ۱۰۰

فراغی - مرزا - ۲۵۰

فرانس - ۸۰ - ۱۳۳ - ۱۶۰ - ۱۶۹ - ۲۱۱ - ۲۲۸ - ۲۶۰ - ۲۶۲

فرح اللہ خاں - اقامرزا - ۲۶۵

فرصت شیرازی - ۲۱۸

فرید بے - ۲۰۳ - ۲۰۴

فصل - سید - علوی - ۲۸۷

فکری پاشا - ۱۰۶

نواد پاشا - ۲۶ - ۶۴ - ۷۵ - ۲۷۳ - ۳۲۷ - ۳۶۶

فیض اللہ - حاجی مرزا - ۲۴۹

ق

قارص - ۲۷۵

قاہرہ - ۱۱۶ - ۱۵۱ - ۱۹۸

قبرس - ۸۰ - ۱۳۳ - ۱۹۷ - ۲۷۵

قزوين - ۳۲ - ۲۲۰ - ۲۵۱

قسنطنیه - ۲۵ - ۶۱ - ۶۵ - ۷۷ - ۷۸ - ۸۱ - ۱۹۹ - ۲۰۰ - ۲۰۱ - ۲۰۲ - ۲۰۳

۲۰۴ - ۲۰۷ - ۲۵۸ - ۲۵۹ - ۲۶۱ - ۲۶۲ - ۲۶۸ - ۲۷۱ - ۲۸۱

۲۸۳ - ۲۸۴ - ۲۸۸ - ۲۰۴

قطیف - ۲۲۲

قلج خاں - برهان الدین - ۱۸

قندهار - ۳۵ - ۴۱ - ۴۹ - ۱۳۳ - ۱۹۷

قم - ۲۳۹

قوند - ۱۰۲

ک

کابل - ۸ - ۹ - ۲۹ - ۳۰ - ۳۲ - ۳۳ - ۳۵ - ۴۱ - ۴۸ - ۴۹ - ۵۲ - ۱۵۴

کاتکوف - ۲۰۷ - ۲۲۴ - ۲۲۵

کارلین - مس ڈراختی - ۱۸ -

کارون - ۲۲۷ - ۲۲۹ - ۲۳۵

کاسک - ۲۵۵

کاشان - ۲۱۸

کاظم - ملا محمد - خوراسانی - ۳۲۱

کاظمین - ۲۵۸

کامران - ۲۸

کچنر-لارڈ-۳۵۳

کاوہ-۱۶-۷-۱۶

کربلا-۳۳

کرمان-۳۸-۲۳۲

کرمانی-۲۳۳-۲۵۰-۲۵۶-۲۵۸

کرنامک-۱۰۱

کرومر-لارڈ-۹۰-۱۳۹

کریٹ-۱۳۳-۲۶۱-۲۶۳

کزیبا-۶۴-۱۹۵

کرین-چارلس-۲۹۳-۲۹۵

کشمیر-۱۹۵

کلکتہ-۳۲-۱۱۶-۱۳۵-۱۲۸-۱۵۲-۱۵۳-۱۵۴

کمال-سید-۴

کنڈر-رکٹر-۵-۶-۷-۸-۱۸

کونان-۵

کوئٹہ-۴۹

کیس-موسیو-۲۳۵-۲۳۶

گ

گارڈن-جنرل-۱۸۳-۱۸۴-۱۸۵-۱۸۶-۱۸۸-۱۸۹-۳۵۳

گریگوری-۱۶۳

گرہم - ۱۸۳

گلیڈسٹن - ۱۸۹ - ۱۹۲ - ۲۲۳

گلیلو - ۱۶۳

گنہ - ۱۵۳

گواہار - ۱۵۳

گیلان - ۲۰۰

ل

لبنان - ۲۷۲

لطف اللہ - ۲ - ۱۰ - ۱۱ - ۱۳ - ۱۷ - ۳۱ - ۳۲ - ۳۳ - ۳۴ - ۳۵ - ۷۷ - ۸۶ - ۸۷ - ۸۹ -

۹۰ - ۹۱ - ۱۱۵ - ۲۱۹ - ۲۲۱ - ۲۲۲ - ۲۲۸ - ۲۳۲ - ۲۶۴ - ۲۶۵ - ۲۷۷ -

۲۷۸ - ۲۹۰ - ۲۹۱ - ۳۰۶ - ۳۰۸ - ۳۱۶ - ۳۰۷

لکھنؤ - ۱۰۱

لندن - ۲۷ - ۶۳ - ۱۵۳ - ۱۵۴ - ۱۵۵ - ۱۵۹ - ۱۶۹ - ۱۷۶ - ۱۸۱ - ۱۸۲ - ۱۸۹ - ۱۹۱ -

۱۹۳ - ۱۹۴ - ۱۹۹ - ۲۰۰ - ۲۰۳ - ۲۱۵ - ۲۲۵ - ۲۳۶ - ۲۵۱ - ۲۶۰ -

۲۶۳ - ۲۶۶ - ۲۶۷ - ۲۶۸ - ۲۷۱ - ۲۸۶

م

محب حسین - مولوی - ۱۲۲

محلّاتی - شیخ محمد - بیاح - ۳ - ۸۶ - ۹۰ - ۲۵۰

محمد فاتح - ۶۲

محمد ثانی - ۶۳

محمد - بن عبد الوہاب - ط - ۲۶ - ۳۲۶

محمد بن سعود - ۳۳۶ - ۳۳۷

محمد بن سنوسی - امام - ۲۶

محمد احمد - ۲۱۱

محمد بک - مولجی - ۸۴ -

محمد پاشا - ۱۰۶

محمد حسن خاں - اعتماد السلطنت - ۲۱۸

محمد نقی - حاجی - ۲۵۶

محمد نقی - حاجی ملا - ۲۵۶

محمد حسن - امین الغرب - ۲۱۹ - ۲۲۳ - ۲۳۷ - ۲۳۸ - ۲۴۲ - ۲۶۵

محمد حسن - آقا - ۲۲۲ - ۲۳۳ -

محمد - شیخ - خیابانی - ۲۶۵

محمد علی - مرزا - باب - ک -

محمد علی - خدیو - ط -

محمد علی مرزا - سرمد السلطنت - ۲۱۷ - ۲۵۰

محمد علی مرزا - جہرانی - ۲۶۵

محمود حسن - مولانا - شیخ الہند - ۷

محمود سلطان - سی - ۲۶۹

محمود - شیخ - ۲۷۸

محمود خاں - عبد الملک - ۲۷۹

محمود علی خان - ۷

مدحت پاشا - ۲۶-۱۰۲-۲۷۳-۲۷۴-۲۷۵-۲۹۲-۳۲۶-

مدینہ - ۳۸-۲۸۶

مراد - سلطان - بیختم - ۲۷۴

مراتش - ۲۷-۱۹۸

مرتضیٰ شیخ - ۲-۲۲-

مرزا احسن اشتبان - ۳۵۶

مرزا حسن شیرازی - ۲۶-۲۳۵-۲۵۵-۲۶۴

مرزا حسین خاں دانش - ۲۶۴-۳۰۷

مرزا خان - نجیر الملک - ۲۷۸

مرزا علی - آقا - ۴

مرو - ۱۲۹-۱۳۳-۱۹۶-۱۹۷-۲۰۶

مسقط - ۲۱۷

مسجد الزمان - ۱۲۳

مشہد - ۴-۳۳-۵۲

مشیر الدولہ - ۲۵۶

مصر - ۱۲-۱۳-۱۴-۲۵-۲۶-۲۷-۲۸-۲۹-۳۰-۳۱-۳۲-۳۳-۳۴-۳۵-۳۶-۳۷-۳۸-۳۹-

۸۰-۸۱-۸۲-۸۳-۸۴-۸۵-۸۶-۸۷-۸۸-۸۹-۹۰-۹۱-۹۲-۹۳-۹۴-۹۵-۹۶-۹۷-۹۸-۹۹-۱۰۰-

۱۰۱-۱۰۲-۱۰۳-۱۰۴-۱۰۵-۱۰۶-۱۰۷-۱۰۸-۱۰۹-۱۱۰-۱۱۱-۱۱۲-۱۱۳-۱۱۴-۱۱۵-۱۱۶-۱۱۷-۱۱۸-۱۱۹-۱۲۰-

۱۲۱-۱۲۲-۱۲۳-۱۲۴-۱۲۵-۱۲۶-۱۲۷-۱۲۸-۱۲۹-۱۳۰-۱۳۱-۱۳۲-۱۳۳-۱۳۴-۱۳۵-

۲۰۷-۲۰۸-۲۰۹-۲۱۰-۲۱۱-۲۱۲-۲۱۳-۲۱۴-۲۱۵-۲۱۶-۲۱۷-۲۱۸-۲۱۹-

مصطفیٰ پاشا - ۲۶

مصطفیٰ رشید پاشا - ۲۷۱

مصطفیٰ کامل - ع -

مصطفیٰ قلی خاں - سہیام الدولہ - ۲۷۰ - ۲۷۱ - ۳۳۳

منظر الدین شاہ - ۲۶۳

مفتی الدولہ - ۲۲۶

ملک خان - پرنس - ۱۸۲ - ۲۳۵ - ۲۵۱ - ۲۶۱ - ۲۶۶ - ۲۶۸ - ۳۵۹ -

ملکہ معظمہ - ۳۲ - ۳۳

منیر پاشا - ۲۷۸

نیف پاشا - ۶۷ - ۲۰۴

موسیٰ جبار اللہ - ۷ - ۳۱۹

مہدی - سوڈانی - ۱۱۹ - ۱۸۲ - ۱۸۳ - ۱۸۵ - ۱۸۶ - ۱۸۷ - ۱۸۹ - ۱۹۰ - ۱۹۱ - ۱۹۳ -

۱۹۸ - ۲۰۴ - ۲۲۱ -

مہدی خاں - ڈاکٹر - ۲۶۵

میونخ - ۲۲۸ - ۲۳۰ - ۲۳۶

ن

نادر خاں - جنرل - ۷

نادر شاہ - ۱۹۵ -

ناصر الدین شاہ - ۳ - ۱۲ - ۱۴ - ۱۵ - ۱۶ - ۱۹ - ۲۱۹ - ۲۲۲ - ۲۲۶ - ۲۲۷ - ۲۲۸ - ۲۳۱ - ۲۳۳ -

۲۴۱ - ۲۴۳ - ۲۴۴ - ۲۴۶ - ۲۵۷ - ۲۶۱ - ۲۶۴ - ۲۶۹ - ۲۸۰ -

۲۸۸ - ۳۱۲ - ۳۳۲ -

ناصر الملک - ۲۹۱

ناظم الدولہ - ابوتراب خاں - ۲۵۸

نامق کمال بے - ۲۶ - ۲۷۳ - ۳۲۹

نیپولین - ۲۱۸

نجد - ۲۶ - ۲۲۳ - ۳۳۷

نجف - ۵ - ۳۳ - ۲۵۸

نجم الدولہ - ۲۱۸

نشان طاش - ۲۸۱

نصر اللہ اصفہانی - مرزا - ۲۶۵

نصر اللہ خاں - آقامرزا - ۲۶۵

نصیر حسین - شیرازی - ۲۱۸

نظام - ۱۲۳ - ۱۲۶

نعمت اللہ خاں - آغامرزا - ۲۲۳

نعم بے - عبداللہ - ۱۰۶

نواب حسین ہندی - ۲۷۸

نوویکوف - بادام - ۲۳۰ - ۲۳۶

و

وکیل الدولہ - وقاحین - ۲۲۲

ولف - ڈرامنڈ - ۱۹۳ - ۱۹۸ - ۱۹۹ - ۲۰۰ - ۲۰۳ - ۲۰۷

ونجتر۔ جنرل۔ ۲۳۶

وہابی۔ ۶۳

وہبی۔ ڈاکٹر بہجت۔ خ۔

وہبی پاشاہ۔ ۱۰۶۔

ویلنگلے۔ ۲۳۵

۵

ہادی۔ سید۔ ۴

ہادی۔ شیخ۔ نجم آبادی۔ ۲۶۔ ۲۵۵۔ ۲۶۰۔ ۲۶۵۔ ۳۳۱

ہاشم۔ سید۔ ۹

ہرات۔ ۸۔ ۳۹۔ ۴۲

ہلاکو۔ (ابن)

ہمایوں۔ ۸

ہمدان۔ ۳۔

ہیملانی۔ ۱۶۳

ہینس کوہن۔ ۱۶

ی

یزد۔ ۲۱۸

یعقوب بیگ۔ ل۔

یلدیز۔ ۲۸۱۔ ۲۸۲

یمن - ۶۵ - ۷۷ - ۲۰۵

یونان - ۶۳ - ۲۶۸ - ۲۷۰

یونس - وہبی - حاجی - ۷۳

